حیاتِ

مولانا گیلانیؒ

شیخ الہندؒ کے ایک نامور تلمیذ رشید مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ
(م ۱۳۷۵ھ) صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد (دکن) کی زندگی
کے مختلف دور اور آپ کی علمی، دینی اور تعلیمی خدمات کا دلنشیں تذکرہ

تالیف: مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحی

پیش لفظ: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام

۱/کے-۳-ناظم آباد مینشن
نزد برف خانہ- ناظم آباد ۱

حیات
مولانا گیلانیؒ

شیخ الہندؒ کے ایک نامور تلمیذ رشید مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ
(م ۱۳۷۵ھ) صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کی زندگی
کے مختلف دور اور آپ کی علمی، دینی اور تعلیمی خدمات کا دلنشین تذکرہ

تالیف
محمد ظفیر الدین مفتاحی

پیش لفظ
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

مجلسِ نشریاتِ اِسلام
۱۔ کے۔ ۳ ناظم آباد مینشن۔ ناظم آباد نمبر۱ کراچی ۷۴۶۰۰

نام کتاب	————	حیات مولانا گیلانی ؒ
تصنیف	————	محمد ظفیر الدین مفتاحی
طباعت	————	شکیل پرنٹنگ پریس کراچی
اشاعت	————	۱۹۹۴ء
ضخامت	————	۳۳۶ صفحات

ٹیلیفون
۶۲۱۸۱۷

ناشر
فضل ربی ندوی

مجلس نشریاتِ اسلام ۱۔کے۔۳ ناظم آباد مینشن ناظم آباد نمبر ۱ کراچی

فہرست مضامین، حیات مولانا گیلانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

از

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت فیوضہم

الحمد للہ وحدہٗ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہٗ

راقم کو (بہ استحقاق اور بلا استحقاق) بہت سی اردو، عربی کتابوں پر پیش لفظ لکھنے کی عزت و سعادت حاصل ہوئی ہے۔ لیکن پیشِ نظر کتاب "حیات مولانا گیلانیؒ" پر اس کے فاضل مصنف مولانا محمد ظفیر الدین مفتاحی کی فرمائش پر پیش لفظ لکھنے میں سعادت اور عزت کا جو احساس اور قلبی مسرت حاصل ہو رہی ہے وہ کم مواقع پر حاصل ہوئی ہے، اس کی وجہ صاحبِ سوانح کی علمی عظمت، کمالات کے تنوع اور جامعیت کے علاوہ صاحبِ سوانح سے خصوصی تاثر و عقیدت اور وہ مناسبت بھی ہے جو ایک خورد و بزرگ، بے ہنر اور صاحبِ کمال، اور شاگرد و استاذ کے درمیان عظیم معنوی (بعض اوقات وسیع زمانی و مکانی) تفاوت کے باوجود ممکن بھی ہے اور محمود و باعث سعادت بھی، اس کے ساتھ یہ مزید احساس کہ یہ ایک ضروری اور مفید کام تھا اور ایک صاحب کمال معاصر شخصیت کا

اخلاقی، علمی، دینی و انسانی حق تھا جس کو اس سے بہت پہلے ادا ہو جانا چاہئے تھا جو اب ایک صاحب تعلق، واقفِ حال فاضل شخصیت کے ذریعہ ادا ہو رہا ہے، اس لئے وہ ہر طرح خوش آمدید کہنے اور قدر دانی کا مستحق ہے، اور اس حقیر پیش لفظ کے ذریعہ اس ادائے حق، اعتراف فضل و کمال — اور احسان شناسی میں جزئی شرکت ہو جاتی ہے۔

"پرانے چراغ" (جلد اول) میں متعدد نامور معاصر شخصیتوں اور اہلِ کمال علماء و مشائخ، ماہرینِ علوم اور بزرگوں اور احباب پر میرے لکھے ہوئے مضامین شامل ہیں، لیکن پڑھنے والا جب مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ پر لکھا ہوا مقالہ پڑھے گا (جو ص۶۳ سے ص۹۶ تک جاتا ہے) تو محسوس کرے گا کہ اس میں ایک یگانہ تعلق و مناسبت اور ایک نمایاں عظمت و عقیدت جھلکتی ہے، یہاں پر مضمون کے آخر کی چند سطریں لکھ دینا بے محل نہ ہوگا۔

"مولانا ہماری گذشتہ دینی تعلیم کے بہترین نمونوں میں تھے اور مدارس کے دورِ انحطاط کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ۔ ع

ترکشِ مارا خدنگِ آخریں

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ وسعتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، رسوخ فی العلم اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت بممالکِ اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے (والغیب عند اللہ) تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصرِ حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کئے جانیکے مستحق ہیں۔ انھوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کر دیا ہے وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف و محقق بنا سکتا ہے، اس ایک آدمی نے

تنِ تنہا وہ کام کیا ہے جو یورپ میں پورے پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی ہیں، ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوا تھا، اور اب ان جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

وہ بیک وقت معقولات کے دقیق النظر اور کامل الفن عالم، وسیع النظر محدث، نکتہ شناس اور نکتہ آفریں مفسر، بالغ نظر فقیہ و متکلم عصر، وسیع النظر مورخ سیال قلم مصنف، سحر بیان مقرر، کامیاب و علم آموز استاذ و مدرس، حقیقت پسند و باخبر عالمِ دین اور عہدِ حاضر اور نسلِ جدید کے نبض شناس اور اس سب کے ساتھ (جس کا اجتماع ان کمالات کے ساتھ بڑی مشکل سے اور بہت کم ہوتا ہے) درد مند و پُر محبت، عشق رسول، محبتِ اسلام اور درد و سوز سے بھرا ہوا دل رکھنے والے عالم تھے، ان گوناگوں اور مختلف بعض حیثیتوں سے متضاد صفات و کمالات رکھنے والے اشخاص اور یگانۂ روزگار شخصیتوں کے لئے مجھے اردو دانی اور اردو میں پڑھنے لکھنے کے باوجود عربی کی سوانحی و تعارفی اور تاریخی زبان کے لفظ من نوابغ الرجال اور لفظ "نوابغ" سے بہتر لفظ اردو میں نہیں ملتا، اس لئے خود اپنی زبان سے معذرت کرتے ہوئے مجبوراً یہ لفظ استعمال کر رہا ہوں۔

مولانا کی سوانحِ حیات لکھنے والے مصنف اور اہلِ قلم کے لئے ایک بڑا دشوار گذار اور آزمائشی مرحلہ یہ تھا کہ مولانا کے علمی، ذہنی، تعلیمی، دعوتی و اصلاحی، تصنیفی و انشائی شعبہائے کمالات اور ان کی تعلیم و تربیت، استفادہ اور تحصیلِ کمال، علمی و عملی سرگرمیوں، بحث و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے

موضوع، اور حیاتِ طبعی گذارنے کے مراکز و مقامات، نہ صرف مختلف و متنوع او کثیر التعداد تھے، بلکہ بعض اوقات اپنے رنگ و آہنگ، مسلک و مشرب اور مزاج و طبیعت میں متضاد معلوم ہوتے ہیں، ٹونک کا خالص معقولی اور خیرآبادی ماحول جس میں مولانا کی تعلیم کا آغاز ہوا، اور مولانا سید برکات احمد صاحب ٹونکی رح کا تدریسی مرکز جس سے مولانا نے استفادہ کیا دارالعلوم دیوبند کے اس علمی و مسلکی، ذوقی اور تربیتی ماحول سے بالکل جداگانہ تھا، جس کے سرپرست حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ تھے اور جس کا علمی و مسلکی شجرۂ نسب حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رح کے خاندان و مسلک اور شہیدین (حضرت سید احمد شہید رح و مولانا اسماعیل شہید رح) اور جماعتِ مجاہدین کے اصلاحی و تجدیدی کام، اصلاحِ عقائد اور اشاعت کتاب و سُنت کی اشاعت پر ختم ہوتا ہے، اس سلسلہ میں مولانا کی نسبت اور تعلق سے جو مواد کتاب میں آگئے ہیں وہ طلبائے علوم دینیہ اور نوجوان و ذہین علماء کے لئے سرمایۂ علم و بصیرت رکھتا ہے۔

پھر قدیم نصابِ تعلیم اور اس کے پُر از اعتماد اور پُر جوش مرکزوں میں عمر کا وہ حصہ گذارنے کے بعد جو عمیق تاثر قبول کرنے اور مزاج کی تشکیل کا زمانہ ہے ان کا سابقہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے (بحیثیت استاذ اور صدر شعبۂ دینیات کے) پڑتا ہے، اور ایسے زمانہ میں کہ جب جامعہ عثمانیہ میں اپنے اپنے فنون اور جدید علوم کے وہ فضلاء مشغولِ تدریس تھے جن میں متعدد اپنی ذہانت، اپنے فن میں اختصاص اور طلبہ پر اثر ڈالنے میں نہ صرف سلطنتِ آصفیہ بلکہ پورے ہندوستان میں امتیاز رکھتے تھے، اور وہاں کی یونیورسٹیوں میں ان کے مرتبہ اور درجہ کے کم استاذ

پائے جاتے تھے، ان اساتذہ کی موجودگی میں دینیات کی مؤثر ترجمانی اور نمائندگی، طلبہ پر اپنے علمی رسوخ کا سکہ قائم کردینا اور شعبۂ دینیات کے وقار اور افادیت کو تسلیم کرالینا ہر متبحر عالم کا کام نہیں، اس کے لئے غیر معمولی ذہانت، بیانِ قدرت اور بڑھی ہوئی خود اعتمادی، خودداری، اور اخلاقی بلندی کی ضرورت ہے، جوان کو (خاندانی عالی نسبی، اور ذاتی ذہانت اور محنت سے) عطا ہوئی تھی، پھر ان تدریسی اور تصنیفی مشغولیتوں کے ساتھ اپنی ولولہ انگیز اور نکتہ شناس اور نکتہ آفریں خطابت، اور وسیع وعمیق علمی عبور سے پُر تقریروں کے ذریعہ اہلِ حیدرآباد پر دینی خطابت کا سکہ جمادینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

پھر ان سب ذہنی وعلمی کمالات کے ساتھ مولانا کی حمیت دینی، حمایتِ اسلامی اور جذبہ جہاد کے نمونے بھی ٹونک میں تحریکِ خلافت کے سلسلہ میں سحر انگیز تقریروں اور توہینِ رسول ؐ کے اس مضمون کے سلسلہ میں جو اسوقت کے ایک ــــــ انگریزی اخبار میں شائع ہوا تھا اور اس کی وجہ سے مسلمانوں میں شدید ناراضگی اور جوش وخروش پایا جاتا تھا اور انگریزی۔ حکومت کی طرف سے قید وبند کی آزمائشیں سامنے تھیں، اپنے کو خطرہ میں ڈال کر کلکتہ کا خطرناک سفر اختیار کرنا ان کی دینی حمیت اور عشقِ رسول ؐ کا ایک ثبوت ہے۔

اس کتاب میں (غالباً پہلی مرتبہ) مولانا کے خاندان کا تعارف اور تفصیل تاریخی حوالوں سے آئی ہے، اور اس سے مولانا کے ملکاتِ طبعی اور کمالات اکتسابی کی توجیہ میں مدد ملتی ہے، پھر مولانا کی اہم تصنیفات پر مبصرانہ تبصرہ آگیا ہے، اور ان کی خصوصیات، اپنے موضوع پر ان کا

امتیاز قارئین کے سامنے (جن کو بیک وقت ان سب کے مطالعہ کا موقعہ نہیں ملا، اور ایک بڑی تعداد نے ان کے مطالعہ کی زحمت گوارہ نہیں کی) کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اب وہ بہت سے حضرات کے لئے مطالعہ کا محرک اور ان سے استفادہ کرنے کے لئے شوق انگیز ہوسکتا ہے، جو اس کتاب کی ایک بڑی خدمت اور اس کی افادیت کا ثبوت ہے۔

ان تصنیفی خصوصیات کے ساتھ جو ہر موضوع پر قلم اٹھانے والے محنت کوش مصنفین اور جامعات کے تحقیقی مقالات (ڈاکٹریٹ کے تھیسس) لکھنے والے کر سکتے ہیں، اس کتاب میں مصنف کا صاحبِ سوانح سے ذاتی تاثر اور عقیدت اور ذوقی وقلبی مشارکت بھی عیاں ہے جو (جیساکہ بعض کوتاہ نظر ناقد سمجھتے ہیں) کتاب کا عیب نہیں، بلکہ حسن وخوبی اور اس میں اثر وطاقت پیدا کرنے کا ایک مؤثر عامل (FACTOR) اور قیمتی عنصر ہے۔

آخر میں فاضل مصنف کو مبارکباد دینے اور مولانا مرحوم کے عقیدتمندوں اور قدردانوں کی طرف سے شکریہ پیش کرتے پر یہ تحریر جو عجلت میں حالت سفر میں لکھائی گئی، ختم کی جاتی ہے۔

ابوالحسن علی ندوی

۲۵ جنوری ۱۹۸۹ء مدن پورہ۔ بمبئی

۱۶ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حیات
مولانا گیلانی

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ اَجْمَعِیْنَ

ہندوستان کی زمین ہر دور میں مردم خیز رہی ہے، اور ہر زمانہ میں یہاں نامور علماء و مشائخ پیدا ہوتے رہے ہیں، جن کی ظاہری و باطنی خدمات سے اس ملک اور دوسرے ممالک کو روشنی ملتی رہی ہے۔

انہی نامی گرامی علماء کرام میں ہمارے ممدوح مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ بھی تھے جن کی علمی و دینی خدمات سے عوام و خواص برابر مستفید ہوتے رہے اور آج بھی آپ کی تصنیفات اور تلامذہ سے دنیا مستفید ہو رہی ہے اور ان شاء اللہ برابر ہوتی رہے گی۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے خاکسار کی ملاقات اُس وقت ہوئی، جب مولانا رٹائر ہو کر حیدر آباد سے اپنے وطن گیلانی میں اقامت پذیر ہو چکے تھے، جبتک مولانا بقید حیات رہے میری حاضری برابر ہوتی رہی، اور ساتھ ہی خط و کتابت بھی جاری رہی۔ تصنیف و مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا نے میری بڑی حوصلہ افزائی فرمائی، اس لئے آپ کی وفات کے بعد برابر اس فکر میں رہا کہ آپ کی زندگی کتابی شکل میں مرتب ہو کر شائع ہو جائے۔

اس خدمت پر پہلے میں نے اپنے بڑے لڑکے مولوی احمد سجاد قاسمی سلمہ کو لگایا، جس کو مطالعہ اور لکھنے کا ذوق بھی ہے اور سلیقہ بھی، اس نے کافی محنت کیساتھ مولانا پر بکھرے ہوئے تمام مواد کو یکجا کر دیا اور کہنا چاہیے اچھا مقالہ تیار کر لیا، پھر اس نے اپنی محنت یہ کہکر میرے سپرد کی کہ اس پر نظر ثانی کر کے اس کی تبویب و ترتیب خاکسار کر دے، اور مناسب اضافہ بھی ——— اس کو دیکھکر مجھے بیحد مسرت ہوئی، اور اسے کتابی صورت میں مرتب کر کے اہل علم کی خدمت میں پیش کرنے کا عزم کر لیا، اور جو کچھ میں اضافہ کر سکتا تھا وہ بھی کیا، تا آنکہ کتاب مرتب ہو گئی، اور آج سے بہت پہلے ہو گئی۔ مگر اس مسودہ کو کئی حادثوں سے دوچار ہونا پڑا، میں نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری، محنت کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اسکی اشاعت سعادت عزیزم مولانا مفتی شبیر احمد قاسمی سلمہ اللہ کے لئے لکھ دی تھی، اب وہ اسے اپنے علمی ادارہ "مولانا یوسف اکیڈمی بنارس" کی طرف سے شائع کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائے، موصوف اہلِ علم کی طرف سے لائقِ صد مبارک باد ہیں۔

پیش لفظ کے لئے مورخِ اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی دامت برکاتہم سے درخواست کی گئی، جو تصنیف و تالیف میں میرے شفیق ترین استاذ

ہیں، حضرتِ والا نے پہلی فرصت میں بمبئی سے ایک قیمتی پیش لفظ لکھ کر میرے نام بھیجدیا، اور اپنے گرامی نامہ میں تحریر فرمایا:۔

"کتاب ہر طرح جامع، پُراز معلومات اور مؤثر ہے، ایک ضروری اور مفید کام آپ کے ہاتھوں انجام پایا، اللہ تعالیٰ قبول کرے اور مقبول بنائے۔"

یہاں اپنے ان تمام اساتذہ کرام اور بزرگوں کی خدمت میں ہدیۂ عقیدت و محبت پیش کرنا میرا خوشگوار فرض ہے، جن کی تعلیم و تربیت، دعاؤں اور حوصلہ افزائی سے خاکسار کسی لائق ہو سکا۔

اخیر میں ربُّ العالمین سے دعا ہے کہ ہماری یہ خدمت قبول فرمائے اور اسے علماء، طلبہ اور دوسرے لوگوں کے لئے مفید بنائے، ہمیں بجا طور پر توقع ہے کہ اس کتاب کا پڑھنے والا کوئی محروم نہ رہے گا۔

اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ۔

طالبِ دعا

محمد ظفیر الدین غفرلہٗ

مفتی دار العلوم دیوبند

۱۷ر رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

ہندوستان کی سرزمین ہر دور میں مردم خیز رہی ہے اور یہاں ہر زمانہ میں علماء و مشائخ بڑی تعداد میں پیدا ہوئے، جن کی ذات سے بلا امتیازِ مذہب و ملت تمام باشندگانِ ملک مستفیض ہوئے۔ اور ان کی ذات بیش بہا علمی، دینی اور سماجی خدمات کا ذریعہ بنی، اور خود انھوں نے اپنی جدّوجہد، کدوکاوش اور علمی خدمت سے بہت سارے افرادِ امت کو تیار کیا، اور ملک کے مختلف خطّوں میں پھیلا دیا، ان میں سے ہر شخص آفتاب و ماہتاب بن کر اپنے علاقہ اور حلقہ کو منوّر کرتا رہا۔

انہی گنے چنے افراد میں حضرت سیّد مناظر احسن گیلانی رح بھی تھے، جو بہار میں پیدا ہوئے، ٹونک میں تعلیم پائی، اور دیوبند آکر علم کی تکمیل کی، آپ کا شمار ان ممتاز علماءِ کرام میں ہوا، جن کے علم و فضل اور دینی و علمی خدمت پر اہلِ علم کو ناز ہے، ٹونک میں اوّلاً ملازم ہوئے، پھر اپنی مادرِ علمی دیوبند میں آپ کے اساتذۂ کرام نے آپ کو خوش آمدید کہا، پھر قدرت نے سلسلہ بہ سلسلہ آپ کو حیدر آباد پہونچایا۔ جہاں مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا حبیب الرحمان خان شروانی کی علمی قدردانی کی بدولت جامعہ عثمانیہ میں استاذ ہوئے، اور اس راستہ سے جدید تعلیم یافتہ حضرات میں آپ کا علمی فیض جاری ہوا، اور اس طرح سیکڑوں ہزاروں افراد پیدا ہوئے، اور ملک و بیرونِ ملک میں پھیل کر انھوں نے علم و فن اور اسلام کی خدمات انجام دیں، اور ان شاء اللہ یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا۔ خاکسار کی سعی ہے کہ مولانا مرحوم کی حیات مرتب ہو کر شائع ہو جائے۔

مولانا گیلانیؒ کا خاندانی سلسلہ

مولانا مرحوم نے اپنی ایک تصنیف میں لکھا ہے:

"ابوالفرح واسطی کی جو اولاد جگت نیر میں آباد ہوئی، اور بعد کو جاجنیری سادات کے نام سے مشہور ہوئی، ان کا ایک سلسلہ بہار ضلع مونگیر میں پایا جاتا ہے، اور چونکہ بارہ گاواں میں یہ آباد ہیں، اسلئے سادات بارہ گاواں کہلاتے ہیں، خاکسار مناظر احسن گیلانی کا تعلق بھی اسی جاجنیری سادات سے ہے"۔

(تذکرہ شاہ ولی اللہؒ ص ۱۴۵)

اب اس کی تھوڑی تشریح ملاحظہ فرمائیں، مولانا مرحوم کے پہلے مورثِ اعلیٰ جو ہندوستان تشریف لائے۔ وہ سید احمد جاجنیری ہیں۔ سید صاحب کے متعلق جو یادداشت محافظ خانہ میں محفوظ ہے، اس میں درج ہے:۔

"سید احمد جاجنیریؒ مدینہ منورہ سے مقام واسط میں تشریف لائے چندے مقیم رہے جو کہ مدینہ منورہ کے قریب ایک دیہات بنام مقام واسط ملقب ہے، اسی وجہ سے ان کا لقب "واسطی" ہے۔

(ترجمہ فارسی آلِ خاندان سید احمد جاجنیری محافظ خانہ)

مگر یہاں بھی مستقل طور پر نہ رہ سکے، وہاں سے بھی آپ کو منتقل ہونا پڑا۔

لکھا ہے کہ:۔

"مقامِ واسط میں باعثِ ظلم وشدّت قوم عباسی کے مقامِ واسط سے کوچ کر کے مقامِ مشہدِ مقدس میں تشریف لائے، اور چند روز سکونت پذیر ہوئے، بعدہٗ وہاں سے کوچ کر کے بمقام بغداد شریف بمحلہ جاجنیر تشریف لا کر سکونت پذیر ہوئے۔" (ایضاً)

ہندوستان میں آمد یہیں سے "جاجنیری" آپ کے نام کا جزو بنا، پھر بغداد سے چل کر ہندوستان آئے۔۔ کیسے آئے؟۔ اس کی تفصیل یہ دی ہے:۔

"ابتدائے ۵۸۸ھ لغایت ۶۰۲ھ ہنگامِ تکرار مہاراجہ رائے پتھورا یعنی پرتھی راج مالک تختِ دہلی کے، کہ سلطان شہاب الدین محمد غوری ساتھ راجہ مرقوم کے جنگ جہاد میں مصروف تھا اور راجہ رائے پتھورا نے سہ بار سلطان شہاب الدین محمد غوری کو شکست دی تھی، اس لئے شہاب الدین ممدوح نے بتلاشِ قوم سادات بامیدِ شرکتِ جہاد کے متلاشی ہوا، اور جن جن مقاموں میں قوم سادات روشن ضمیر پائے گئے، بغرضِ جہاد شامل لایا، اور جناب سید احمد جاجنیری قدس سرّہٗ کو بھی ہمراہ لے کر مقامِ دہلی پر بغرضِ جہاد چڑھائی کی، اس لڑائی میں جدِّ امجد سادات بارہاں بھی شریک تھے، چنانچہ بفضلِ خداوندِ کریم باعثِ قوم اولاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راجہ پتھورا مغلوب ہوا، اور سلطان کو فتح حاصل ہوئی۔" (ایضاً)

حضرت سید احمدؒ جاجنیری کان پور میں حاصل یہ ہوا کہ سید احمد جاجنیری سلطان محمد غوری کیساتھ ہندوستان تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے، اس کی صورت یہ ہوئی کہ اس کامیابی کی خوشی میں سلطان نے جہاں دوسرے شرکاء جہادِ سادات کو جاگیریں

عطا کیں، اور ان کو ملک کے مختلف حصوں میں آباد کیا وہیں اس نے اس موقع سے حضرت سید احمد جاجنیری کو بھی کانپور کے پاس ایک جاگیر دی، جس کو سید صاحب نے "جاجنیر" کے نام سے موسوم کیا، جو اب صرف جاج کے نام سے مشہور ہے چنانچہ اسی کتاب میں صراحت ہے:۔

"علیٰ ہٰذا القیاس سید احمد جاجنیری کو بھی ایک جگہ ملی تھی کہ وہ ملقب بنام قدیم جاجنیر کے ہوا، اور وہ اب ملقب بنام جاج ہو گئی ہے بعلاقہ کانپور واقع ہے۔" (ایضاً ص ۱۲)

کان پور سے مونگیر | ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سید صاحب کا کسی وجہ سے جی نہیں لگا، تو وہ سلطان محمد غوری کے مشورہ سے علاقہ مونگیر میں تشریف لائے، اور پھر سلطان نے یہاں موصوف کو معقول جاگیر عطا کی، چنانچہ اسی تاریخی دستاویز میں مذکور ہے۔

"سید احمد جاجنیری قدس سرہٗ کا نسب حسنی و حسینی ہے، ہنگامِ حیات سید صاحبؒ کے موالات جاگیر موضع حسین آباد، و مانہ مدام پور، و فیروز پور مانندہ، و محمد پور بکساری، و پیغمبر پور، و چواڑہ، و ندیانواں، و کمل گڈھ، و پچھ بیگہ، و دیگر مواضعاتِ پرگنہ امرتھ ضلع مونگیر منجانب سلطان شہاب الدین محمد غوری غازی عطا ہوئی تھی، لیکن من بعد ہنگامِ دخل و قبضہ اولادان کی، باعثِ ظلم راجہ کامگار خان، و نادر خان تعدیاً لے لیا گیا،" (ایضاً ص ۱۲)

مزار سید احمد جاجنیری | یہ بھی صراحت موجود ہے۔

"مزار سید احمد جاجنیری قدس سرہٗ مع اہلیہ ان کی موضع ندیانواں پرگنہ امرتھ ضلع مونگیر میں واقع ہے۔" (ایضاً ص ۱۲)

اولاد سید احمد جاجنیریؒ | البتہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس تاریخ اور کس سنہ میں انتقال ہوا، لیکن سید صاحب کی اولاد کے متعلق تفصیل ملتی ہے کہ ان کی وفات اور جاگیر چھن جانے کے بعد یہ لوگ منتشر ہو گئے۔ اور مختلف اطراف میں پھیل گئے۔ اسی یادداشت میں مذکور ہے۔

"سید احمد جاجنیریؒ کی چار اولاد تھی، بڑے صاحب زادے کا نام سید خضر معروف بہ سید حیدر باگھ، مزار ان کا بموضع بجویند، جو مقام بہار بفاصلہ تین کوس جانب دکھن واقع ہے، اور منجھلے صاحبزادے کا نام مبارک سید شاہ جمال الدین مزار ان کا بموضع جمواره پرگنہ امرتھ ضلع مونگیر بالائے کوہ مسطح جانبِ شمال، نزد کوہ مسطح واقع ہے۔ اور سنجھلے صاحب زادے کا اسم شریف سید شاہ برہان الدین مزار ان کا بموضع سانخہ پرگنہ بلیا ضلع مونگیر عبور دریائے گنگ واقع ہے[1]۔ اور چھوٹے صاحب زادے کا اسم اقدس سید شاہ یوسف ہے، مزار ان کا بموضع چونٹر پرگنہ سیمائے ضلع گیا واقع ہے۔"

(ایضاً ص ۱۳)

اولاد کی اولاد | سید احمد جاجنیریؒ کے پوتوں اور اگلی نسل کے متعلق وضاحت ہے۔

" اور اولاد ابنان سید احمد جاجنیری قدس سرہٗ کی موضع مدام پور، چواڑہ، فیروز پور، موضع نندہ و موضع مروئی، کٹنی کول و جمواره و کندہ و حسین آباد پرگنہ امرتھ و پنرہٹہ، و چندھار، و محلہ یحییٰ پور منجملات

[1] سید شاہ برہان الدین کی قبر سانخہ ضلع مونگیر میں اب تک موجود ہے، سانخہ کے سادات ان کی ہی نسل سے ہیں ان لوگوں کے پاس پورا نسب نامہ موجود ہے مگر وہاں کے سادات برہان الدین کے بجائے نام حاجی معین الدین بتاتے ہیں چنانچہ وہاں مدرسہ معینیہ ان کے ہی نام پر قائم ہے اس دار العلوم معینیہ سانخہ کی عمارت خاکسار کے زمانۂ قیام میں تعمیر ہوئی اور تقریباً آٹھ سال بحیثیت صدر مدرس مدرسہ سے وابستہ رہا۔ ظفیر۔

شیخ پورہ پرگنہ نالوہ ضلع مونگیر میں سکن پذیر تھے، وہیں باعثِ ظلم و تعدی راجہ کامگار خان و نامدار خان کے، اکثر اولاد ابنا سید احمد جاجنیری قدس سرہٗ کی، بموضع اورین، و بیلچھوا، و موضع غوث آباد و من بعد بمقام سورج گڑھا، و عبور دریائے گنگ بموضع سانحہ پرگنہ بلیا و بمحلہ مخصوص پور بارہ من محلات شہر مونگیر سکونت پذیر ہوئے"

(ایضاً ص۱۴و۱۳)

یہ بھی لکھا ہے کہ سید صاحب کی اولاد کی اولاد در اولاد بادشاہ اکبر کے دور میں پھر فوج میں داخل ہوئی اور فوج کی افسری کا فریضہ ادا کیا، بعض عہدۂ قضا پر بھی مامور ہوئے، گویا بعد میں بھی باوقار زندگی گزاری اور مسلم سلاطین سے وابستہ رہی۔

جاگیر کا حال باقی راجہ کامگار خان و نامدار خان جو شاہی عملداری میں صوبہ بہار کا افسر تھا اور جس نے ظلماً سید احمدرحؒ کی اولاد کی جاگیرات پر قبضہ کرلیا تھا اور انھیں بے دخل کردیا تھا، ایسٹ انڈیا کمپنی کا جب زمانہ آیا تو اس راجہ کو کمپنی کے مقابلے میں شکست ہوئی اور انگریز ان راجوں کی تمام جائداد پر قابض ہو گئے۔"

اولادِ سید احمد جاجنیری گیلانی میں "تاریخ بارہ گانواں و مضافات" کے مصنف لکھتے ہیں

"سید احمد جاجنیری عراق سے ہندوستان آئے تھے، لکھی سرائے کے نزدیک چند گاؤں ان کو جاگیر میں ملے تھے شیخ پورہ کے اردگرد بارہ گانواں آپ ہی کی اولاد سے آباد ہے، ان کی اولاد میں میر دھوم اور میر مقیم دو بھائی موضع یکساری سے گیلانی آئے تھے اور بعد میں مستقلاً گیلانی مع اہل و عیال و برادر منتقل ہو گئے۔" (ص۶۸)

ایک روایت جاجنیری خاندان کی تاریخ میں درج ہے کہ سلطان محمد غوری کے مرشد

مولانا شاہ نور قدس سرہٗ بغرض سیاحت بہار تشریف لائے، اس زمانے میں لکھی سرائے میں راجہ اندر دون رہتا تھا اور پورے علاقے پر قابض تھا۔ راجہ نے شاہ نور قدس سرہٗ کے ساتھ بدسلوکی کی، اور مولانا کے میزبان اور مولانا کو زندہ زمین کے اندر دفن کرا دیا، مگر مولانا نور کی یہ کرامت تھی کہ وہ باہر نکل آئے جس کو دیکھ کر راجہ تھرا گیا واللہ اعلم اور ادھر جب سلطان محمد غوری کو اس کارروائی کی اطلاع ہوئی، ساٹھ سادات غازیوں کو روانہ کیا، کہ وہ راجہ کو اس کے ظلم کا بدلہ چکھائے ان میں سید ابراہیم بھی تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ غازیوں کو ربُّ العزت نے کامیابی سے سرفراز کیا اور راجہ کو فرار ہونا پڑا

خود مولانا گیلانی کا بیان اس میں شبہ نہیں کہ سید احمد جاجنیری کی اولاد میں سے کوئی گیلانی بھی ضرور آیا، اور اس کی رشتہ داری یہاں قائم ہوئی۔ خود مولانا مرحوم نے خاکسار سے یہ بات بیان فرمائی تھی۔

مصنف تاریخ بارہ گانواں و مضافات" نے لکھا ہے کہ سید احمد جاجنیریؒ کے خاندان کے جو افراد گیلانی آئے، ان کی رشتہ داری مندرجہ ذیل حضرات سے قائم ہوئی۔

"شفاعت علی ساکن مانے چواڑہ اور شجاعت علی گیلانی" (ص۲۶)

خود حضرت گیلانی رحؒ نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

"یہ گیلانی وہی گیلانی ہے، جس کی طرف خاک سار اپنے نام کی اضافت کرتا ہے، فقیر کا مولد و منشار بہار کا یہی گاؤں ہے۔ جس کی آبادی بمشکل پانچ چھ سو سے زیادہ ہوگی ممتاز آبادی واسطی زیدی، سادات کی ہے، جو چند صدیوں سے اس گاؤں میں آباد ہے۔" ——— (نظام تعلیم و تربیت)

مولانا کے پڑدادا گیلانی کے شجاعت علی حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کے پردادا ہیں، اور شجاعت علی کے فرزند ارجمند مولانا محمد احسن گیلانی مولانا مرحوم کے جدِ امجد ہیں۔

گیلانی کا جائے وقوع گیلانی جیسا کہ گزرا مختصر آبادی ہے اس کا پورا نام "محی الدین پور گیلانی" ہے۔ چنانچہ قدیم سرکاری کاغذات میں یہ نام موجود ہے۔ بعد میں محی الدین پور حذف ہو کر صرف گیلانی رہ گیا، آبادی اسی نام سے مشہور ہے، اس گاؤں میں کچھ مسلمان اور کچھ غیر مسلم آباد ہیں، مسلمانوں کا پڑھا لکھا طبقہ عام طور پر ملازمت کے سلسلے میں باہر رہتا ہے۔ تہوار کے موقع سے عام طور پر یا پھر شادی بیاہ کے موقع سے ان کا کبھی کبھی اجتماع ہوتا ہے۔

بربیگھہ سے ایک پختہ سڑک بہار شریف کو جاتی ہے، اسی سڑک پر بربیگھہ سے میل دو میل کی دوری پر گیلانی واقع ہے، اور مولانا مرحوم کی بیٹھک اسی سڑک کے کنارے واقع ہے۔ مسجد اس گاؤں میں صرف ایک ہے۔

مولانا مرحوم کے دادا حضرت مولانا محمد احسنؒ اپنے وقت کے جید و ممتاز عالم دین اور مشہور استاذ گزرے ہیں، انھوں نے تعلیم، شادی اور اولاد ہو جانے کے بعد حاصل کی تھی، چونکہ پرانے مسلمان زمینداروں میں پڑھنے پڑھانے کا رواج بہت کم رہ گیا تھا، دینیات اور معمولی فارسی اور اردو پڑھ لینا کافی سمجھتے تھے، مولانا احسنؒ کو کسی نے طنزاً کچھ ایسے جملے کہے تھے کہ وہ تیر کی طرح لگا، اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تحصیلِ علم کے لئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے، اور اس طرح یہ گمنام خاندان آفتاب بن کر روشن اور شہرت پذیر ہوا۔

مولانا احسنؒ کی تعلیم دادا کی کہانی پوتے کی زبانِ قلم سے پڑھیں، خود مولانا گیلانی مرحوم لکھتے ہیں:-

"مولانا (محمد احسنؒ) کے والد میر شجاعت علی مرحوم انگریزی پولیس میں سرکل انسپکٹر کے عہدے پر ممتاز تھے۔ بزرگوں سے خاکسار نے سنا ہے کہ میر شجاعت علی کی بڑی آرزو تھی، کہ انکے بچوں میں کوئی لڑکا عالم ہوتا، مگر خدا کی شان جب تک زندہ رہے، یہ آرزو پوری نہیں ہوئی، مولانا محمد احسنؒ کی شادی ہو چکی تھی، بلکہ ایک لڑکا بھی ہو چکا تھا، جو فقیر کے بڑے چچا مرحوم تھے، اس عمر اور ان حالات میں تحصیلِ علم کا سودا سر پر سوار ہوا، بیوی، بچے، گھر بار سب کو ایک دفعہ سلام کر کے گیلانی سے روانہ ہوئے اور کامل چودہ سال کے بعد اس وقت واپس ہوئے جب بیٹا جوان ہو چکا تھا، چودہ سال کی یہ مدت روپوشی میں نہیں گذری، خط و کتابت اور آدمی تک وطن سے ان کے پاس آتا جاتا رہتا تھا، لیکن اس عرصہ میں خود ایک دفعہ بھی گھر نہ آئے، مختلف علوم کے اہلِ کمال جن جن شہروں میں تھے انکی خدمتوں میں پہونچے علوم رسمیہ کی کتابیں زیادہ تر بنارس کے ایک عالم مولانا واجد علی صدر اعلیٰ سرکار انگریزی سے پڑھی، ریاضی، ہیئت، حساب مولانا نعمت اللہ فرنگی محلی سے اور حدیث کی سند مولانا عالم نگینوی تلمیذ حضرت شاہ اسحٰق دہلویؒ رحمہ سے حاصل کی، اس زمانہ میں درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھا، مختلف مسائل پر رسائل تصنیف کئے وجود رابطی اور مثناۃ بالتکریر والا رسالہ شائع بھی ہو چکا ہے، شرح سلم العلوم پر معرکۃ الآراء حاشیہ لکھا اقلیدس کا مقالہ اولیٰ عربی جو عام مدارسِ عربی کے نصاب میں شریک ہے، پہلی دفعہ، تصحیح اشکال اور تحشیہ کے ساتھ آپ

ہی نے لکھنؤ سے شائع کرایا، اسی نسخہ کی نقل مطابع میں چھپ رہی ہے، جب کامل اطمینان ہو گیا تب گھر لوٹے، اور بجائے علم فروشی کے علم پاشی اور معارف بخشی میں ساری زندگی گذار دی۔" (نظام تعلیم و تربیت ج۱ ص۲۹ و ج۲ ص۳۰)

مولانا احسنؒ کی خودداری

چونکہ مولانا احسن اپنے دور کے پولیس سرکل انسپکٹر کے صاحب زادے اور زمین دار گھرانے کے چشم و چراغ تھے، اس لئے جہاں رہے بڑے وقار کے ساتھ رہے، حرص اور لالچ سے دامن پاک رکھا، انکی طالب علمی کے زمانے کا حضرت مولانا مرحوم نے ایک عبرت آموز واقعہ لکھا ہے، اسے مولانا کی ہی زبانِ قلم سے سنیں۔

"مولانا احسن جب لکھنؤ کی ایک مسجد میں جو دبیر الدولہ کے نام سے موسوم ہے قیام فرما تھے، اتفاقاً انہی دنوں میں بادشاہِ وقت واجد علی شاہ کا عتاب کسی وجہ سے دبیر الدولہ پر نازل ہوا۔ قید کر دیئے گئے، خاندان پر مصیبت ٹوٹ پڑی، اس موقع پر مولانا نے قدیم آشنائی کا خیال کر کے دبیر الدولہ کے اہلِ خاندان کے لئے ممکنہ امداد بہم پہونچائی تھی، چند ہی دن کے بعد عتاب شاہی کا ازالہ ہوا۔ دبیر الدولہ جیل سے رہا ہو کر گھر آئے تو مولانا کی مواسات و ہمدردی کی خبر ہوئی، بہت متاثر ہوا، اور ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم جو اس وقت اس کے پاس موجود تھی، اسکا حکم لے کر مولانا کے پاس حاضر ہوا، پہلے تو مولانا نے رسمی لیت و لعل سے کام لیا۔ لیکن وہ بضد تھا کہ اس کی حقیر رقم کو قبول کیا جائے، آخر جان چھڑانے کے لئے مولانا نے فرمایا آج شام

ہو گئی ہے کل صبح لینے دینے کا نظم کروں گا۔ شب درمیان میں تھی اس سے نفع اٹھا کر لکھنؤ کو ہمیشہ کے لئے خیرباد فرما دیا گیا — کہ دبیر الدولہ کے اس روپے سے نجات حاصل ہو، اپنی کتابیں جن کے سوا ان کے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا مولوی جان علی صاحب گیلانی جو بعد کو مراد آباد میں متوطن ہو کر وہیں متوفی ہوئے۔ ان کے حوالے کر کے سیدھے رامپور تشریف لے گئے اور پھر دبیر الدولہ کو اس کا پتہ چلنے نہیں دیا کہ بہار کا وہ مولوی کہاں غائب ہو گیا، ساری عمر گیلانی جیسے کوردہ گاؤں میں گذار دی۔" (نظام تعلیم و تربیت ج۱ ص۵۲)

تحصیل علم کے بعد وطن واپسی اور درس و تدریس میں انہماک

مولانا احسنؒ پڑھنے کے سلسلے میں گھر سے نکلے اور چودہ سال مسلسل غریب الوطنی کی زندگی گذاری، اس طویل عرصہ میں خود کبھی وطن نہیں آئے، البتہ خط و کتابت جاری رکھی، اور گھر سے آدمی بھی حالات معلوم کرنے جاتا رہا، مختلف علماء کی خدمت میں رہنا ہوا، بنارس لکھنؤ، رام پور علم کی طلب میں پہونچے۔

جب تمام علوم و فنون میں استعداد کامل حاصل کر لی تو پھر وطن واپس ہوئے اور درس و تدریس کا —— سلسلہ اپنے گاؤں میں مکان پر ہی شروع کر دیا، اور کافی عرصہ تک یہ خدمت تن تنہا انجام دیتے رہے اس زمانہ میں طریقہ بھی عام طور پر یہی ہوتا تھا۔ حضرت مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے خود لکھا ہے

"مولانا محمد احسن گیلانی خاکسار کے جدِ امجد ہیں، یہ میرے گھر کی بات ہے اس لئے "صاحب البیت ادری بما فیہ" کے رو سے میں بتا سکتا ہوں کہ اس کی حقیقت کیا تھی، یہ صحیح ہے کہ مولانا محمد احسن گیلانی مرحوم نے اس گاؤں میں تقریباً

تیس چالیس سال درس وتدریس کا بازار گرم رکھا، نہ صرف بہار بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں حتی کہ سرحد کابل تک سے طلبہ کی ایک اچھی خاصی تعداد مولانا سے پڑھنے کے لئے آئی اور کامیابی سے ہمکنار ہوکر واپس ہوئی۔"

(ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ص ۴۳۲/ج ۱)

مولانا احسنؒ کے مشہور تلامذہ مولانا محمد احسن کی خدمت میں بہت سارے طلبہ آئے اور انھوں نے وہاں رہ کر علوم وفنون کی تکمیل کی، اور اپنے زمانہ کے مشاہیر علماء واساتذہ میں ان کا شمار ہوا، مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ ان میں سے چند نام بھی لکھے ہیں، ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:۔

"ہزارہ ضلع کے ایک بزرگ مولانا عبداللہ ہزاروی وطناً گیلانی نزیلاً، پڑھنے کے لئے آئے اور اسی گاؤں میں متوطن ہوکر اپنے وعظ و تلقین، ارشاد وہدایت، درس وتدریس، افتاء وتصنیف کا سلسلہ نصف صدی کے قریب برابر جاری رکھا، وہیں کی خاک میں آسودہ ہوئے، اور ایک وہی کیا بہار کے بعض جلیل القدر علماء مثلاً مولانا رفیع الدین مرحوم رئیس شکرانواں، مولانا عبدالغفور رمضانپوریؒ مولانا حکیم عبدالسلام بھاگلپوریؒ، مولانا حکیم دائمؒ علی مونگیری ثم ٹونکیؒ اور مولانا محمد اسماعیلؒ وغیرہم بیسیوں مشاہیر گیلانی کی اس درس گاہ سے اٹھے۔" (ایضاً)

دارالعلوم گیلانی گویا گیلانی اس وقت دارالعلم ہورہا تھا، اور شائقین کھنچے چلے آرہے تھے، تن تنہا ساری کتابیں پڑھاتے تھے، تفسیر، حدیث، فقہ اور معقولات کی اونچی کتابوں کا درس ہوا کرتا تھا، جیسے ہدایہ، توضیح وتلویح، بیضاوی، مسلم شریف

شمس بازغہ، شرح چغمنی، الافق المبین، اشارات، اور کتاب الشفا وغیرہ[1]

دارالعلوم گیلانی کی عمارت مدرسہ کا حال بھی یہی تھا کہ اس کے لئے کوئی وسیع وعریض عمارت نہیں تھی، بلکہ بقول مولانا مرحوم:

"لیکن تعلیم وتدریس کا یہ سارا کاروبار جہاں انجام دیا گیا وہ صرف برگد کا ایک طویل وعریض درخت تھا، جسکے ایک طرف متوسط درجہ کی ایک جھونپڑی اور ایکطرف مولانا مرحوم کا ایک خام چھوٹا سا چند حجروں کا مکان تھا، اسی مکان کے سامنے کولو کا ایک چھپر اینٹ کے دو پایوں پر پڑا ہوا تھا برگد کے درخت کے نیچے چند تخت وہ بھی کھلے ہوئے، بغیر کسی فرش وفروش کے پڑے رہتے تھے۔ مولانا درخت کی چھاؤں میں طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے، برسات یا سردی کے موسم میں یہ مدرسہ کولوں کے اسی سائبان میں منتقل ہوجاتا تھا، جس کا کل فرنیچر لے دے کر دو چوکیاں تھیں، طلبہ کچھ تو اسی خام مکان کے حجروں میں رہتے یا مسجد میں اور زیادہ تر گاؤں کے اربابِ ثروت کے مکانوں میں ان کو جگہ ملجاتی تھی اور کھانے کا نظم بھی ہوجاتا تھا، بس اس مدرسہ کی کل کائنات برگد کی چھاؤں اور مولانا کا وہی خام مکان تھا، اسی کو مدرسہ خیال کیجیے، یا مولانا کا مطب، اس کو دفتر قرار دیجئے یا دیوان خانہ، یا طلبہ کا اقامت خانہ، کیوں کہ وہی سب کچھ تھا۔

برگد کے اسی سایہ میں اگر کوئی دیکھنا چاہے تو مرحا کے اسلامی اسٹیٹ، صغریٰ وقف اسٹیٹ اس کے مدرسہ عزیزیہ اور شکرانواں کے اس قیمتی کتب خانہ کو بھی دیکھ سکتا ہے، جس کی بعض نادر کتابوں کی نظیر اس وقت بھی سارے ہندوستان میں نہیں مل سکتی، بلکہ یہ

---

[1] دیکھئے ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت۔

ہو سکتا ہے کہ خدا بخش خان کی مشہور عالم مشرقی لائبریری کی ترتیب
میں بھی دیکھنے والوں کو اس دماغ کی رہنمائی محسوس ہو سکتی ہے،
جو برگد کے اس درخت کے نیچے سنوارا گیا تھا۔"
(نظامِ تعلیم و تربیت ص ۴۳۰ ج ۱)

تصانیف مولانا احسنؒ مولانا محمد احسن رحمۃ اللہ علیہ نے جہاں درس و تدریس کی خدمت انجام دی اور ان کی درس گاہ سے علماءِ روزگار پیدا ہوئے، وہیں آپ نے بعض کتابوں پر حواشی بھی لکھے، چنانچہ منطق میں بعض رسائل اور متعدد کتابوں پر آپ کے حواشی ہیں، ان میں سے بعض شائع ہو چکے ہیں، اور بعض کی اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔

مولانا احسنؒ کی اولاد جیسا کہ گذرا مولانا نے شادی کے بعد علم حاصل کیا تھا، مولانا کے تین صاحب زادے تھے، بڑے صاحب زادہ کا نام ابوظفر محمد سلیمان تھا جن کی وفات مولانا کی زندگی میں ہی ہو چکی تھی، دوسرے صاحبزادے کا نام حافظ ابونصر تھا، انھوں نے پٹنہ اور لکھنؤ جاکر مروجہ نصابِ عربی کی تکمیل کی تھی، اور تیسرے صاحب زادے کا نام حافظ ابوالخیر تھا، ان کی عمر کا چودھواں سال تھا کہ انکے والد بزرگوار یعنی مولانا احسنؒ اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گئے، ابوالخیر صاحب نے پہلے حفظِ قرآن کیا، پھر فارسی کی تکمیل کی، ابھی عربی کی نوبت نہیں آئی تھی کہ والدِ محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اور غالباً اسی وجہ سے آگے تعلیم جاری نہ رکھ سکے گھر کے کام کاج میں مشغول ہو گئے۔

مولانا کے والد محترم مولانا مناظر احسن گیلانی کے والد محترم کا نام حافظ ابوالخیر تھا جو مولانا احسنؒ کے چھوٹے صاحب زادے تھے، انھوں نے اپنے والد کی زندگی میں حفظِ قرآن کیا اور فارسی کی تکمیل کی، اور ابھی عمر کی چودھویں سال

میں تھے کہ آپ کے والد (حضرت مولانا محمد احسنؒ) جنت سدھار گئے، اور انھوں نے تعلیم سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور گھر کے کاروبار میں لگ گئے، زمین داری اور کاشت کاری کا انتظام اپنے ذمہ لے لیا، ان کے متعلق لوگوں کا بیان ہے کہ سادہ مزاج تھے، گاؤں والوں کی سی ہی زندگی گذارتے تھے، لیکن انکی سخاوت و فیاضی گیلانی میں مشہور تھی، غریبوں کے بہت کام آتے تھے، کبوتروں کا شوق تھا، مردانہ بیٹھک کے سامنے کبوتر خانہ بنوا رکھا تھا، ۱۹۲۹ء میں حافظ ابوالخیر کی وفات ہوئی۔[۱]

حافظ ابوالخیر کی اولاد حافظ ابوالخیر کی شادی استھانواں میں فدا حسین کی صاحب زادی سے ہوئی، حافظ صاحب مرحوم کو تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں، مناظر احسن، مکارم احسن اور مظہر احسن یہ تین لڑکے تھے۔

صاحب زادیوں میں ایک کی شادی خان بہادر مولانا عبدالعزیز مرحوم مقیم صاحب گنج سے تھی، دوسری کی شادی موضع کٹی کول میں مولوی مظاہر حسن پیش کار سے تھی، اور تیسری صاحب زادی قطب العالم مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے بڑے صاحب زادے حضرت مولانا لطف اللہ صاحب رحمانی المتوفی سنہ ۱۹۴۲ء سے منسوب تھیں۔[۲]

---

[۱] دیکھئے حاشیہ مکاتیب گیلانی ص ۹۳

[۲] مکاتیب گیلانی ص

ولادت اور تعلیم وتربیت

مولانا سید مناظر احسن گیلانی اپنی ننھیال موضع استھانواں ضلع پٹنہ میں ۹ ربیع الاول ۱۳۱۰ھ کو پیدا ہوئے، پرورش وپرداخت کا بڑا حصہ دادھیال گیلانی میں گذرا، جہاں مولانا اس وقت ابدی نیند سو رہے ہیں، اور جس سے آپکو بے انتہا انس ومحبت تھی۔

آپ کی پیدائش سے پہلے آپ کے دادا کا انتقال ہو چکا تھا، چچا مولانا حکیم ابو نصر صاحب اور والد بزرگوار حافظ ابوالخیر کے زیر سایہ آپ کی پرورش ہوئی، آپکی والدہ بھی ایک اونچے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں اور دیندار تھیں۔

گھر کا ماحول مولوی خاندان ہونے کی وجہ سے دیندارانہ، مومنانہ ومخلصانہ تھا، اسی ماحول میں آپ کی پرورش وپرداخت ہوئی۔ آپ کے چچا مولانا حکیم ابو نصر کے کوئی اولاد نہیں تھی، اس لئے آپ کی ساری توجہ اپنے اس ہونہار بھتیجے (مناظر احسن) پر مرکوز تھی، کہ کسی طرح یہ خاندان کی عظمت وعزت کا نشان بن جائے اور دادا کی خالی مسند اس سے رونق پزیر ہو۔

تعلیم وتربیت پانچ چھ سال کی عمر ہوئی تو چچا مرحوم نے بڑی محبت وشفقت کے ساتھ بسم اللہ کرائی، ابتدائی تعلیم قرآن، اردو، فارسی اور عربی صرف ونحو کی کتابیں گیلانی میں ہی ہوئیں، اور اس کا بڑا حصہ خود چچا محترم نے پڑھایا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ گیلانی اور اطراف میں عام طور پر انگریزی تعلیم کا چرچا پھیل رہا تھا، عربی تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ سرد پڑ چکا تھا، انگریزی دورِ حکومت کی یہی دین تھی، علمار کی کوئی قدر وقیمت حکومت اور عوام کی نظر میں باقی نہ رہ گئی

تھی، زمین دار خاندان اپنے بچوں کو انگریزی تعلیم دلانا فخر سمجھتے تھے۔

دینی تعلیم کا فیصلہ مگر آپ کے چچا کا شوق سارے خاندان والوں سے الگ تھا وہ اپنے خاندانی علم کو زندہ رکھنا چاہتے تھے، کیونکہ خود بھی عالم تھے اور آپ کے والد بزرگوار بھی جید عالم دین اور مشہور ومقبول استاذ العلمار تھے، لہٰذا آپ نے اپنے بھتیجے کے لئے عربی اور دینی تعلیم کا فیصلہ کیا اور اس کی تمام تر ذمہ داری اپنے سر لی۔

جہاں تک معلوم ہے آپ کے چچا کی وفات کے بعد گیلانی میں کوئی دوسرا عالم مولانا کے زمانے میں اور اس کے بعد بھی پیدا نہیں ہوا۔ خود مولانا گیلانی مرحوم کے دونوں چھوٹے بھائیوں کو بھی انگریزی تعلیم دلائی گئی اور مولانا کے صاحب زادہ اور بھتیجوں کی تعلیم بھی اسکول وکالج اور یونیورسٹی میں ہوئی، ان میں سے کسی نے کبھی کسی مدرسہ میں نہ تعلیم حاصل کی اور نہ اسطرف رخ کیا۔

یہ مولانا گیلانی رح کی خوش قسمتی تھی کہ آپ کے چچا نے علم دین میں لگایا۔ اور اس پر پوری توجہ دی، اور اچھی سے اچھی تعلیم کے لئے جو کچھ اس دور میں وہ کر سکتے تھے، کیا، اور اپنے مقصد میں کامیابی سے ہم کنار ہوئے۔

گیلانی سے ٹونک ابتدائی عربی (نحو وصرف اور ادب) کی کتابیں جب ہو چکیں تو چچا اور گھر والوں کو خیال ہوا کہ آپ کو کسی اچھے علمی ماحول میں پہونچایا جائے تاکہ ذہن کھلے، اور پڑھنے لکھنے کا ذوق پختہ ہو، اور ساتھ ہی تعلیم وتربیت بھی اچھی ہو۔

اوپر گذر چکا ہے کہ آپ کے دادا مولانا احسن کے تلامذہ میں میر نگر (مونگیر) کے مولانا دائم علی رح بھی تھے، جنھوں نے درسیات عربی کی تکمیل کے بعد طب بھی پڑھ لی تھی۔ اور ترقی کر کے ریاست ٹونک کے دربار خصوصی

کے طبیبِ خاص ہو گئے تھے۔ انہی حکیم صاحبؒ کے فرزندِ ارجمند مولانا حکیم سید برکات احمد (م ۱۳۴۷ھ) کا اس زمانہ میں بحیثیت استاذِ معقولات بڑا شہرہ اور نام تھا۔ مختلف خطوں سے طلبہ وہاں تعلیم کے لئے آرہے تھے، حکیم صاحب مشہور معقولی عالم مولانا عبدالحق خیرآبادی (م ۱۳۱۶ھ) کے تلمیذِ رشید تھے جن کی خدمت میں سولہ سال رہ کر انھوں نے ایسا غوجی اور میزانِ منطق سے لے کر شفاء ابنِ سینا اور شرح اشارات علامہ طوسی تک کی تعلیم حاصل کی تھی اور حدیث مولانا قاضی محمد ایوب پھلیتی قاضی ریاست بھوپال سے پڑھی تھی۔

مولانا مناظر احسن کو آپ کے چچا مولانا ابو نصر صاحب نے اسی تعلق سے جو مولانا برکات احمد صاحب کے والد محترم مولانا محمد احسن سے تھا ٹونک مولانا کو بھیجنے کا سامان کر لیا۔ تاکہ آپ مولانا برکات احمد کی خدمت میں رہ کر درسیات کی تکمیل کر لیں۔

مولانا ٹونک میں بالآخر ۱۳۲۴ھ میں مولانا گیلانی بہار سے راجپوتانہ کے ریگستانی علاقہ ٹونک پہنچا دیئے گئے۔ اس وقت آپ اپنی عمر کے چودہویں سال میں تھے وہاں آپ کو آپ کے استاذ مولانا برکات احمد نے پھر ایسا غوجی سے خود پڑھانا شروع کیا۔[1] ۱۳۲۴ھ سے لے کر مسلسل ۱۳۳۱ھ تک سات سال تعلیمی سلسلہ وہیں جاری رکھا، ــــــ مولانا گیلانی نے ایک جگہ خود لکھا ہے۔

"دیوبند کی حاضری سے پہلے سات آٹھ سال تک خود اس فقیر کو جس مدرسہ میں پڑھنے کا ذاتی تجربہ ہوا ہے، علمِ حدیث کے سوا شُد بُد کی جو کیفیت بھی اپنے اندر پاتا ہوں وہ زیادہ تر اسی مدرسہ کی تعلیم کا نتیجہ ہے، میری مراد سیدی الاستاذ حضرت مولانا برکات احمد ٹونکی نزیلاً وبہاری وطناً رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم گاہ سے ہے، جس سے صرف ہندوستان اور اس کے مختلف صوبوں پنجاب، یوپی، بہار

[1] دیکھئے نظام تعلیم و تربیت ص ۲۳۲/ج ۱

بنگال، دکن وغیرہ ہی کے طلبہ کی ایک معقول تعداد فارغ ہو کر ملک کے مختلف گوشوں میں علم دین کی خدمت میں مصروف نہیں ہیں بلکہ ہر زمانہ میں بیرونِ ہند مثلاً افغانستان، بخارا، تاشقند، سمرقند ہرات، ترمذ کے طلبہ بھی تحصیلِ علم میں مصروف رہتے تھے، اور فاتحۂ فراغ پڑھ کر اپنے اپنے ملکوں کو واپس ہوتے، کم و بیش چالیس سال تک تعلیم و تعلّم کا یہ سلسلہ ان ہی خصوصیتوں کے ساتھ جاری رہا۔" (نظام تعلیم و تربیت ص ۲۲۰/ج ۱)

ٹونک ٹونک جہاں مولانا گیلانی وطن سے نکل کر پہلے پہل پہونچے تھے، راجپوتانہ کا ریگستانی علاقہ ہے انگریزوں کے تسلط ہو جانے کے بعد یہ ریاست وجود میں آئی۔ مہاراجہ اندور نے سنبھل کے ایک پٹھان کو بطور جاگیر یہ خطہ دے دیا تھا، بہت قصے قضیوں کے بعد انگریزی حکومت نے اس کو مسلمانی اسٹیٹ تسلیم کیا۔

ٹونک میں اس وقت تک نہ ریلوے لائن پہونچی تھی، نہ بس کی سواری چلتی تھی، بلکہ نوائی نامی اسٹیشن سے اتر کر اونٹ کی سواری پر لوگ جایا کرتے تھے ریلوے اسٹیشن سے اس کی دوری کوئی تیس چالیس میل تھی، مولانا گیلانی نے اپنے "بیتے ہوئے دن" میں لکھا ہے۔

"گاؤں سے جب پڑھنے کے لئے باہر نکلا تو بہار و یوپی جیسے علمی صوبوں کے شہروں اور بڑے بڑے علمی مراکز سے ریل سے گزرتے ہوئے راجپوتانے کی ایک ایسی دور افتادہ آبادی میں پہنچا دیا گیا جو ریلوے اسٹیشن سے اس وقت تک تیس چالیس میل دور ہے، اب تو وہاں پہنچنے کے لئے لاری بھی مل جاتی ہے، لیکن فقیر نے راجپوتانے کے سنگستانی خطے میں جس زمانہ میں قدم رکھا

تھا، تو نوائی نامی اسٹیشن سے اونٹوں کی دو منزلہ عجیب و غریب شکل کی گاڑی پر "آہستہ خرام بلکہ مخرام" کی شتر خرامیوں کا تجربہ کرتے ہوئے، صبح سے چل کر شام کو غالباً ٹونک پہنچنے کی مسرت حاصل کر سکا تھا۔" (رسالہ دارالعلوم دیوبند)

ٹونک کی تعلیم یہ واقعہ ہے کہ مولانا کی علمی فنی اور ذہنی و فکری استعداد و صلاحیت کی نشو و نما اسی ماحول میں ہوئی، کیوں کہ بقول مولانا مرحوم ٹونک میں معقولات کی تمام کتابیں پوری بصیرت کے ساتھ پڑھائی جاتی تھیں، جن کے پڑھنے پڑھانے کا وہاں کے سوا اس وقت کہیں اور رواج باقی نہ رہ گیا تھا، جس طرح بخاری، ترمذی، ہدایہ اور توضیح و تلویح کے اسباق ہوتے تھے، اسی اہتمام کے ساتھ حمد اللہ، قاضی مبارک، شمس بازغہ، صدرا، شرحِ تجرید، قوشجی مع حواشی، دوانی و صدر الدین شیرازی، شفاء، اشارات اور الافق المبین جیسی کتابیں بھی ہوتی تھیں، وہاں کی اصطلاح میں یہ قدما کی کتابیں کہی جاتی تھیں، اور ان کتابوں کا درس اس خصوصیت کے ساتھ ہوتا تھا کہ پڑھنے والے اس علمی خاندان کے سوا کہیں اور اس طرح نہیں پڑھ سکتے تھے[1]

استاذ کا حال پھر مولانا سید برکات احمد صاحبؒ ٹونکی کی یہ خدمت تعلیم بلا معاوضہ حسبۃً للہ تھی، مدرسہ یا کسی سے کوئی معاوضہ قبول نہیں کرتے تھے، بلکہ خود اپنے گھر سے بتیس پچیس[؟] طلبہ کو روزانہ دونوں وقت کھانا دیتے تھے، پوری زندگی یہی معمول رہا، مولانا گیلانی ہی نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ گھر میں کسی وجہ سے تنگی پیش آگئی تو مولانا کی اہلیہ محترمہ نے اپنے سونے کے کنگن بیچ دینا پسند کیا، مگر طلبہ کا کھانا بند کرنا گوارا نہیں کیا[2]

[1] دیکھئے نظامِ تعلیم و تربیت ج ۱ ص ۲۳۲ [2] ایضاً ج ۱ ص ۱۶

یہ الگ بات ہے کہ مولانا ٹونکی کی ماشاء اللہ بڑی اچھی آمدنی تھی،۔۔۔ والیِ ٹونک کے آپ طبیبِ خاص تھے، اس کے علاوہ جاگیر بھی تھی اور دواؤں کی بکری اور فیس الگ تھی، آپ کا مطب جاری رہتا تھا۔

مولانا گیلانی نے لکھا ہے۔

"مولانا برکات احمد کا شمار یوں تو ٹونک کے امراء میں تھا، والیِ ملک کے طبیبِ خاص ... تھے، معقول تنخواہ کے علاوہ گاؤں بھی جاگیر میں تھا، فیس اور دوا کی بھی آمدنیاں تھیں، بڑے صاحبِ ثروت باپ حکیم دائم علی خاں کے صاحب زادے تھے، اس لئے ان کا ذاتی مکان، مکان کیا ایک محلہ تھا، جس میں ان کے کنبے کے لوگ بھرے ہوئے تھے لیکن بایں ہمہ اللہ کا یہ بندہ علم کے اس دریا کو جس جگہ بیٹھ کر ہند بیرونِ ہند میں جاری کئے ہوئے تھا، میں اس کا چشم دید گواہ ہوں، وہ صرف خام دیواروں اور کوٹو کے چھپر کا ایک سہ درہ دالان تھا، جس کا طول شاید بارہ ہاتھ اور عرض غالباً پانچ ہاتھ سے زیادہ نہ تھا۔" (نظامِ تعلیم و تربیت ج ۱ ص ۲۳۱)

مدرسہ خلیلیہ ٹونک میں تعلیمی سلسلہ مولانا گیلانی نے ٹونک کے اسی مدرسہ خلیلیہ میں جم کر تعلیم حاصل کی، اور خصوصیت سے معقولات کی کتابیں کافی انہماک اور شوق کیساتھ پڑھیں، "بیتے ہوئے دن میں" ایک جگہ خود لکھا ہے۔

"منطق کی کچھ کتابیں گو پڑھ چکا تھا، لیکن مولانا برکات احمد صاحب نے غیر معمولی شفقت اور توجہ کی وجہ سے اس فن کے ابتدائی رسالہ ایسا غوجی سے پڑھانا شروع کیا۔" (رسالہ دارالعلوم دیوبند ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ)

واقعہ یہ ہے کہ اسی معقولات کی تعلیم کے لئے مولانا گیلانی کو ٹونک پہونچایا گیا تھا۔

کیوں کہ مولانا کے خاندان میں معقولات کا زیادہ چرچا تھا، اور ہندوستان کے مختلف گوشوں میں بھی معقولات کو ہی اصل علم شمار کیا جاتا تھا۔

مولانا نے ایک جگہ بیتے ہوئے دن میں لکھا ہے:۔

"علومِ عربیہ کا ذوق گو ہمارے خاندان کا موروثی ترکہ تھا، لیکن اس ذوق پر معقولیت کا رنگ چونکہ مستولی تھا اس لئے ہمارے مرحوم عمِ محترم مولانا الحاج الحکیم السید ابوالنصر نور اللہ مرقدہ جن سے عربی کی ابتدائی تعلیم فقیر حاصل کر رہا تھا، انھوں نے آئندہ تعلیمی مراحل کی تکمیل کے لئے مجھے ریاست ٹونک پہونچا دیا، جہاں خیرآباد کے معقولی اسکول کے امام مولانا سید برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ اپنے درس کی مسند بچھائے ہوئے زیادہ تر عقلی علوم (منطق و فلسفہ) کی تدریس و تعلیم میں بصد ذوق و شوق مشغول و منہمک تھے۔"

(ایضاً ص۴۵)

معقولات سے دلچسپی مولانا گیلانی رح میں معقولات کا ذوق استاذ محترم نے اس طرح پیدا کر دیا تھا کہ جب پہلی کتاب ایساغوجی شروع کی، تو محنت و شوق کا عالم یہ تھا کہ:۔

"تمام اسباق میں قدرتاً اسی سبق کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی، فن کا ذوق اتنا مستقل کر دیا تھا کہ اس چند ورقی رسالہ کے مطبوعہ نسخے بکثرت ملتے تھے لیکن فقیر (مناظر) نے ایساغوجی کا قلمی نسخہ اپنے ہاتھ سے تیار کیا، روز کا سبق قلم سے لکھ لیا کرتا تھا اور استاذِ محترم سے جو تقریر اس سبق کے متعلق سنتا، اسے حاشیہ پر بزبانِ اردو چڑھا لیا کرتا تھا، خیال بھی تھا کہ معقولات کی

ایک ایک کتاب کو اسی التزام کے ساتھ پڑھوں گا (ایضاً)

آگے یہ بھی مولانا نے لکھا ہے:۔

"پھر دوسری کتابوں کا سلسلہ شروع ہوا اور تقریباً سات سال تک ٹونک میں اپنی زندگی خیرآبادی اسکول کے خصوصی مذاق کے زیرِ اثر گذرتی رہی،......... استاذ مرحوم کی درسی تقریروں کے نوٹ کرنے کا سلسلہ زمانہ تک جاری رہا،...... اسی کے ساتھ معقولات ہی کے سلسلے کے بعض نادر مخطوطات کے نقل کرنے میں جس خاص طریقہ سے کامیاب ہوا تھا، زندگی کے بڑے کارناموں میں ــــ شمار کرتا تھا۔"

(ایضاً ص۴۶)

ذہانت کا ایک واقعہ حضرت مولانا عبدالرشید رانی ساگری رح مجاز حضرت قطبِ عالم مولانا مونگیری رح نے دارالعلوم معینیہ سانحہ میں ایک قیام کے موقع سے اپنی طالبِ علمی کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا کہ مولانا گیلانی ٹونک میں میرے ہم سبق تھے، کوئی شبہ نہیں کہ وہ بڑے ذکی، ذہین اور ساتھ ہی محنتی بھی تھے، ایک دفعہ استاذِ محترم مولانا سید برکات احمد صاحب رح نے تمام ساتھیوں سے کہا، کہ منطق کی اصطلاحات عام فہم زبان میں لکھ کر لاؤ، چنانچہ ہم سب نے الگ الگ لکھ کر پیش کیا، لیکن مولانا گیلانی نے اس کو ایک ڈرامہ کی صورت دے دی۔ "اور علم کو بادشاہ قرار دے کر اس کا دربار سجایا اور تمام منطقی اصطلاحات کو رعایا کی صورتیں ایک ایک کر کے پیش کیا، اور سب نے یکے بعد دیگرے حاضرِ دربار ہو کر خود اپنا تعارف کرایا، اور اپنی حیثیت ظاہر کی، حضرت الاستاذ رح اسے پڑھ کر ہنس پڑے اور فرمانے لگے یہ شبلی کا انڈا ہے۔"

مولانا رانی ساگری رح اپنی طالبِ علمی کا یہ قصہ سنا کر بہت مسکرائے، میں لطنے

ان سے بتایا کہ مولانا اپنے گاؤں گیلانی میں ہی آجکل رہتے ہیں، چنانچہ موقع نکالکر مولانا رانی ساگری رح اپنے ساتھی سے ملنے گیلانی پہنچے، اور اپنے ساتھی مولانا گیلانی سے مل کر بہت خوش ہوئے، جب اس کے بعد میری حاضری گیلانی ہوئی تو حضرت مولانا گیلانی رح نے تذکرہ کیا کہ میرے ایک پرانے ساتھی ملنے آئے تھے غالباً تم نے نشاندہی کی تھی؟۔ یہ بھی فرمایا کہ عبدالرشید پر اب جذب و استغراق کا عالم طاری رہنے لگا ہے، صاحب دل ہے۔

مولانا کا ذاتی بیان حضرت مولانا گیلانی نے "بیتے ہوئے دن میں" اس واقعہ کو دوسرے انداز میں تحریر فرمایا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھی نقل کر دیا جائے۔ لکھتے ہیں:۔

"معقولیت کے ساتھ اردو ادب کا ذوق بھی فقیر پر اسی قدیم ماحول میں بعض بیرونی مؤثرات کے تحت غالب تو نہ تھا، لیکن گونہ اس سے بھی تعلق ضرور قائم ہو گیا تھا۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ منطق میں قضایا موجہات کی جو بحث ہے، اور ان کی مختلف پیچیدہ قسمیں بتائی گئی ہیں، میں نے ہر قضیہ کو ایک زندہ شخص کا وجود قرار دیا اور ہر قضیہ کا رشتہ دوسرے قضیہ سے قائم کر کے ایک مقالہ ہی لکھ ڈالا، خدا جانے کس طرح اس مقالہ کے چند اوراق استاذ مرحوم کی نظر سے گذر گئے، ہمیشہ اس کا ذکر فرماتے اور کہتے کہ اس شخص کی حماقت ملاحظہ فرمایئے آپ نے ہر قضیہ کو گویا ایک مجسم انسانی وجود فرض کر لیا، اور باہمی ان قضایا میں رشتے قائم کئے، ہر ایک کی زبان سے تقریر کرائی گئی ہے"۔ (ایضاً ص ۴۶)

دوسرے فنون کی تعلیم ٹونک میں مولانا برکات احمد صاحبؒ سے مولانا گیلانی

نے ابتداء سے لیکر انتہا تک یعنی شرح اشارات تک معقولات کی تمام کتابیں بڑے اہتمام کے ساتھ پڑھیں، بقیہ دوسرے فنون کی کتابیں دوسرے استاذ کی خدمت میں اسی مدرسہ میں رہ کر پڑھیں۔

مدرسہ خلیلیہ میں ایک دوسرا استاد مولانا محمد اشرف مرحوم تھے، ان کی تعلیم لاہور کی شاہی مسجد کے مدرسہ میں ہوئی تھی، انھوں نے مولانا غلام علی پنجابی سے درسیات کی تکمیل کی تھی، جو مشہور استاذ مانے جاتے تھے، عربی ادب اور ریاضی سے ان کو خاصی مناسبت تھی، کئی سال درس دینے کے بعد معقولات کا جب شوق ہوا تو مدرسی چھوڑ کر مولانا برکات احمد کی خدمت میں آکر معقولات کا درس لینا شروع کر دیا۔ بعد میں ان کو مدرسہ خلیلیہ میں استاذ بنا لیا گیا تھا ——— مولانا گیلانی نے لکھا ہے کہ، فقیر کو عربی ادب، ریاضی اور ہیئت و ہندسہ کی کتابیں ان سے ہی پڑھنے کا موقع ملا ——— مولانا کے الفاظ یہ ہیں:۔

"ہدایہ اولین کا کچھ حصہ سمیجہ (ملتان) کے رہنے والے مولانا محمد اشرف مرحوم سے خصوصی طور پر فقیر نے پڑھا تھا"

آگے یہ بھی لکھا ہے:۔

"خاکسار نے مولانا مرحوم سے بہت فائدہ اٹھایا، عربی ادب کی نصابی کتابیں، حریری، متنبی، حماسہ، معلقہ، سب انہی (مولانا اشرف) سے پڑھیں اور ریاضی، ہیئت اور ہندسہ کی کتابیں بھی انہی سے پوری کیں" (رسالہ دارالعلوم دیوبند ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ)

طلبہ پر پابندی مولانا گیلانی رح کی ذہانت و محنت سے مولانا برکات احمد صاحب بہت متأثر تھے، اور ان کی دلی خواہش تھی کہ یہ اپنے وقت کا سب سے بڑا معقولی استاذ بنے، اس لئے اخبارات و رسائل، اور اردو کتابوں کے پڑھنے کی سخت

ممانعت کر رکھی تھی، طلبہ کے لئے اس طرح کی چیزوں کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے۔

مولانا گیلانی نے اپنے استاذ کے سلسلے میں لکھا ہے:۔

"حضرت حکیم (مولانا برکات احمد) صاحب پر جہاں منطق و فلسفہ کا ذوق غیر معمولی مسلط تھا، وہیں جدید اخباری ادبیات سے سخت کارہ تھے، وہ ان چیزوں کو سطحیت قرار دیتے تھے، قدغن تھا کہ ان کا کوئی طالب علم اخبار نہ دیکھے، ناول نہ پڑھے اور جدید اردو ادب کے مصنفین کی سطحی کتابیں مطالعہ نہ کرے۔"

(ایضاً ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ ص ۴۶)

طب پڑھنے کی ممانعت ٹونک کے زمانۂ قیام میں مولانا گیلانی نے چاہا کہ طب کی کتابیں پڑھ لیں، تاکہ آئندہ ذریعۂ معاش بن سکے، مگر استاذِ محترم نے آپکے لئے اسکو بھی پسند نہیں کیا، اور کسی طرح اجازت نہیں دی، مولانا نے "ایامِ عمرِ گذشتہ" میں ایک جگہ تذکرہ کیا ہے کہ:۔

"ایک ذریعۂ معاش غریب مولویوں کے لئے طب کا رہ گیا تھا، میرا خاندانی پیشہ چند پشت سے طب کا تھا، فرمانروائے ٹونک کے طبیب خاص مولانا حکیم برکات احمد صاحب قدس سرہٗ العزیز میرے استاذ تھے، لیکن انھوں نے طب پڑھانے سے انکار ہی نہیں کیا، بلکہ ان کے بھائی سے جب طب کی کتاب شروع کی تو جدّاً حکیم صاحب مرحوم نے ان کو پڑھانے سے منع کر دیا۔"

(رسالہ دارالعلوم دیوبند شعبان ۱۳۷۴ھ ص ۳۵)

طب سے ممانعت کی وجہ استاذِ مرحوم نے طب پڑھانے سے خود انکار اور دوسروں کو منع اس لئے کیا تھا کہ ذی استعداد، ذہین مولوی ہے، استاذ بنے گا، تو ملک و

ملت کو عظیم فائدہ ہوگا، طبیب ہو کر کیا کرے گا؟ علاج معالجہ کے راستے سے اچھا پیسہ کما لے گا، مگر اس کام کے لئے بہت سارے اطبار موجود ہیں، اس جوہرِ گرانمایہ کا برباد ہونا بڑا علمی خسارہ ہوگا۔

مختصر یہ کہ استاذِ محترم نے بڑی تمناؤں کے ساتھ مولانا گیلانی کو پڑھایا تھا۔ اور ان سے ان کی بہت ساری امیدیں وابستہ رہی ہوں گی جیسا کہ عام طور پر مخلص اساتذہ کو اپنے ذہین و ہونہار تلامذہ سے رہتی ہیں، اور انھوں نے تو سات آٹھ سال خصوصی توجہ سے مولانا گیلانی کو پڑھایا تھا، پھر ایسا کیوں نہ سوچتے، اُن کا یہ سوچنا بجا تھا۔

انقلاب طبع کا اثر استاذ پر مولانا کی زندگی میں جب وعظ گوئی کے راستہ سے نیا انقلاب آیا، جس کی تفصیل آپ اپنی جگہ پڑھیں گے، تو مولانا کے استاذ اقدسؒ پر کیا گذری ہوگی، ناقابلِ بیان ہے، اس سلسلہ میں خود مولانا گیلانی ہی کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں، لکھتے ہیں:۔

"حکیم (مولانا برکات احمد) صاحبؒ قبلہ کی غیوبت سے خوب مدد ملی، جب واپس ہوئے نہ پوچھئے کہ اپنے اس شاگرد کے متعلق جسے وہ حمداللہ اور قاضی مبارک کا کامیاب مدرس بنانا چاہتے تھے اسی کے متعلق یہ سن کر کہ وہ تو، واعظِ شہر بن گیا ہے، ان پر کیا گذری، خود اس پر جس حد تک برس سکتے تھے برسے ہی، اور جن لوگوں نے واعظِ شہر بنانے کے جرم میں حصّہ لیا، ان کی جو درگت بنی وہی بے چارے جانتے ہوں گے۔ غفر اللہ لہم ولنا اجمعین۔"

(رسالہ دارالعلوم دیوبند ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ ص ۴۰)

وعظ گوئی کی جرأت ٹونک کی زندگی میں اس وقت اس لئے ہوئی تھی کہ مولانا کو

استاذِ محترم نواب صاحب ٹونک کے ساتھ ایک ماہ کے لئے ٹونک سے باہر گئے ہوئے تھے، حضرت مولانا حکیم برکات احمد صاحب وعظ گوئی کو بھی طلب کے لئے پسند نہیں کرتے تھے، اور سطحیت قرار دیتے تھے، مولانا گیلانی نے اپنی اس تقریر کا جہاں قصہ سنایا ہے، وہاں صراحت کی ہے۔

"اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ استاذ مرحوم نواب صاحب ٹونک کے ساتھ ایک مہینہ کے لئے باہر چلے گئے تھے، میدان خالی تھا، ورنہ جیسے ان کے یہاں اخبار بینی وغیرہ سطحیت کے الزام مطعون تھی، اسی طرح وعظ گوئی بھی حکیم صاحب قبلہ کے نزدیک سطحی مولویوں کا پیشہ سمجھی جاتی تھی۔" (ایضاً ص۲۷)

علمی استعداد اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ پہلے زمانہ میں طلبہ ذی استعداد کیسے ہوتے تھے اور ان پر اساتذہ کتنی محنت کرتے تھے، اور اپنے تلامذہ سے ان کا کتنا گہرا اور مخلصانہ لگاؤ ہوتا تھا، ان کی کیسی نگرانی فرماتے تھے، اور ان کی ہر حرکت و سکون پر کس طرح نظر رکھتے تھے، اسی کا نتیجہ تھا کہ ہر ہر طالبُ العلم جب مدرسہ سے نکلتا تھا، تو اپنے وقت کا جیّد استاذ اور صاحبِ فن ہوا کرتا تھا، مولانا گیلانیؒ بلا شبہ خوش قسمت تھے کہ مولانا برکات احمد جیسا شفیق استاذ ملا، جنھوں نے ان کے چھُپے ہوئے جوہر کو نکھار دیا، جس سے وہ اپنے زمانہ کے نیّرِ تاباں بنے، اور آگے چل کر اپنے ہم عصروں میں ممتاز شمار ہوئے۔

ایک نئے انقلاب سے دوچار

مولانا گیلانی ابتک دنیا و مافیہا سے الگ تھلگ صرف لکھنے پڑھنے اور مطالعہ میں منہمک تھے، کہ ہندوستان میں خلافت کی تحریک شروع ہوئی، یہ ۱۳۲۰ھ کا ابتدائی مہینہ تھا، ٹونک کا علاقہ اس سے بڑی حد تک دور دراز ہونے کی وجہ سے الگ تھلگ رہا، مگر انہی دنوں میں ایک مولوی صاحب چندہ کے نام پر وہاں بھی پہونچ گئے، اور جمعہ میں ان کی تقریریں شروع ہوگئیں انکی تقریر میں زور بیان نہیں تھا اس لئے کئی ہفتے گذر گئے، مگر انھیں قطعًا کامیابی حاصل نہیں ہوئی، مشکل سے چار پانچ روپے جمعہ میں چندہ ہو پاتا تھا۔

— تقریر سُننے والوں میں مولانا گیلانی بھی بحیثیت طالبُ العلم شریک ہوتے تھے جمعہ کی نماز پڑھنے جانا جامع مسجد ہی میں ہوتا تھا، یہ مولانا کی نوجوانی کا زمانہ تھا مولانا محسوس کرتے تھے کہ خود واعظ میں جان نہیں ہے ایک جمعہ میں ایسا ہوا کہ وہی مولوی مقرر صاحب اپنی تقریر میں کہنے لگے :۔

"اس شہر میں عربی مدرسہ بھی ہے، علماء بھی ہیں، اور طلبہ بھی ہیں، لیکن جمود و بے حسی کی یہ انتہا ہے کہ ہفتوں سے چلّا رہا ہوں، کوئی میری پشت پناہی کے لئے تو کیا اٹھتا، بات بھی نہیں پوچھتا۔"

(رسالہ دارالعلوم دیوبند ذی الحجہ ۱۳۷۲ھ ص۴۴)

مولانا پر تقریر کا ردِ عمل تقریر کرنے والے مولوی صاحب کے یہ جملے مولانا گیلانی کے لئے چیلنج بن گئے، اور وہاں سے جب اُٹھے تو سوچنے لگے کیوں نہیں ایک جمعہ میں تقریر کردوں، کہ مولوی صاحب کو اندازہ ہوجائے کہ اس مدرسہ کے

طلبہ کیسے ہوتے ہیں، اور لوگوں پر کیسے اثر انداز ہوا جاتا ہے۔

اس زمانہ میں اتفاق سے مولانا گیلانی کے استاذ محترم ایک ماہ کیلئے ٹونک سے باہر جا چکے تھے، میدان خالی تھا، ان کی موجودگی میں ہمت نہیں ہو سکتی تھی، مگر جب اطمینان تھا کہ استاذ کی واپسی کہیں ایک ماہ بعد ہوگی، اسوقت تک میرے وعظ کی بات بھول بھلا جائے گی اور حضرت الاستاذ کو خبر تک نہ ہوگی یہ ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھا کہ ان کا یہ وعظ انھیں واعظِ شہیر بنا دے گا۔ اور یہاں سے ان کی علمی لائن بدل جائے گی، نوجوانی کا جوش اور شوق تھا، جس نے مولانا کو وعظ گوئی یا نمازیوں سے خطاب کے لئے آمادہ کر دیا۔

پہلا وعظ ٹونک میں مولانا لکھتے ہیں کہ اس سوچ میں جمعہ کا دن آگیا، نماز بھی ہوگئی، اپنے اس تقریری ارادہ سے صرف اپنے چند ساتھیوں کو مطلع کیا تھا، سنتوں کے بعد تقریر کے لئے دفعۃً کھڑا ہوگیا، اسے خود مولانا کے قلم سے ہی سننے میں مزہ آئیگا کہ انداز کیا تھا، فرماتے ہیں:۔

"بیچ مسجد میں کئی ہزار نمازیوں کو بلند آواز میں کڑکتے ہوئے، وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (اور جدا ہو جاؤ آج کے دن اے جرم کرنے والے لوگ) کی قرآنی آیت سے کچھ اس طرح خطاب کیا کہ جو جہاں تھا وہاں سے ہلنا بھی محسوس کر رہا تھا کہ ناممکن ہے۔"

وعظ کے اثرات مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ حمد و نعت کے بعد قرآن پاک کی یہی ایک آیت تلاوت کی اور پھر جو کچھ کہنے والا تھا کہنے لگا، پندرہ منٹ بھی نہ گذرا تھا کہ معلوم ہوا:۔

"ساری مسجد میں کہرام مچا ہوا ہے، جو کہہ رہا تھا وہ بھی بے ہوش تھا

رو رہا تھا، اور جو سُن رہے تھے وہ بھی ڈھارے مار رہے تھے، جس کے پاس جو کچھ تھا پھینکتا جا رہا تھا، اس میں روپے بھی تھے پیسے بھی گھڑیاں بھی تھیں، انگوٹھیاں بھی، شروانیاں بھی تھیں، اور چھڑیاں بھی، سب سمیٹی گئیں، اندازہ کیا گیا کہ جس مسجد میں چند ہفتوں تک کی تقریروں سے سو روپے بھی وصول نہ ہو پاتے تھے اس مسجد میں دیکھا گیا کہ تقریباً پانچسو روپیہ کا سرمایہ جمع ہوگیا تھا۔"

(رسالہ دار العلوم ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ)

یہ مولانا کی نوجوانی کے جوش و خروش میں دل سے نکلی ہوئی باتیں تھیں، جو دلوں کو چیرتی ہوئی سینوں میں اترتی جا رہی تھیں، اور سننے والے تڑپ رہے تھے،

واعظِ شہیر اس کے بعد پھر کیا تھا مولانا طالب العلم سے واعظِ شہیر ہوگئے، لوگوں نے دعوتیں شروع کر دیں، محلے محلے خوب جلسے ہونے لگے، اور اسی ٹونک نامی شہر کر کوئی بیس ہزار کی رقم امدادی فنڈ میں بھیجی گئی، جس میں کل تک ایک پردیسی مولوی کے وعظ کا کوئی اثر دیکھنے میں نہیں آرہا تھا، مولانا بھی خوش، ساتھی سارے خوش اور اہلِ شہر کو بھی فخر کہ ان کے شہر کا ایک طالب العلم ایسا پُرجوش و خوش بیان مقرر ہے۔ اب چندہ کرنے والے مولوی صاحب کی بھی آنکھیں کھُل گئیں، کہ مسلمانوں سے چندہ کی اپیل کسطرح کیجاتی ہے، اور مسلمان چندہ دینے میں کس قدر سخی ہوتے ہیں، اور اسلام کے نام پر کیا کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک نوجوان طالب علم کی بس ایک تقریر سے کایا پلٹ ہوگئی، شکوے گلے جاتے رہے اور ایسا معلوم ہوا کہ سوتے ہوئے مسلمان جاگ گئے، ان میں جوش و خروش پیدا ہوگیا اور عام مسلمانوں کی رگوں میں زندگی کا خون جسے منجمد سمجھ لیا گیا تھا، دوڑنے لگا۔

تقریری سرمایہ کی فراہمی طالب علمی کا زمانہ تھا دس بیس تقریروں میں وہ سارا سرمایہ

ختم ہوگیا، جو مطالعہ یا اساتذہ کی درسی تقریروں سے ذہن میں جمع کر رکھا تھا، مولانا گیلانی فرماتے ہیں کہ واعظ ہونے سے حوصلے بڑھ گئے، جوشِ عمل میں اضافہ ہوگیا، مگر محسوس ہوا کہ وعظ میں کہنے کی کوئی نئی بات ذہن میں باقی نہیں رہی، چنانچہ امام غزالی رح کی احیاء العلوم کی طرف متوجہ ہوا۔

خود لکھتے ہیں:

"ہوا یہ کہ اس عرصے میں چند دنوں تک تو دماغی سرمایہ سے اپنی تقریر وغیرہ کام لیتا رہا، لیکن نوعمری کا زمانہ، سرمایہ بہت جلد ختم ہوگیا، ضرورت اضافہ کی ہوئی، اتنی سمجھ پیدا ہو چکی تھی کہ احیاء العلوم غزالی کا مطالعہ عربی زبان میں کر کے مطالب کو اخذ کر سکتا تھا، احیاء العلوم کا مطالعہ شروع ہوا، مطالعہ کلیۃً دوسروں کے لئے کیا جاتا تھا۔" (ایضاً ص۴۹)

امام غزالی کی گرفت میں گویا احیاء العلوم کے ذریعہ وعظ کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ مگر مولانا کو کیا خبر تھی کہ امام غزالی رح ان کو اپنا مرید باصفا بنا لیں گے، اور ان کے دل و دماغ پر قابض ہو جائیں گے، لیکن ہوا یہی کہ پڑھنے والا خود شکار ہوگیا، خود لکھتے ہیں

"لیکن بجائے دوسروں کے سب سے پہلے غزالی کی گرفت میں خود مطالعہ کرنے والا پھنس گیا، اور ایسا پھنسا کہ شاید آخری سانس تک یہ گرفت ڈھیلی ہوتی ہوئی نظر نہیں آتی۔" (ایضاً)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام غزالی رح کی احیاء العلوم نے پہلے حملہ میں ہی معقولات کے وہ سارے تانے بانے بکھیر دیئے جو برسوں سے اس لئے ذہن و فکر کے دریچوں پر بُن رکھے تھے، حیرت ہے کہ سات سال کا کمایا ہوا، اثاثہ چند دنوں میں لٹنے لگا، اور ذہن و فکر کا ڈھانچہ بدلنے لگا، یہ ایسا انقلاب تھا، جس سے خود مولانا حیرت زدہ تھے، لکھتے ہیں:-

"دماغ الٹ گیا، طبیعت پلٹ گئی، دل بدل گیا جو کچھ اب تک تھا، وہ باقی نہ رہا، نتیجہ یہ ہوا کہ اب نہ منطق کی کتابوں میں جی لگتا ہے اور نہ فلسفہ میں لذت ملتی ہے، سب سے دل اچاٹ ہوگیا اسی اضطراب میں کچھ دنوں کے لئے ٹونک سے غائب بھی ہوگیا، قربِ مکانی کی وجہ سے خواجۂ ہند (اجمیریؒ) کے آستانہ پر جا گرا۔"

(ایضاً)

امام غزالیؒ کے اثرات حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ کے مزارِ مقدس کی کشش مولانا گیلانی کو اجمیر لے آئی، سوچا ہوگا وہاں پہونچ کر بے چین طبیعت کو چین آئے گا، جس ذہنی و فکری انقلاب سے اس وقت دوچار ہیں شاید اس میں کچھ کمی آجائے گی، اور اس طرح آب و ہوا کی تبدیلی بھی ہو جائیگی۔

یہاں آکر قیام کا بھی ایک مسئلہ سامنے تھا، چنانچہ ٹھہرے اپنے ہم ذوق مولانا معین الدین اجمیری رح کے پاس، جو مولانا مرحوم کے استاذ بھائی تھے کیونکہ مولانا اجمیری رح بھی حضرت مولانا برکات احمدؒ کے ارشد تلامذہ میں ہی تھے خود مولانا مرحوم نے لکھا ہے:

"اجمیر شریف میں خاکسار کا قیام مولانا معین الدین مرحوم کے دولت خانہ پر تھا، مولانا مرحوم ہمارے استاذ مولانا برکات احمد کے ارشد تلامذہ میں تھے، اسی تعلق سے خاکسار کو اپنا مہمان بنایا تھا، میں نے ان سے پڑھا تو نہیں تھا، لیکن ان کی عنایت و نوازش سے ہمیشہ مستفید ہوتا رہا۔"

(رسالہ دار العلوم دیوبند محرم ۱۳۷۱ھ ص۴۲)

شکوۂ خواجہ ابھی خلافت سے متعلق وعظ کا جنون اُترا نہیں تھا، یہاں

پہونچکر ایک لمبی نظم لکھی، پہلے اجمیر کی شاہجہانی مسجد میں جوشیلی وجذباتی تقریر کی بیس پچیس ہزار کا مجمع تھا اور پھر خواجہ کے قبہ کے سامنے اس عظیم مجمع میں اپنی وہ نظم سنائی جس کا عنوان "شکوۂ خواجہ" تجویز ہوا تھا، مولانا نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ ۲۲ صفر ۱۳۳۰ھ کا ہے۔

مولانا نے اپنی جوانی میں جب یہ نظم پڑھی ہوگی، یقیناً مجمع بے تاب ہوگیا ہوگا، اور جو حال ٹونک میں نمازیوں کا ہوا تھا اس سے کچھ زیادہ آہ وزاری یہاں بھی ہوئی ہوگی، کیوں کہ مولانا کی آواز میں درد تھا، جاذبیت تھی، اور محویت کا عجب عالم ہوتا تھا،

مولانا کے پڑھنے کا اثر | خاکسار کو تجربہ ہے کہ مولانا گیلانی کی آواز میں بلا کی کشش تھی جب جہری نماز میں قرآن پڑھتے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دل سینے سے باہر ہوا جاتا ہے اور نظم پڑھتے ہوئے بچشم خود دیکھا اور سنا ہے کہ اس بڑھاپے میں بھی مولانا کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتا تھا، اور سننے والا کھو جاتا تھا اور وہ بھی روتا جاتا تھا۔

ایک حاضری کے موقع سے مولانا مرحوم نے دوپہر کے سناٹے میں یہ "شکوۂ خواجہ" اور مدینہ منورہ کی حاضری کے موقع سے جو نعت کہی تھی، خود لے سے پڑھ کر بندہ کو سنائی، جہاں خاکسار اور مولانا کے سوا کوئی تیسرا نہیں تھا، خود بھی خوب ... رُوئے اور سُننے والا بھی تڑپ تڑپ کر رہ گیا، یہ ریٹائر ہونے کے بعد کا واقعہ ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دور نوجوانی اور طالب علمی میں مولانا کی نظم نے کیا آفت ڈھائی ہوگی، پورے اجمیر میں اس کا خوب خوب چرچا پھیلا۔

ٹونک سے واپسی | مولانا معین الدین اجمیری رح کو جب اطلاع پہونچی کہ اس جوان مولوی کا اس وقت یہ حال ہورہا ہے، تو مولانا اجمیری رح نے انکو ٹھنڈا کرنے کی تدبیر کی، خود لکھتے ہیں:—

"مولانا معین الدین نے سمجھا بجھا کر مجھے پھر ٹونک لوٹا دیا، لوٹنے

کی حد تک تو لوٹ گیا۔ مگر اجمیر شریف ہی کے قیام میں مبہم مبہم سا ایک فیصلہ دل میں جلوہ گر ہونے لگا، کہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لئے بجائے ٹونک کے کہیں اور مجھے چلنا چاہیے"۔

(رسالہ دارالعلوم دیوبند محرم ۱۳۷۱ھ ص ۴۳)

پاسبان عقل کی پسپائی | یہ نیا انقلاب مولانا گیلانی کی زندگی میں بہت موثر ثابت ہوا اور ان کا رخ اس نے معقولات سے منقولات کی طرف موڑ دیا، قاعدہ ہے کہ جب قلب متأثر ہوتا ہے تو پھر عقل کی کچھ نہیں چلا کرتی ہے، جن لوگوں کو عقل ودل کی لڑائی کا تجربہ ہے، وہ بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں، عقل ہزار دلائل پیش کرے، اور دل کو قائل بھی کردے، مگر پھر بھی دل قابو میں آنے کا نام نہیں لیتا کسی شاعر نے کہا ہے ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ کبھی کبھی "پاسبانِ عقل" بھی بے دست وپا نظر آتا ہے۔ اور جو نہ ہونا چاہیے دل اس کے کرنے پر بضد ہو جاتا ہے، اور آدمی سب کچھ جانتے ہوئے مجبور ہو جاتا ہے۔

ہیضہ کا ابتلاء | اجمیر سے مولانا لوٹ کر جب ٹونک آئے، تو قدرت کی طرف سے ایک نیا حادثہ یہ پیش آیا کہ چند ہفتے کے بعد ہی ٹونک میں ہیضہ جیسی وبائی بیماری پھیل گئی، اور ایک ایک دن میں بیسوں آدمی مرنے لگے، مولانا کا بیان ہے کہ

"اس مختصر سی آبادی (ٹونک شہر) میں مرنے والوں کی تعداد اسی اسی بچاسی تک کسی دن پہونچ جاتی تھی"۔ (ایضاً)

یہ معاملہ اسی حد تک نہیں رہا، بلکہ اس مرضِ مہلک میں خود مولانا گیلانی بھی

مبتلا ہو گئے، ہیضہ کا بڑا زبردست حملہ ہوا، ایسا کہ شفاء پانے کے بعد بھی پندرہ دن تک آنکھوں کی بینائی غائب رہی، بیماری کے زمانہ میں مدرسہ کے طلبہ نے بہت خدمت کی، مولانا کے شفیق استاذ برابر دردمندی کے ساتھ علاج میں مشغول رہے، اور ایک مرحلہ تو ایسا آیا کہ طبیب بھی قطعًا مایوس ہو گئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے فضل فرمایا، اور کسی طرح جان بچی، مولانا نے "بیتے ہوئے دن" میں اس بیماری کا تذکرہ کیا ہے، لکھتے ہیں:

"دوسروں کے ساتھ خاکسار بھی اس وبائی مرض (ہیضہ) میں مبتلا ہوا، حملہ اتنا سخت تھا کہ شفایاب ہونے کے بعد بھی دس پندرہ دن تک مجھے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا، بینائی گویا مفقود ہو چکی تھی دس بارہ طالبِ علم نوبت بہ نوبت میرے اردگرد شب و روز جاگتے رہتے تھے، اور تیمارداری کے فرائض انجام دیتے تھے چند مہینے پہلے بجائے ایک معمولی طالبِ علم کے واعظِ شہر بھی بن چکا تھا، اس لئے سارا شہر میرے بیمار پڑ جانے کی خبر سے متأثر تھا شہر کے ایک معمر بزرگ جنھیں حضرت سید احمد صاحب بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی رفاقت کا شرف نوعمری میں حاصل ہوا تھا عیادت کے لئے تشریف لائے، اور اپنی نیم بے ہوشی کی حالت میں ان کی زبان سے میں نے کچھ سُنا، کیا سُنا؟ جسے بھی سناؤں گا سننے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا، بس میں نے سُن لیا اور جو سُنایا گیا تھا اسے دیکھ بھی لیا ــــــ ہیضہ کا وہی مریض جس کی نبض پر ہاتھ رکھنے کے ساتھ ہی طبیب (حکیم مولانا برکات احمد صاحب) آبدیدہ ہو کر سرہانے سے اٹھ چکا تھا، وہی زندہ کیا گیا، جو آنکھیں نابینا ہو چکی

تھیں، ان میں رفتہ رفتہ روشنی واپس آئی"۔ (ایضًا ص۴۳ و۴۴)

صحت یابی کے لئے ایک بزرگ کی دعاء

مولانا گیلانی کے بیان سے ظاہر ہے صحت یابی میں حضرت سید احمد بریلوی شہید رح کے اس رفیق کی دعاء کا بڑا اثر تھا، جو عیادت کے لئے ... تشریف لائے تھے، اور جنھوں نے مولانا کی صحت یابی کے لئے خصوصی دعا کی تھی؛ مولانا نے اسے یہ کہہ کر ظاہر نہیں فرمایا کہ "جسے بھی سناؤں گا سننے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا"۔ بعض اللہ والوں کی دعا میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔

جن لوگوں نے "سیرتِ شہید" کا مطالعہ کیا ہے ان کو اندازہ ہو گا کہ اس جماعت کے ایک ایک فرد کا کیا حال تھا، جہاد کے جذبہ نے ان سب کو سراپا حال بنا رکھا تھا جہاں جہاں یہ قافلہ پہنچا، وہ جگہ پُرنور معلوم ہوتی تھی۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو صحت بخشی، آنکھوں کی بینائی جو مرض کی شدت سے ختم ہو چکی تھی، عود کر آئی، اور بعدِ صحت گھر والوں کے تقاضا پر ٹونک سے وطن آ گئے کہ آب و ہوا کی تبدیلی سے پورے طور پر توانائی پھر آ جائے اور تعلیم کا جو حصہ باقی رہ گیا ہے، وہ پورا ہو سکے۔

مولانا گیلانیؒ دارالعلوم دیوبند میں

ہیضہ کی بیماری سے جب جان بچ گئی اور وطن آ گئے، تو سوچنے لگے، آئندہ سال کیا کیا جائے؛ یہ تو تقریباً طے کر چکے تھے کہ ٹونک نہیں جانا ہے، ادھر یہ بات بھی طے تھی کہ معقولات کی ساری کتابیں پڑھ چکے، نصاب کی تکمیل ہو چکی تھی، صرف حدیث پڑھنے کا مسئلہ باقی رہ گیا تھا۔

دیوبند کا تذکرہ | اجمیر شریف جن دنوں مولانا معین الدین اجمیری رحؒ کے یہاں آپ کا قیام تھا، ان کی زبان سے حدیث پڑھانے کی تعریف شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن رحؒ کے متعلق سن چکے تھے، اس لئے ذہن میں بار بار دیوبند کا ہی نام آتا تھا، شیخ الہند رحؒ کے متعلق اپنی ہی جماعت کے مولانا اجمیری رحؒ سے ان کے بزرگ ہونے کا واقعہ بھی سن رکھا تھا، اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ مولانا کو امام غزالی رحؒ کی احیاء العلوم نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

شیخ الہند رحؒ کا ذکر | جہاں اجمیر کا قصہ بیان کیا گیا ہے وہاں مولانا اجمیری رحؒ کے حوالہ سے مولانا گیلانی نے لکھا ہے:-

> "اثنائے گفتگو میں پہلی مرتبہ ان ہی (مولانا اجمیریؒ) سے مجھے معلوم ہوا کہ حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نرے مولوی اور مدرس ہی نہیں ہیں، بلکہ ایک خدا رسیدہ عارف ہونے کے ساتھ ساتھ انہیں وہ تڑپ بھی پائی جاتی ہے جس نے آج کل تجھے بے چین کر رکھا ہے۔"
>
> (رسالہ دارالعلوم محرم ۱۳۷۱ھ صـ ۴۳)

یہ حقیقت بھی ہے کہ اس زمانہ میں علم حدیث کا شیخ الہند رحؒ سے بڑھ کر کوئی

دوسرا استاذ ہندوستان میں نہیں تھا، اور نہ دارالعلوم دیوبند کا سا کوئی مدرسہ تھا جہاں ملک کے کونے کونے سے طلبہ تو آتے ہی تھے بیرون ملک سے بھی حدیث پڑھنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، علوم دینیہ کی درس و تدریس کے اعتبار سے دارالعلوم کا دورِ شباب تھا۔

دل کی بات زبان پر | رمضان میں دل کی بات زبان پر آئی اور مولانا نے اپنے مربی مولانا ابوالنصر سے عرض کیا کہ اب حدیث پڑھنے کے لئے مجھے دیوبند کی اجازت مرحمت فرما دیں" مولانا کے مربیؒ پہلے اس کے لئے راضی نہیں ہوئے، چچا بھتیجے میں بحث ہوتی رہی، چچا کا رجحان اب بھی ٹونک ہی کی طرف تھا اور بھتیجا بضد تھا کہ اب اسے وہاں نہیں جانا ہے، دل کا رجحان دیوبند کی طرف ہے بھتیجا اب بچے سے جوان ہو چکا تھا، علم و فضل کے آثار پورے طور پر ظاہر ہو چکے تھے۔

مبشرات | اس کا فیصلہ قدرت نے اس طرح کیا کہ چچا کے خواب میں کچھ ایسے مبشرات آئے کہ ان کو اپنی رائے بدلنی پڑی اور بھتیجے کی رائے کی درستی سمجھ میں آنے لگی مولانا نے لکھا ہے کہ:-

> "اپنے بزرگوں کو دل کے اس فیصلہ سے مطلع کیا، فیصلہ یہی تھا کہ دارالعلوم دیوبند پہنچ کر حضرت مولانا محمود حسنؒ سے حدیث پڑھنا چاہتا ہوں، ردّ و قدح کا سلسلہ جاری تھا کہ بعض مبشرات اور رویائے صالحہ نے میرے تعلیمی سرپرست عمِّ مغفور و مرحوم مولوی حکیم سید ابوالنصر کے قلب کو ...... بھی اس فیصلہ کے لئے راضی کر دیا، اور طے ہو گیا کہ رمضان بعد بجائے ٹونک خاک سار دارالعلوم دیوبند ہی کا احرام باندھے گا۔" (ایضاً صـ ۴۳)

دیوبند سے خط و کتابت اب مولانا گیلانی اس فکر میں پڑے کہ دیوبند پہنچے کا سلسلہ کیا ہو؟ دیوبند کے کسی عالم سے شناسائی نہیں تھی، اور نہ کسی دیوبندی عالم سے ملاقات کی نوبت آئی تھی، لیکن جوئندہ یابندہ، مولانا گیلانی سوچتے رہے، پھر خود ہی خیال آیا کہ دارالعلوم دیوبند کے مہتمم صاحب کو ایک خط لکھ دیا جائے تاکہ داخلہ میں آگے چل کر کوئی دشواری پیش نہ آئے، چنانچہ یہی کیا، حافظ محمد احمد صاحبؒ خلفِ ارشد بانی دارالعلوم حضرت نانوتویؒ جو اس زمانہ میں مسندِ اہتمام پر فائز تھے، انکے نام ایک درخواست لکھی کہ آپ کے مدرسہ میں داخل ہو کر دورۂ حدیث پڑھنا چاہتا ہوں، اپنی استعداد کے ثبوت میں "الجواہر الغالیہ فی الحکمۃ المتعالیہ" کی چند فصلوں کا اردو ترجمہ کر کے درخواست کے ساتھ روانہ کیا۔

درخواست کی منظوری قدرت کو دارالعلوم دیوبند پہنچانا تھا، مولانا لکھتے ہیں کہ واپسی ڈاک سے جواب ملا کہ "تم فوراً دیوبند پہنچ جاؤ، ہر چیز کا نظم کر دیا جائے گا"۔

اس پر دستخط حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تھے، جو اسوقت دارالعلوم کے مہتمم تھے، اور یہ بانی دارالعلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی قدس سرہٗ کے خلف الرشید تھے۔

اس جواب سے قدرتاً مولانا گیلانی کو مسرت ہوئی، چچا کو دکھایا، کہ داخلہ کی منظوری آگئی، اب اس کے بعد دیوبند روانگی کی تیاری شروع کر دی۔

دیوبند کے لئے روانگی یہ خط و کتابت ماہِ مبارک رمضان میں ہوئی تھی، عید بعد سفر کا انتظام شروع ہو گیا اور پھر بقول مولانا مرحوم:۔

"رمضان بعد حسبِ طلبی خاکسار گھر سے تنِ تنہا روانہ ہوا، کچھ نہیں جانتا تھا جس ماحول میں شریک ہونے جا رہا ہوں وہاں کی خصوصیات کیا ہیں؟ اس ماحول سے مناسبت پیدا ہو گی یا نہیں، تنہا ہی گھر سے نکلا"

اس زمانہ میں آج کی سی سہولت نہیں تھی، گیلانی سے اپنے اسٹیشن شیخپورہ پیدل چل کر آنا پڑا ہو گا، جو دس پندرہ میل سے کم نہیں، یہاں سے گیا، گیا سے سہارنپور اور سہارنپور سے دیوبند پہنچے، خود مولانا لکھتے ہیں:۔

"دیوبند کے اسٹیشن پر ٹھیک اس وقت جب اپنی عمر کے بیسویں سال میں خاکسار نے قدم رکھا تھا، تنہا ہی اترا، مدرسہ میں واقفیت اور وہ بھی صرف رسمی واقفیت ایک طالب علم سے تھی، ان کا نام منظر حسن تھا، جو اب بوڑھے ہو کر بہار ہی کے ایک گاؤں میں مولانا حکیم منظر حسن کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک خط ان کے بڑے بھائی صاحب کا ان کے نام لے لیا تھا۔ اسٹیشن سے تانگے پر بیٹھ کر قصبہ کی سڑکوں اور گلی کوچوں سے گذرتے ہوتے اچانک ایک شاہی دروازے کے سامنے تانگے کو دیکھا ٹھہر گیا کہ یہی دارالعلوم دیوبند ہے ——— پیشانی پر جس کے انتہائی سادگی کے ساتھ "مدرسہ اسلامی عربی دیوبند" لکھا ہوا تھا"۔

(رسالہ دارالعلوم دیوبند)

مولانا دارالعلوم میں سامان اتار کر، آنے جانے والے طلبہ سے منظر حسن بہاری طالب العلم کا کمرہ معلوم کیا، کسی نے رہنمائی کی احاطہ مسجد کے کمرہ نمبر ایک میں پہنچ گئے جو مسجد کے جنوبی پہلو میں پچھم طرف سے پہلا کمرہ ہے۔ مولانا نے لکھا ہے کہ اس کمرہ کے اندر کمرہ ہے جس کو وہ "حجرۂ قبریہ" کے نام سے یاد کرتے ہیں، جس کمرہ میں دارالعلوم کی پوری طالب العلمی آپ نے گذاری اس کمرہ میں سامان رکھ کر جونہی ذرا اطمینان ہوا، دفتر اہتمام میں حضرت مہتمم صاحبؒ سے ملاقات کے لئے حاضر ہو گئے، وہاں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ سے شرفِ نیاز حاصل ہوا

آپ نے بتایا کہ میں نے خط لکھا تھا، خط کا جواب گیا تھا، جواب میں یہاں پہنچنے کو لکھا گیا تھا، چنانچہ آج بندہ یہاں اسی غرض سے حاضر ہوا ہے، مولانا عثمانی رح نے فرمایا، تم آگئے ہو تو ان شاء اللہ داخلہ ضابطہ میں بھی ہو جائے گا۔ سردست مولانا گیلانی کو مولوی منظر حسن بہاری کے سپرد کیا کہ مولوی صاحب سنئے ہیں ان کو اپنے حجرہ میں رکھو، مولانا گیلانی نے آپ بیتی میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رح کے سلسلے میں ——— لکھا ہے:-

میں نہیں جانتا تھا کہ میری دینی و دنیوی راہوں کی ہمواری جس کی کریمانہ نوازشوں، اور پدرانہ شفقتوں کے ساتھ ازل ہی سے مقدر ہو چکی تھی اس کی قدم بوسی کی ابتدار کی سعادت اس صورت میں پیش آئے گی ——— اللہ اللہ کیا ٹھکانہ ہے اس سچائی اور بے ریا زندگی کا کہ سارا کام جو انجام دے رہا تھا ——— پہلے اس کے نام سے بھی نا واقف تھا۔" (دارالعلوم محرم ۱۳۷۱ھ ص۲۶)

شیخ الہند اور حافظ احمد صاحب کے زمانہ کا دارالعلوم

مولانا گیلانی کا تاثر دارالعلوم کے سلسلے میں جو ۱۳۲۱ھ میں انھوں نے ظاہر کیا ہے وہ اس لائق ہے کہ اسے پڑھا جائے، اور تاریخ میں وہ محفوظ بھی کر دیا جائے۔ لکھتے ہیں:

"الغرض دارالعلوم کے گوشہ گوشہ میں زندگی کی ہلچل اور سرگرمیوں کا یہ نظارہ میرے لئے ایک نیا نظارہ تھا، ——— اب اچانک دارالعلوم کے احاطہ میں پہونچ کر۔ بارہ سو طلبہ کے مجمع میں شریک ہو جانا اور طلبہ بھی کسی ایک صوبہ؛ بلکہ ایک ملک کے بھی نہیں، ان میں جہاں یوپی، بہار کے طلبہ تھے جن سے فقیر مانوس تھا یا مانوس

ہو سکتا تھا، وہیں بڑی تعداد بنگال اور پنجاب و سرحد کے طلبہ کی بھی تھی، انھیں میں اچھی خاصی تعداد کابل، بخارا، سمرقند، کاشغر سمرقند وسط ایشیار کے باشندوں کی بھی تھی، اور کبھی کبھی اس جھمیلے میں عرب اور حبش اور عراق سے آئے ہوئے طالب العلموں پر بھی نظر پڑ جاتی تھی؛ یہی نہیں بلکہ پہلی دفعہ دارالعلوم کی مسجد کی اذان کان میں آئی، تو موذن کی آواز کی غیر معمولی بلندی اور کرختگی کو محسوس کر کے پوچھا کہ یہ اذان کس نے دی، معلوم ہوا کہ یہ شرقی یورپ قازان (روس) کے رہنے والے مولوی محمد جان ہیں، اور نماز بھی جن امام صاحب نے پڑھائی پتہ چلا کہ یہ صاحب مولوی حرمت اللہ اسی قازان کے باشندے ہیں، دیر تک سوچتا رہا کہ یورپ ہم پر چھا گیا اور چھاتا چلا ہی جا رہا ہے، کہ دیوبند کی مسجد کی اذان و امامت پر بھی یورپ والوں کا ہی قبضہ ہے، ان میں مولوی محمد جان بڑے دیو ہیکل۔ ڈیل ڈول کے آدمی تھے، سینہ غیر معمولی طور پر چوڑا تھا ——— ان کی اذان کی بلندی کی توجیہ بھی سمجھ میں آگئی، کہ اس شخص کے پھیپھڑے میں ہوا کا غیر معمولی ذخیرہ بھرا رہتا ہے ——— الغرض میرے دل و دماغ کے لئے کالے، پیلے، سرخ و سفید، رنگ رنگ کے طلبہ کی یہ بھیڑ بھی حیرت انگیز تھی، دیر تک کسی مرکزی مقام پر کھڑے ہو کر میں ان طالب علموں کو آتے جاتے، دوڑتے، بھاگتے ہوئے، دیکھتا رہتا، اور دل میں کہتا کہ بارِ الٰہا! میں کہاں آگیا ہوں، زیادہ سے زیادہ اب تک دس بیس تیس طالب علموں کے حلقوں میں

رہنے سہنے، پڑھنے، لکھنے کا موقع ملا تھا، ان میں اپنی حیثیت کے مطابق امتیاز کی صورت بھی نکل آئی تھی، لیکن اس طوفان میں معلوم ہوتا تھا کہ میں ڈوب جاؤں گا۔ پتہ بھی نہ چلے گا کہ کون ہوں کہاں ہوں۔" (رسالہ دارالعلوم ربیع الاول ۱۳۷۱ھ ص۴۳)

دلکش منظر یہ پہلا ہفتہ مولانا گیلانی کے لئے حیرت و استعجاب کا موجب بنا ہوا تھا، بھیڑ سے تو متأثر تھے ہی، مگر جب مطبخ سے کھانا تقسیم ہوتے ہوئے دیکھا، اور نماز میں طلبہ کو شریک دیکھا، تو ان کی حیرت میں اور بھی اضافہ ہوا، اس وقت کی نماز باجماعت کا نقشہ مولانا نے اس طرح کھینچا ہے۔

"پھر یہ ہلچل پانچوں وقت کی نمازوں میں مسجد کی طرف سمٹ کر میرے لئے حیرت انگیز عجوبۂ روزگار بنے ہوئے تھے،" میں نے اب تک کسی مسجد میں اتنی طویل طویل صفوں کی پنجوقتہ نماز نہیں دیکھی تھی لمبے لمبے کرتوں اور سیدھے سادے لباس میں پانچوں وقت خالق کے سامنے ایک دفعہ سجدہ ریز سروں کا یہ منظر میرے لئے بالکل نیا تھا۔" (ایضاً ربیع الاول ۱۳۷۱ھ ص۴۴)

اکابر و اسلاف دارالعلوم مولانا چونکہ ٹونک سے پڑھ کر آئے تھے، جہاں دارالعلوم کے اکابر و اسلاف کے ناموں کا چرچا تقریباً نہ ہونے کے درجے میں تھا، یہاں اس ماحول میں سارے نام ایسے کانوں میں پڑ رہے تھے، جن سے آپ کے کان قطعاً ناآشنا تھے، چنانچہ مولانا نے اس کا تذکرہ بھی کیا ہے، رقمطراز ہیں:

"دوسری طرف کان میں نئے نئے ناموں کا ایک سلسلہ تھا، جو یکے بعد دیگرے مسلسل ٹکراتا چلا جاتا تھا، میرے کان اب تک اہل علم کے جن تذکروں سے بھرے تھے اور دل کو جن کی عظمتوں سے لبریز کر دیا گیا

تھا، وہ دارالعلوم کے احاطہ کی ان نئی آوازوں سے کُلّیۃً مختلف تھا جہاں بیٹھتے، جدھر جاتے، ہر مجلس، ہر حجرہ اور حجروں کے در و دیوار سے حضرت نانوتوی مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ، حضرت گنگوہی مولانا رشید احمد رح، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رح، مولانا اشرف علی تھانوی رح، مولانا عبد الرحیم رائے پوری رح کے چرچوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ان چرچوں کو تو صرف سنتا تھا اور انہی کے ساتھ کچھ گرامی اسمار ایسے بھی تھے، کہ اسمار کے ساتھ خود ان کے مسمّٰی پر بھی دُور سے نظر پڑ جاتی تھی۔ یہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رح حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رح، مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رح، حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ، مولانا شبیر احمد صاحب رحمہم اللہ اجمعین کی مبارک اور قدسی ہستیاں تھیں، ان کے رہنے سہنے، بولنے چالنے، ان کی عادتوں، ان کی نیکیوں ان کی ظرافتوں، ان کی قربانیوں، ان کی للّٰہیت، اخلاص و صداقت ان کی کرامتوں اور سب سے زیادہ ان میں ہر ایک کی علمی خصوصیتوں کے سوا ——— سچ پوچھئے تو اس پہلے ہفتہ میں میرے کان نے شاید ہی کوئی اور بات سنی ہو۔"

(رسالہ دارالعلوم دیوبند۔ ربیع الاول ۱۳۷۱ھ ص۴۵)

دارالعلوم کا انتظام دارالعلوم کے نظم و انتظام کا بھی مولانا نے تذکرہ کیا ہے کہ [illegible] سال پہلے کیا انداز تھا۔ ان میں کھانا، روشنی کا انتظام، کتابوں کی لین دین ساری چیزیں آتی ہیں، لکھتے ہیں:

"سب سے پہلی چیز جس سے میرا دل متأثر ہو رہا تھا، وہ دارالعلوم کا

عجیب وغریب نظم تھا، ہزار بارہ سو طلبہ کے لئے دونوں وقت کے پکے پکائے کھانے کا انتظام، اور زیادہ تر بغیر کسی معاوضہ کے اس کھانے کی تقسیم، پھر —— دیکھا کہ ہر طالب علم خالص سرسوں کا تیل کافی مقدار میں اپنے ساتھ لا رہا ہے، یہ کیا ہے؟ جواب دیا گیا کہ اصولاً مٹی کے تیل کی روشنی میں مطالعہ کو دارالعلوم کے اربابِ بست وکشاد پسند نہیں کرتے، اور روشنی کے لئے ہر مہینہ میں ہر طالب علم کو سرسوں کا تیل ملتا ہے —— الغرض ہر روز ایک نئی بات کا علم اور نیا نظارہ نگاہوں کے سامنے پیش ہوتا —— کھانا بھی مفت، مکان بھی مفت، مکان کا فرش بھی مفت، روشنی بھی مفت یہ سب کچھ انہی لوٹے پھوٹے مسلمانوں کے پیسے سے انجام دیا جا رہا ہے، جن کی بلند ہمتوں کی شہادت دارالعلوم کے احاطہ کی فلک سپہر نما عمارتیں ادا کر رہی تھیں۔"

(رسالہ دارالعلوم ربیع الاول ۱۳۷۱ھ صفحہ ۴۶)

طلبہ میں کتابوں کی تقسیم مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو یہاں آنے کے بعد ایک فکر یہ دامن گیر ہوئی، کہ دورۂ حدیث میں دس موٹی ضخیم کتابیں کس طرح خریدوں گا، اور نہ خریدوں تو پھر اسباق کی شرکت کی کیا صورت ہوگی؟ پہلے دل ہی دل میں سوچتے رہے، پھر اپنے رفیقِ کمرہ سے معلوم کیا کہ بھئی کچھ کتابیں کہیں سے عاریۃً ملیں گی بھی یا ساری خریدنا ہی ہوں گی؟ سوال کے بعد جواب:-

"معلوم یہ ہوا کہ ان سارے طالب علموں کے لئے نیچے سے اوپر تک ہر کلاس کے لئے مدرسہ ہی نصابی کتابوں کا بھی نظم کرتا ہے، ہر وہ کتاب جو مدرسہ میں پڑھائی جاتی ہے اس کا ایک مستقل الگ کتبخانہ ہے،

چھوٹی ہو یا بڑی، الغرض کافیہ سے لے کر بخاری تک ہر کتاب کے بے شمار نسخے ہیں، مدرسہ جب کھلتا ہے تو نصابی کتابوں کے اسی کتب خانہ سے پڑھنے کے لئے طالب علموں کو عاریۃً کتابیں تقسیم کر دی جاتی ہیں، اور اختتامِ سال پر پھر طلبہ ان کتابوں کو واپس کر دیتے ہیں —— اس پر معلوم ہوا کہ ہر سال ہزارہا روپے صرف ہوتے ہیں، جس حال میں طلبہ کتابوں کو لیتے ہیں باوجود شدید تاکید کے اسی حال میں واپس نہیں کرتے، جلدیں ٹوٹ جاتی ہیں اوراق پھٹ جاتے ہیں، ان کی درستگی اور اصلاح کے لئے ہر سال کافی رقم جلد بندوں اور داغ دوزوں کو مدرسہ ادا کرتا ہے۔ اسی کیساتھ ہر سال بہت ساری کتابیں خستہ ہو کر دریدہ ہوتی ہیں اور ناقابلِ استفادہ ہو جاتی ہیں، لہٰذا سالانہ ایک اچھا خاصا بجٹ خریداریِ کتب کا بنتا ہے اور خریداری پر صرف ہوتا ہے۔" (ایضاً ص ۴۶، ۴۷)

جاڑے کے سامان چند مہینوں کے بعد مولانا لکھتے ہیں کہ جاڑا آگیا، دیکھا طلبہ کو اس کا سامان بھی ملنے لگا، مولانا کے الفاظ اس سلسلے میں یہ ہیں:-

"چند دنوں کے بعد سرما کا موسم آگیا طالب علموں کے بدن پر خاص قسم کی روئی بھری ہوئی اچکنیں نظر آنے لگیں جس کی نوعیت ایک ہی جیسی تھی، یہ کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ اس سے پہلے بھی طلبہ جو لباس پہنے ہوئے تھے ان میں عموماً دارالعلوم کے ہی عطا کئے ہوئے جوڑے تھے، اور اب موسم سرما میں جو چاہتے ہیں ان کو یہ روئی بھری اچکن اور ایک لحاف، شاید توشک بھی مدرسہ عطا کرتا ہے، میرے لئے مدرسہ کا یہ نظام ذہنی انقلاب کا پیغام بنتا جا رہا تھا۔" (ایضاً ص ۴۷)

بیمار طلبہ کے لئے دوائیں مولانا کا بیان ہے کہ ہر تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کوئی نہ کوئی نیا انکشاف ہوتا تھا، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"کسی بیمار طالب علم پر نظر پڑی معلوم ہوا دوا بھی مدرسہ ہی کی طرف سے مفت ملے گی، بغیر کسی فیس مدرسہ کے طبیب اس کا معائنہ بھی کرتے ہیں نسخہ بھی لکھتے ہیں ـــــــ بلکہ ہر مریض طالب علم کو طبیب کی ہدایت کے مطابق جس قسم کے پرہیزی کھانے کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی مدرسہ ہی کی طرف سے مہیا کیا جاتا ہے، جو چیز سنائی جاتی تھی مشاہدہ سے اس کی تصدیق بھی ہوتی چلی جاتی تھی۔"

(ایضاً ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ ص ۴۱)

مولانا نے بیتے ہوئے دن میں لکھا ہے کہ دارالعلوم کے نظم وضبط اور اس کی ہمہ گیریوں کا ایک دل چسپ نمونہ سامنے آگیا ہے۔"

دارالعلوم کی عمارتیں عمارتوں کے سلسلے میں مولانا نے لکھا ہے:۔

"میری نظر پھر مدرسہ کی عمارتوں پر پڑتی ایک احاطہ کے بعد دوسرا احاطہ، دوسرے کے بعد تیسرا احاطہ، شمال و جنوب میں پھیلا ہوا تھا، ہر احاطہ کے بیچ وسیع صحن اور چاروں طرف برآمدے کے ساتھ کمرے اور حجرے، جن میں طلبہ بھرے ہوئے تھے تعمیرات کا سلسلہ جاری تھا۔" (ایضاً ص ۴۲)

دارالعلوم کا یہ سارا مستحکم نظام دیکھ کر مولانا حیرت زدہ تھے، کہ وہ کیا دیکھ رہے ہیں، اور علماء کے ہاتھوں اس قدر ٹھوس نظام کتنا عمدہ چل رہا ہے

ایک لطیفہ یہاں مولانا کا ایک لطیفہ بھی قابلِ ذکر ہے، لکھا ہے کہ سردی کے موسم میں لحاف کی تقسیم میں طلبہ کے ذوق کے مطابق کچھ تاخیر محسوس ہوئی،

مولانا نے اس کے لئے ایک اشتہار کا مضمون تیار کر دیا، کہ بلا نام رات میں جب سو جائیں اسے موٹے حروف میں لکھ کر صدر دروازہ پر کوئی چپکا دے، تھوڑی تفریح رہے گی، اشتہار کا مضمون ملاحظہ ہو ؎

شبِ سرما، وبیمِ موت، افلاسے چنیں طاری
کجا دانند حال ما، خداوندانِ توشکہا

"جار البرد مع الجبات" مشہور عربی کی مثل تھی، لیکن ہمارے لئے جار البرد مع الاموات کی مثال صادق آرہی ہے۔"

بس کیا تھا اس کا چرچا عام ہو گیا طلبہ نے خوب مزے لے لے کر پڑھا، اور ایک دوسرے کو سناتے رہے۔

یہ تو ایک توارد طالبِ علم کے تأثرات تھے، جو اُس نے ۱۳۲۱ھ کے شوال میں دیکھ کر ظاہر کئے مگر اب اللہ اللہ کر کے داخلہ کے امتحان کا وقت آگیا اور سب سے ہٹ کر ساری توجہ اسی طرف ہو گئی، کہ دیکھئے مقدر کیا دکھاتا ہے عزت رہتی ہے یا جاتی ہے۔

ضابطہ کا داخلہ مولانا گیلانی رح نے اب تک جو کچھ دیکھا، ایک اجنبی طالب العلم کی حیثیت سے دیکھا، اور دارالعلوم کے ایک ایک انتظام کو دیکھ کر ان پر حیرت و استعجاب کی کیفیت طاری ہوئی، مگر اصل مقصد تو یہاں باضابطہ داخل ہو کر حدیث پڑھنا تھا، مدرسہ کے ضابطے کے اعتبار سے تمام ضابطوں کی خانہ پُری کرنی تھی، امتحان داخلہ دینا تھا، اور ممتحن جو فیصلہ کرے اس کے مطابق عمل پیرا ہونا فرائض میں داخل تھا۔

امتحانِ داخلہ جب تک ان مراحل سے طالب العلم نہیں گذر جاتا، ـــ دارالعلوم کا باضابطہ طالب العلم شمار نہیں ہوتا، خواہ کتنے ہی سال گذار دے

مولانا گیلانیؒ کو بھی یہ مراحل طے کرنے تھے، فارم کی خانہ پُری کر چکے تھے، اب انتظار تھا کہ امتحان کس استاذ کے پاس جاتا ہے، اتفاق دیکھیے، صدر المدرسین شیخ الہندؒ کے بعد جن کے علم و فضل کا زیادہ چرچا تھا، مولانا کا امتحان ان کے یہاں گیا، یعنی محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے پاس امتحان دینا تھا، اگر انھوں نے کامیاب کر دیا تو دورۂ حدیث میں داخلہ ہو سکے گا ورنہ نہیں یہ وقت ہر نئے آنے والے کے لئے بڑا ہی صبر آزما اور نازک ہوتا ہے، اچھے اچھے طلبہ امید و بیم کی کشمکش سے دوچار ہوتے ہیں۔

حضرت کشمیری کی خدمت میں

حضرت شاہ صاحب کشمیریؒ داخلہ امتحان کتب خانہ میں بیٹھکر لیا کرتے تھے، چپراسی طالب العلم کا نام لے کر پکارتا تھا — مولانا گیلانیؒ بھی آگرھڑے ہو گئے، چنانچہ جب ان کی باری آئی چپراسی نے مناظر احسن گیلانی نام لے کر آواز دی، جیسا کہ قاعدہ ہے، نیا طالب العلم ہزار قابل سہی — مگر امتحان کے نام سے خوف زدہ ہو جاتا ہے، امتحان کا نام ہی کچھ ایسا ہے کہ قابل سے قابل طالب العلم ایک مرتبہ کانپ جاتا ہے، مولانا بھی بہرحال طالب العلم تھے ہانپتے کانپتے کتب خانہ پہونچے، وہاں کیا دیکھا، اور کیا پیش آیا، خود مولانا ہی کی زبانِ قلم سے سُنیے، لکھتے ہیں:-

"غالباً چھوٹی سی دستی میز پر کتاب تھی، یہ میر زاہد رسالہ تھا، شاہ صاحب نے کتاب کھولی، وہ کتاب کھول رہے تھے اور میرے جسم پر رعشہ طاری تھا، پیشانی پسینہ سے شرابور، کانپ رہا تھا، دیکھئے کہاں سے پوچھتے ہیں؟ کیا پوچھتے ہیں؟ — خیال آتا ہے کہ یتحقق کل فرد منہ بعد تحقق الموصوف کے الفاظ سے العلم متجدد کی تعریف میر زاہد نے جو کی ہے، دریافت فرمایا گیا کہ اس عبارت کا

مطلب بیان کرو — یہ وہی مقام تھا جس کے مالہٗ و ما علیہ کے پڑھنے میں تقریباً ایک مہینہ ٹونک کی درس گاہ میں صرف ہو چکا تھا میر زاہد کا منہیہ، غلام یحییٰ کے حواشی، عبد العلی بحر العلوم العلامہ کے اضافے، مولوی عبد الحق خیرآبادی نے اپنے حاشیہ میں ان سب پر جو کچھ لکھا تھا اور خود استاذِ مرحوم کا ذاتی حاشیہ اس مقام پر جو تھا، سب ہی گھونٹے ہوئے پیے ہوئے تھا، لیکن جواب تو وہ دے جو اپنے آپ میں موجود بھی ہو، ایک ہفتہ دار العلوم کے احاطہ میں جو گذرا تھا حضرت شاہ صاحبؒ کے فضائل و کمالات علمی تبحر اور غیر معمولی معلومات و مخزونات کے ذکر سے دل اس حد تک مرعوب ہو چکا تھا، کہ جس وقت پوچھا گیا "مطلب بیان کرو" ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کبوتر شاہین کے پنجہ میں آگیا ہے، نہ ہوش ہی باقی تھا، اور نہ حواس، کچھ یاد نہیں کہ بدحواسی کے عالم میں مُنہ سے کیا اُول فُول، بے تکی باتیں بے ساختہ نکلیں، ایک دو سوال ہی کے بعد کتاب بند ہو گئی، اور اجازت اٹھ جانے کی فرمائی گئی، جس وقت اٹھا اس یقین کے ساتھ اٹھا کہ دار العلوم سے روانگی کا انتظام کر لینا چاہیے۔" (رسالہ دار العلوم ربیع الثانی ۱۳۷۱ھ)

داخلہ امتحان میں کامیابی

یہ ایک واقعہ ہے کہ بوقت امتحان آدمی کھو سا جاتا ہے اسے خبر نہیں ہوتی کہ کیا کہہ رہا ہے، کہتا چلا جاتا ہے، پھر یہ بھی ذہن میں آتا ہے کہ غالباً میں نے جواب جیسا دینا چاہیے نہ دے سکا، اور اس تصور کے بعد کہ اگر فیل ہو گیا تو کیا ہوگا؟ طرح طرح کے خیالات ستانے لگتے ہیں، مولانا گیلانی پر بھی یہی کیفیت طاری رہی، اور اس وقت تک چین نہیں آیا، جب تک اپنے وطنی بھائی منظر حسن سے

یہ خبر نہیں سن لی کہ تم کامیاب ہو، اور تمہارے جواب کی تعریف ہو رہی ہے۔

امتحان میں کامیابی کے بعد دورۂ حدیث میں نام درج ہوگیا، ۲۰۔۲۱ شوال ۱۳۳۱ھ سے درس شروع ہونے کا اعلان ہوگیا، کتابیں جہاں اور طالب العلموں کو کتب خانہ سے ملیں، مولانا گیلانی کو بھی مل گئیں، اس سال دورۂ حدیث میں طلبہ کی تعداد باسٹھ تھی جیسا کہ اس سال کی روداد سے معلوم ہوتا ہے، اور اس جماعت میں ہر صوبہ کے طلبہ تھے، بلکہ بہت سے غیر ملکی طلبہ بھی تھے، جیسے کابل، قندھار، بخارا چینی ترکستان، کاشغر اور دوسرے ممالک کے۔

دورہ کا پہلا سبق | مولانا کی یاد کے مطابق دورہ کا پہلا سبق ۲۱ شوال ۱۳۳۱ھ کو حضرت علامہ کشمیریؒ کے یہاں مسلم شریف کا شروع ہوا پہلے دن حضرت کشمیریؒ نے کتاب پڑھانے کے بجائے علم حدیث کی اہمیت اور اسکی اصطلاحات پر تقریر فرمائی، تقریر اردو زبان میں کی، مسلم شریف کے جو کتب حدیث میں مقام ہے، اسپر روشنی ڈالی، مولانا کا بیان ہے کہ حضرت الاستاذ کی تقریر بڑی ہی دلآویز مگر دلچسپ اور معلومات سے لبریز تھی، سبق سے فارغ ہوکر جب کمرہ پہنچا تو اس کو قلم بند کرنے کا عزم ہوا، اور جو کچھ فرمایا تھا بجائے اردو کے عربی میں لکھ لیا، اور اس وقت آپ کو احساس ہوا کہ عربی میں اردو سے ڈھالنے کی صلاحیت ان میں پائی جاتی ہے۔

پہلے بھی وہ اپنے استاذ کی تقریر ٹونک میں نقل کرنے کے عادی تھے مگر عموماً اُردو میں نقل کرنے کے عادی تھے یہاں عربی میں نقل کرنا شروع کیا۔

حضرت کشمیری کی درسی تقریر | مولانا گیلانیؒ کی تحریر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم میں اس زمانہ تک حضرت کشمیریؒ کی تقریر قلم بند کرنے کا ابھی رواج شروع نہیں ہوا تھا، کیوں کہ انھوں نے لکھا ہے۔

"جہاں تک جانتا ہوں حضرت الامام الکشمیریؒ کی تقریروں کے قلم بند کرنے کا ارادہ شاید اس فقیر سے پہلے کسی صاحب نے نہیں کیا تھا۔" (رسالہ دارالعلوم جمادی الثانی [illegible])

مولانا نے دوسرے دن سے باضابطہ درس گاہ میں تقریر نقل کرنیکا انتظام کیا، اور التزام کے ساتھ سال بھر شاہ صاحب کی تقریر قلم بند کرتے رہے، بعد میں تو پھر بہت سارے تلامذہ نے حضرت شاہ صاحبؒ کی درسی تقریریں قلمبند کیں، اور مرتب کرکے کتابی شکل میں شائع بھی کیں، جیسے، العرف الشذی، فیض الباری، انوار المحمود وغیرہ

حضرت کشمیری کے درس کی اہمیت | شاہ صاحبؒ کی درسی تقریر کے سلسلہ میں مولانا نے لکھا ہے

"واقعہ یہ ہے کہ باتوں باتوں میں صرف حدیث ہی نہیں بلکہ دوسرے علوم کے ایسے اہم کلیات ان کے درس میں ہاتھ آجاتے تھے کہ اپنے ذاتی مطالعہ سے شاید ساری عمر ان تک ہم جیسے نارساؤں کی رسائی آسان نہ تھی"

(رسالہ دارالعلوم جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ صـ ۳۶)

حضرت شاہ صاحبؒ کی درسی تقریر پر مولانا گیلانی اپنے مشاہدات تفصیل سے لکھ چکے ہیں اور وہ تقریر "حیاتِ انور" نامی مجموعہ میں شائع بھی ہو چکی ہے اسے ضرور دیکھنا چاہیے، تاکہ اندازہ ہو کہ حضرت شاہ صاحبؒ کا درس کس مرتبہ کا ہوا کرتا تھا یہاں طوالت کے خوف سے اس کا اقتباس نہیں دیا جا رہا ہے۔

خاص امور کا تذکرہ | اس سلسلہ میں ایک خاص بات یہ بھی لکھی ہے۔

"وہ اپنے عہد کے طلبہ کی علمی بے بضاعتیوں کا اندازہ کرکے تکلیف اٹھا کر علاوہ موضوعِ درس کے چند خاص امور کا تذکرہ التزاماً اپنے درس میں ضرور فرمایا کرتے تھے، مثلاً جن مصنفین کی کتابوں کا حوالہ دیتے تھے، ان کی ولادت، وفات کی سنین کے ساتھ مختصر حالات اور ان کی علمی خصوصیت، علم میں ان کا خاص مقام کیا ہے، ان امور پر ضرور تنبیہ کرتے چلے جاتے۔" (ایضاً جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ صـ ۴۲)

طلبہ میں علمی ذوق | حضرت کشمیریؒ کی اس طرح کی تقریر کا بڑا فائدہ یہ تھا کہ شاگردوں میں

علمی ذوق پیدا ہو جاتا تھا اور وہ اثنائے درس میں ساری کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام اور ان کی خصوصیتوں سے واقف ہو جاتے تھے، ساتھ ہی شوق ہوتا تھا کہ فلاں کتاب کی یہ اہمیت ہے کہیں سے حاصل کر کے دیکھی جائے، اس طرح ان میں مطالعہ کتب کا ذوق وشوق، نشوونما پاتا تھا اور تحقیق کی شان پیدا ہونے لگتی تھی۔

مولانا گیلانی کو ابتدائے طالب العلمی سے مطالعہ کتب کا شوق تھا۔ پہلے معقولات کی کتابیں پڑھا کرتے تھے، اور کبھی ہاتھ آ گئی تو چھپ چھپا کر اردو کتابیں بھی پڑھ لیتے تھے، اب سارا ذوق اور تمام تر محنت دینیات اور حدیث و تفسیر پر صرف کرتے تھے، اور کوئی شبہ نہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی تقریروں نے علمی جذبات کو جلا بخشی تھی جو قدرت نے آپ کی فطرت میں ودیعت کر رکھی تھی، اس سلسلہ میں مولانا مرحوم نے خود لکھا ہے۔

"یہ ان کا ایسا اچھا طریقہ تھا کہ جس کی بدولت شوقین اور محنتی طلبہ ان کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر علم کے ذیلی ساز و سامان سے مسلح ہو جاتے تھے۔" (ایضاً)

معقولات اور منقولات کا مقابلہ دار العلوم آنے سے پہلے مولانا گیلانیؒ کا خاص موضوع منطق و فلسفہ تھا، مگر حضرت کشمیریؒ کے درس میں کبھی کبھی ایسی تقریر بھی ہو جاتی تھی کہ فلسفہ و منطق کا وزن ذہن سے ختم ہونے لگتا تھا، بقول مولانا گیلانیؒ

"ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نادان بچوں سے زیادہ ان کے سامنے بڑے بڑے فلاسفہ کی وقعت نہیں۔" (ایضاً)

اعقل الناس مولانا لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے تھے۔

"میرے نزدیک اعقل الناس فی الناس اہل لغت یا زبانوں کے

بنانے والے ہیں، جو کائنات کے ایک ایک ذرّہ کی خصوصیت پر نظر جما کر الگ الگ الفاظ بناتے ہیں، زبان و لغت والوں کے بعد فقہاء کی تعریف کرتے، اور ان کے علمی رسوخ کی داد دیتے۔" (ایضاً)

اساتذہ دار العلوم کی درسی تقریریں مولانا گیلانیؒ کے مستقبل کو سنوارنے والی تھیں، چنانچہ اسی زمانہ درس حدیث میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ مولانا مرحوم بڑی کشمکش ذہنی میں مبتلا ہو گئے، مگر حضرت شیخ الہندؒ کی توجہ خاص نے اس کشمکش سے نکالا، اور جان بچی، اور ہمیشہ کے لئے ایسی شاہ راہ سامنے آ گئی جس پر تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھتے چلے گئے، اور بالآخر منزل مقصود پالی۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا گیلانیؒ کو اپنے استاذ مکرم حضرت شیخ الہندؒ سے بے حد عقیدت و محبت تھی، بعد فراغت سب سے پہلے آپ نے شیخ الہندؒ کے دست مبارک پر بیعت کی، اور آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔

دورۂ حدیث کے سال شکوک وشبہات کا حملہ

دیو بند آنے سے پہلے مولانا سات آٹھ سال مدرسہ خلیلیہ ٹونک میں پڑھ چکے تھے، اور یہ پوری زندگی یونانی منطق وفلسفہ کے پڑھنے میں صرف کی تھی جس کی تفصیل گذر چکی، یونانی فلسفہ ومنطق اور کتاب وسنت میں جو بعد ہے وہ کسی اہلِ علم سے مخفی نہیں، کیوں کہ فلسفہ ومنطق کا تعلق معقولات سے ہے اور کتاب وسنت کا منقولات سے، اس لئے مولانا گیلانیؒ جب دورۂ حدیث میں داخل ہوئے، تو اسکے ساتھ معقولات نے ذہن وفکر کے سامنے وساوس اور اعتراضات کا ایک انبار لگانا شروع کردیا، اور اس نے قدرتی طور پر آپ کو ایک ایسی کشمکش میں مبتلا کردیا جس سے ایک نوجوان طالب علم کا گھبراجانا قرین قیاس تھا۔

چنانچہ دارالعلوم دیو بند آکر جب دورۂ حدیث میں مولانا شریک ہوچکے، تو ابتدار میں ایک بڑا ہی نازک، صبر آزما اور کٹھن وقت آیا، ذہنی وفکری ایک ایسی کشمکش میں مبتلا ہوئے کہ مولانا گیلانی کے ہوش وحواس گم ہونے لگے۔

گندے وساوس کی آمد | اس کی تفصیل خود مولانا کے قلم سے سنئے، لکھتے ہیں:۔

"ہونے یہ لگا کہ جوں ہی حدیث شروع ہوتی اپنے ذہن میں، الجھنوں کے طوفان کو پاتا، طرح طرح کے شبہات ہر حدیث میں ہوتے، یہ شبہات طالب علمانہ اور مولویانہ نہ تھے، بلکہ مصیبت یہ تھی کہ عموماً ذاتِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہی سے العیاذ باللہ ان خبیث اور گندے وساوس اور خیالات کا عموماً تعلق ہوتا.....

بدگمانیوں کی ایک آگ تھی، جو معلوم ہوتا تھا میرے باطن میں بھڑک اٹھی ہے دو گھنٹے تک عموماً ترمذی شریف کا یہ درس ہوتا تھا، اور ایک سیاہ سینہ ان دونوں گھنٹوں کے اندر انہی شکوک وشبہات کے آتشیں لہروں میں جلتا بھنتا رہتا، حدیث میرے لئے گویا بدگمانی وسوءِ ظن کا چقماق بنتی چلی جاتی تھی، دماغ صرف ہرزہ اندیشیوں اور یاوہ بافیوں کا کارخانہ بنا ہوا تھا۔"

(رسالہ دارالعلوم ربیع الاول ۱۳۷۲ھ ص۳۰)

مولانا کا اندرونی حال | مولانا لکھتے ہیں کہ ان فاسد خیالات سے اس طرح پریشان تھا کہ ہر نماز میں دعار کرتا،

"پروردگار، یہ کیا حال ہے، میں دین کو درست کرنے کے لئے دارالعلوم حاضر ہوا تھا، لیکن بچا کھچا جو سرمایہ بھی دین وایمان کا تھا میرا لٹا جارہا ہے، میں تو کہیں کا نہ تھا۔" (ایضاً ص۳۱)

مولانا لکھتے ہیں کہ کبھی کبھی یہ بھی سوچتا کہ دارالعلوم کو چھوڑ دوں تاکہ ان خیالاتِ فاسدہ سے نجات ملے، مگر ایسا کرنا بھی آسان نہ تھا، حال یہ ہوگیا تھا کہ

"گھبرا گھبرا کر کبھی تن تنہا جنگلوں اور کھیتوں کی طرف نکل جاتا، غلطاں وپیچاں انہی خیالات وساوس میں ٹہلتا رہتا، باتیں ایسی تھیں کہ کسی سے ذکر کرکے دل کی بھڑاس بھی نہیں نکال سکتا گویا ایک اندرونی آگ لگی ہوئی تھی، جسمیں کروٹیں لیتا رہتا، خفقان اور دورے کی شدت روز بروز بڑھتی ہی چلی جاتی تھی۔" (ایضاً)

اسی حال میں بقرعید آگئی، ان وساوس کے علاج کی ہی غرض سے مولانا نے کلیر، منگلور، وغیرہ کا سفر کیا، اور بزرگوں کے مزار پر پہنچ کر دعائیں کیں کہ ان گندے

خیالات کی آمد بند ہو، مگر کوئی فائدہ نظر نہیں آیا۔

شیخ الہندؒ کی خدمت میں حاضری

اتفاق سے مناظرہ کے راستے میر شاہ خان صاحب کو مولانا گیلانی سے اُنس ہوگیا تھا، ایک دن وہ مولانا سے پوچھنے لگے کہ تم نے کہاں کہاں پڑھا ہے؟ مولانا کہتے ہیں کہ میں نے تفصیل بتائی، پھر ایک دن انہی سے میں نے کہا کہ خیالاتِ فاسدہ اس اس طرح کے ذہن میں رہتے ہیں کہ جن سے بہت پریشان رہتا ہوں، انھوں نے مشورہ دیا کہ شیخ الہندؒ سے مل کر عرض کرو، پھر وہی شیخ الہندؒ تک جانے اور پہونچنے کے وسیلہ بھی بنے۔

پہلی ملاقات میں حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا گیلانی سے فرمایا کہ تم تو درس حدیث میں رہتے ہو، جس کا مطلب یہ تھا کہ شیخ الہندؒ کی نظر اپنے اس شاگرد پر تھی تنہائی میں اپنا دردِ دل عرض کرنے اور سنانے کی درخواست کی، حضرت شیخ الہند اندر کمرہ میں اٹھ کر تشریف لے گئے، وہاں مولانا گیلانیؒ نے اپنے ان خیالاتِ فاسدہ اور وساوس کی تفصیل سنائی، دیر تک سُناتے رہے، حضرت نے سُنکر ارشاد فرمایا:۔

”مولوی صاحب! اتنے پریشان کیوں ہیں، اپنا یہ حال جب آپ کے لئے اتنا ناگوار ہے تو یہ بے ایمانی کی نہیں، آپ کے ایمان کی دلیل ہے، ایمان نہ ہوتا تو ان خیالات سے اتنے پریشان ہی کیوں ہوتے۔؟“ (ایضاً ص۳۲)

شیخ الہندؒ کے ارشاد کی تاثیر

حضرت شیخ الہندؒ کے ان چند جملوں نے مرہم کا کام کیا، ایسا محسوس ہوا کہ زخم کی ٹیس میں دفعۃً بہت کمی آگئی، درد و کرب اور بے چینی جاتی رہی، یہ گفتگو چل ہی رہی تھی کہ سوال فرمایا کہ آپ نے کہاں کہاں اور کیا پڑھا ہے؟ مولانا مرحوم نے رودادِ تعلیم کہہ سنائی، یہ سُنکر ارشاد ہوا:۔

”جو کچھ آپ کچا پکا نگلتے چلے گئے ہیں، وہی سب کچھ باہر نکل رہی ہیں پریشان ہونے کی بات نہیں، مولوی صاحب جاؤ اب کوئی شبہ اور کسی قسم کا شک تم کو نہ ہوگا۔“ (ایضاً ص۳۳)

حضرت الاستاذ کی طرف سے تسکین وتسلی کے یہ جملے مولانا کی زندگی کے لئے اکسیر ثابت ہوئے، ذہن وفکر کا معاملہ دگرگوں ہوگیا، اب نہ وہ وسوسے تھے اور نہ شکوک وشبہات، جو جھنجوڑ دیا کرتے تھے، حدیث کے اسباق میں جی لگنے لگا، بشاشت اور توجہ کے ساتھ بیٹھتے، جہاں کچھ علمی اشکال ہوتا، پوچھتے، اور استاذ محترم جواب دیتے۔

حالات میں تبدیلی

مولانا کا بیان ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی اس ملاقات اور ارشادات کے بعد ایسا محسوس ہونے لگا کہ سات سال تک ہم نے منطق وفلسفہ جو کچھ پڑھا تھا اس سے وحشت ہوتی جارہی ہے، اور معقولات کا پیدا کردہ کبر وغرور پامال ہو رہا ہے، لکھتے ہیں:۔

”یہ تبدیلیاں اتنی سُرعت اور تیزی کے ساتھ اثر انداز ہو رہی تھیں کہ چند ہی دنوں کے بعد تجربہ نے ثابت کیا کہ میرے پاس جو کچھ تھا شاید وہ سب کچھ چھن گیا، جن شخصی خصوصیتوں کے ساتھ دارالعلوم کے احاطہ میں داخل ہوا تھا نہ وہی باقی تھیں اور نہ وہ شخصیت۔“

(ایضاً ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ)

معقولات سے وحشت کا تجربہ

اس کا تجربہ مولانا کو اس طرح ہوا کہ اس کے تھوڑے دنوں بعد مولانا کے ساتھیوں میں سے چند ذہین معقولات کے ساتھ مناسبت رکھنے والوں نے کہا کہ وہ ان کو میر زاہد رسالہ پڑھا دیں، اور اس انداز سے جس طرح وہ ٹونک سے پڑھ کر آئے ہیں، مولانا تیار ہوگئے، مگر جونہی اس کے مطالعہ کا ارادہ

کیا۔ لرزہ سا طاری ہونے لگا، دل دھڑکنے لگا، مگر آن کی بات تھی، دل مضبوط کر کے کتاب ہاتھ میں لی اور دیکھنے لگے کہ چند منٹ کے اندر نیند غالب آگئی، خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ جنگلی سوروں نے گھیر رکھا ہے اور حملہ آور ہیں' خوف جب بڑھ گیا تو ایک درخت پر چڑھ گئے کہ جان بچے، مگر ان جنگلی سوروں نے اس درخت کو گھیرے میں لے لیا اور منھ اٹھا اٹھا کر آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں' اتنے میں دیکھا کہ کہیں سے ایک آدمی آگیا، اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی بندوق ہے اور وہ ان سوروں پر فائرنگ کرنے لگا، کچھ سور مرے، گرے، پھر سب بھاگنے لگے درخت ہی پر دل میں یہ خیال ڈالا گیا کہ بندوق چلانے والے حضرتِ مدنیؒ ہیں۔ اتنے میں آنکھیں کھل گئیں۔ خوف طاری تھا ہی، کہ یہ کیا پیش آیا۔ اب عزم کر لیا کہ ساتھیوں سے معذرت کر دینا ہے کہ پڑھانا میرے بس میں نہیں ہے، معاف کر دیں۔

شیخ الہندؒ کی کرامت مولانا گیلانیؒ فرماتے ہیں کہ شیخ الہندؒ کی کرامت تھی جس نے میری دست گیری کی، وہ جو فرمایا تھا۔ "جاؤ مولوی صاحب اب کوئی شک پیدا نہیں ہوگا"

"یہ یا اسی کے ہم معنی الفاظ تھے جو آج سے تقریباً چالیس سال پہلے (دورۂ حدیث کے سال) اللہ کے ایک برگزیدہ دوست کی زبانِ مبارک سے یہ بات نکلی، خاکسار، اس کا دماغ، اس کا دل، اسکی زندہ شہادت ہے کہ اس طویل عرصہ میں، بحمداللہ! پھر کسی قرآنی آیت یا کسی نصِ نبوی میں کسی قسم کا کوئی شبہ اب تک تو پیدا نہیں ہوا.... اس لئے سیدنا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ایک زندہ کرامت خود اپنے آپ کو، دل و دماغ کو، اپنے ذہنی رجحانات و میلانات کو سمجھتا ہوں، میں کیا تھا اور کیا ہو گیا"

(رسالہ دارالعلوم ربیع الاول ۱۳۷۲ھ ص ۴۲)

مولانا یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس کے بعد اگر کوئی ایسی ویسی چیز سامنے آتی ہے، تو ساتھ ہی اس کا حل اور اس کے متعدد جوابات بھی ذہن میں مچلنے لگتے ہیں اور یقین ہوتا ہے کہ اس اشکال کے جوابات میرے پاس موجود ہیں۔

"گویا کہ کوئی کیل ٹھونک دی گئی کہ وہی دل جو لرزاں اور تپاں رہتا تھا، کچھ ایسا بیٹھ گیا کہ خواہ کچھ بھی گذرے وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا"

(ایضاً)

شیخ الہندؒ کی عظمت شیخ الہندؒ استاذ الکل کی حیثیت رکھتے تھے، درس گاہ میں مختصر اور جامع تقریر فرماتے تھے، مگر عظمت کا حال یہ تھا کہ جس دن بخاری شریف کا پہلا سبق اس سال پڑھایا، دارالعلوم کے تمام اساتذہ بھی طلبہ کے ساتھ شریک ہوئے، خود مولانا کشمیریؒ بھی شریکِ درس ہوئے، ان اساتذہ نے درس میں سوالات بھی کئے، اور شیخ الہندؒ نے ان کے جوابات بھی دیئے۔

جہاں درس اس شان کا ہو سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کے درس سے کیسے کیسے باکمال پیدا ہوتے ہوں گے، اور دنیا کو علم و عمل سے اس ادارہ نے کس طرح بھر دیا ہوگا، مولانا گیلانی اسی دولتِ بے بہا کے ایک نمونہ تھے، نور اللہ مرقدہٗ۔

تحریری ذوق کی حوصلہ افزائی اس کے بعد شیخ الہندؒ مولانا گیلانیؒ پر بڑے مہربان ہو گئے تھے، اور برابر خبر گیری کرنے لگے، اور حتی الوسع حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے۔ ایک دن بلا کر فرمایا:

"مولوی صاحب! میں نے سنا ہے کہ لکھنے پڑھنے کا تم خاص ذوق رکھتے ہو، مدرسہ کی طرف سے القاسم رسالہ نکلتا ہے، اس میں مضمون کیوں نہیں لکھتے۔؟" (دارالعلوم جمادی الاول ۱۳۷۲ھ)

جس تلمیذِ رشید کے وساوس و اوہام کو اپنی توجہِ خاص سے دور فرمایا تھا، اور

حدیث نبویؐ سے مناسبت پیدا کرادی تھی، اب استاذِ محترم نے چاہا کہ وہ آگے چل کر مصنّف و مؤلف بھی بنے، علم و فن کی قلمی خدمت بھی اس کے حصّہ میں آئے، اور آئندہ جس ماحول سے دوچار ہونے والا ہے، ابھی سے وہ اسکی تیاری بھی شروع کردے، تاکہ روشن خیالوں کو اپنی تحریر و تقریر دونوں سے اسلام کا شیدائی بنانے میں کسی سے پیچھے نہ رہنے پائے۔

مولانا گیلانی کا بیان ہے کہ حضرت الاستاذ کے ان جملوں کو سن کر حیرت زدہ رہ گیا، کہ اب تک نہ میرا کوئی مضمون کسی اخبار یا رسالہ میں چھپا، نہ کوئی کتاب شائع ہوئی، نہ کوئی مقالہ پڑھ کر میں نے حضرت کو سنایا، آخر حضرت کو میرے اس پوشیدہ ذوق کی اطلاع کیسے ہوئی، نورِ معرفت کے سوا اس کو دوسرا نام کیا دیا جاسکتا ہے۔

مضمون لکھنے کا عزم مولانا کو ان حوصلہ افزا کلمات سے بڑی دلی مسرت ہوئی امنگ و ولولہ نے کروٹ لی اور طے کرلیا کہ کوئی مضمون شروع کرنا ہے اور القاسم کو اشاعت کے لئے دینا ہے۔

مولانا نے ہمت کرکے قلم اٹھالیا اور دورہ کے سال اپنا پہلا مضمون لکھنا شروع کردیا، اور اس کا عنوان تھا "خیر الامم کا طغرائے امتیاز" جو رسالہ القاسم دیوبند میں کئی قسطوں میں شائع ہوا، اور یہی مضمون مستقبل کے لئے روشنی کا مینار ثابت ہوا۔

قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی ہونہار، ذی استعداد اور ذہین و ذکی طالبُ العلم ہوتا ہے، تو سارے اساتذہ کو اس سے محبت پیدا ہوجاتی ہے، اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ جوہر ضائع نہ ہونے پائے، مولانا گیلانی میں یہ بات پائی جاتی تھی، اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اساتذہ آپ سے محبت و شفقت کا معاملہ کرتے تھے۔

مولانا گیلانی کے اساتذۂ حدیث اس سے پہلے گذر چکا کہ دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کا امتحان محدث العصر حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ (م ۱۳۵۲ھ)

نے لیا، اور کامیابی کے نمبرات دئے، سب سے پہلا سبق اس سال دورۂ حدیث کا حضرت شاہ صاحبؒ کے یہاں ہوا، آپ کے پاس مسلم شریف کا سبق تھا، اور وہ پوری کتاب آپ کے یہاں ہوتی رہی۔

بخاری شریف کا سبق صدر المدرسین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن عثمانی (م ۱۳۳۹ھ) نے شروع کرایا، اور سال بھر وہ کتاب آپ ہی پڑھاتے رہے۔ اس طرح حدیث کی یہ دو اہم کتابیں ان دونوں بزرگوں کے یہاں ہوئیں، اس زمانہ میں ترمذی شریف بھی حضرت شیخ الہندؒ کے پاس ہوتی تھی، اور آپ ہی اسے پڑھاتے تھے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی حدیث کی چوتھی اہم کتاب ابوداؤد شریف تھی، اس سال یہ کتاب دارالعلوم دیوبند کے مشہور استاذ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی م ۱۳۶۹ھ نے شروع فرمائی، مولانا گیلانی نے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ ان کا درس بھی معرکۃ الآراء ہوتا تھا، اور انداز بیان بڑا ہی دلکش اور معلومات افزاء ہوتا تھا، یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کے اساتذہ میں سب سے کم عمر حضرت مولانا عثمانیؒ رہی تھے۔

"زندگی میں جن بزرگوں کے تلمذ کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے، سب سے زیادہ نوعمر استاذ مولانا عثمانی قدس سرہٗ تھے... حدیث کی اہم ترین کتاب ابوداؤد کا درس ان سے متعلق تھا۔" (رسالہ دارالعلوم رجب ۱۳۷۲ھ)

حضرت مولانا عثمانیؒ کے درس کے سلسلہ میں مولانا گیلانی کا تاثر یہ ہے۔

"ان کے بولنے کا طرز حد سے زیادہ سنجیدہ، خطاب کا طریقہ غیر معمولی طور پر دل آویز تھا، چند کلمات کے بعد محسوس ہونے لگتا کہ کچھ نئی باتیں کان میں پڑ رہی ہیں جو حضرت عثمانی سے پہلے میں نے نہ کسی سے سنی تھیں نہ کتاب یا مضمون میں اُن کا سُراغ لگا تھا،

درس کا یہ حصہ میرے لئے حد سے زیادہ دلچسپ اور لذیذ ثابت ہوا مولانا جس طریقے سے ان چیزوں کو ادا کرتے تھے ان میں بڑی حلاوت اور شیرینی تھی۔" (ایضاً رجب ۱۳۶۲ھ ص ۳۹)

قاسمی علوم سے مولانا عثمانی رحؒ کی مناسبت

حضرت مولانا عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو بانی دارالعلوم حضرت نانوتوی کی تصنیفات سے بڑی مناسبت تھی، اور جب وہ ان تصنیف کے مضامین کو اپنے انداز میں ڈھالتے تھے، تو سننے والے پر ایک خاص کیف طاری ہوتا تھا، اس میں شبہ نہیں کہ قاسمی علوم و معارف پر مولانا عثمانی کو عبور حاصل تھا تعبیر و تفہیم کے اندر مولانا عثمانی رحؒ اپنے دور میں علماء کے طبقہ میں بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

اس کے اثرات تلامذہ پر بھی ہوتے تھے، دیدہ ریزی، اور عقلی دلائل کا انکی تقریر سے طلبہ میں عمدہ سلیقہ پیدا ہوتا تھا، اور اس کے اثرات بلاشبہ حضرت مولانا گیلانی رحؒ میں بھی آئے، بقول مولانا گیلانی مرحوم حضرت عثمانی رحؒ کی باتیں،

"ایسی دل نشیں تھیں اور کچھ ایسے منطقی تسلسل کے ساتھ مولانا بیان کرتے تھے کہ ان کو نوٹ کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ فرماتے جاتے تھے اور حافظہ میں خود بخود ان کی جگہ بنتی جاتی تھی"

(ایضاً)

مولانا عثمانی کی توجہ خاص

مولانا گیلانی کی محنت اور ذکاوت سے جہاں آپ کے دوسرے اساتذۂ کرام متاثر تھے، وہاں مولانا عثمانی رحؒ بھی دورۂ حدیث کے طلبہ میں آپ کو ممتاز شمار کرتے تھے، اور جن چند مخصوص طلبہ کو آپ نے ہونہار ہونے کی حیثیت سے منتخب کیا تھا ان میں ایک آپ کا بھی نام تھا، ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک دن مولانا احسان اللہ تاجور نے آکر اطلاع دی کہ حضرت مولانا عثمانی رحؒ نے تم کو یاد فرمایا

ہے، چنانچہ میں صبح کے وقت حضرت الاستاذ کی خدمت میں حاضر ہو گیا، مولانا گیلانی لکھتے ہیں :۔

"میں حیران تھا کہ کسی قسم کا کوئی تعارف نہیں، پھر انھوں نے اتنی خصوصیت کے ساتھ خاکسار کو کیوں یاد فرمایا ہے؟ —— دوسرے دن تاجور مرحوم سے مولانا کے درِ دولت کا پتہ دریافت کر کے غالباً کسی ملنے والے طالب العلم کی رہنمائی میں خدمتِ والا میں حاضر ہوا، سلام کر کے بیٹھ گیا، خود ہی فرمانے لگے کہ دورہ کی سبق میں آتے ہو، پھر فرمایا۔

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی سے آدمی کو محبت ہو تو اس کو مطلع کر دے، اس لئے میں نے آپ کو طلب کیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کے مطابق آپ کو مطلع کر دوں کہ اپنے دل میں آپ کی محبت پاتا ہوں۔" (ایضاً)

مولانا عثمانی کا نظریہ

مولانا گیلانی کا بیان ہے کہ مولانا عثمانی کی درسی تقریریں مہینوں چلتی رہیں کبھی کبھی مکان پر دو تین ذہین) طلبہ جو محنتی سمجھے جاتے تھے خصوصی طور پر مولانا کے یہاں جاتے رہتے تھے، ایک دفعہ حضرت مولانا عثمانی کی طبیعت ناساز چل رہی تھی مولانا گیلانی لکھتے ہیں کہ میں اور ایک دوسرے دورہ ہی کے طالبِ علم جب مولانا کی خدمت میں عیادت کے لئے پہنچے، تو دیکھا لیٹے ہوئے ہیں، —— ان دونوں شاگردوں کو دیکھ کر اٹھ بیٹھے اور فرمانے لگے۔

"یہ کیا طریقہ ہے کہ پست و بلند کس و ناکس ہر قسم کے طالب علموں کو دورہ میں شرکت کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ صرف ذہین دو چار طالب العلموں کو ہی پڑھاؤں گا۔

تاکہ کیفاً کچھ ذی استعداد علماء تیار ہو سکیں، حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا نظریہ بھی یہی تھا کہ تعلیم کی اشاعت، کمّاً اور کیفاً دونوں طرح ہونی چاہئے کمّاً کا طریقہ تو وہی ہے جو ہمارے مدارس میں رائج ہے، علماء بڑی تعداد میں تیار ہوں، اور ملک و بیرونِ ملک میں پھیلیں، لیکن کیفاً یعنی اچھے علماء پیدا کرنے کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں کہ ذہین و ذکی اور محنتی طلبہ کو الگ لے کر بیٹھا جائے، یہ بھی فرمایا کہ خود حضرت نانوتوی رح مدرسہ میں بیٹھ کر نہیں پڑھایا کرتے تھے، بلکہ اپنے چند اچھے طلبہ منتخب کر کے اس کی تربیت و تعلیم پر توجہ فرمایا کرتے تھے، حضرت شیخ الہند رح، مولانا احمد حسن امروہی رح اور مولانا فخر الحسن گنگوہی رح وغیرہ اسی طرح پیدا ہوئے۔" (رسالہ دار العلوم رجب ۱۳۸۲ھ)

مولانا گیلانی کا امتیاز | مجھے یہ بتانا ہے کہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے دورۂ حدیث کے طلبہ میں جن دو تین کا انتخاب فرمایا تھا ان میں ایک مولانا گیلانی بھی تھے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا گیلانی اپنی طالب علمی میں دار العلوم کے اندر بھی اپنے تمام اساتذہ کی نظروں میں کتنے ممتاز شمار ہوتے تھے، اور ان سے کیسی امیدیں وابستہ تھیں، اس زمانہ میں فتح الملہم کا ابتدائی کام مولانا عثمانی رح نے شروع کر دیا تھا، اس میں بحیثیت شاگرد مولانا گیلانی سے بھی کبھی کبھی کام لیا کرتے تھے۔"

حکمتِ قاسمی | حکمتِ قاسمی سے مناسبت کے سلسلے میں مولانا گیلانی رح نے صراحت کی ہے۔

"حکمتِ قاسمی سے صرف روشناس ہونے کا ہی موقع مولانا کے ذریعہ نہیں ملا، بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ باضابطہ علم کے اس شعبہ کی تعلیم مولانا ہی سے فقیر کو میسر آئی۔ اس باب میں میرے بلاشرکتِ غیرے واحد معلم اور استاذ وہی ہیں۔" (ایضاً ص ۴۱)

مفتی اعظم عزیز الرحمن عثمانی | دار العلوم کے اساتذۂ حدیث میں عارف باللہ مفتی اعظم حضرت مولانا عزیز الرحمن عثمانی (م ۱۳۴۷ھ) بھی تھے، آپ کے یہاں اس سال دورۂ حدیث میں مؤطا امام محمد اور مؤطا امام مالک کے اسباق تھے، ان کتابوں کے اسباق ہفتہ میں صرف ایک دن ہوا کرتے تھے، مولانا گیلانی رح لکھتے ہیں کہ چونکہ حدیث کے ہی اسباق ہفتہ بھر ہوتے رہتے تھے، اس لئے مفتی صاحب رح کے اسباق میں جانا کم ہوتا تھا، خود تحریر فرماتے ہیں:-

"اس کا تعلق مفتی صاحب رح سے تھا ہفتہ میں ایک دن بطور دورہ کے ان کتابوں کا سبق ہوتا تھا، یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ان کے درس میں حاضری کی سعادت سے کلیۃً محروم رہا، لیکن جس قسم کے فوائد ان کے انفاسِ طیبہ سے حاصل ہو سکتے تھے، عمر بھر افسوس رہے گا کہ اس کی طرف توجہ کیوں نہیں ہوئی؟"

(رسالہ دار العلوم رمضان ۱۳۷۲ھ ص ۴۵)

مولانا غلام رسول صاحب | ابنِ ماجہ حضرت مولانا غلام رسول صاحب رح (م ۱۳۳۰ھ) پڑھاتے تھے، یہ کتاب بھی مستقل پڑھائی نہیں جاتی تھی، خارج اوقات میں تبرکاً کچھ حصہ پڑھا دیا جاتا تھا، یہ معقولی مشہور تھے، مولانا گیلانی رح لکھتے ہیں:-

"اسی وجہ سے اُن کے اسباق میں بھی حاضری کے مواقع کم ہی میسر آتے تھے۔" (ایضاً)

حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رح | جس سال مولانا گیلانی کا دورہ تھا، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کچھ مہینوں کے بعد تدریسی خدمت سے دستکش ہو کر گھر بیٹھ گئے تھے، کچھ دنوں تو ان کے گھر جا کر طلبہ ابوداؤد پڑھتے رہے، پھر یہ سبق حضرت مولانا میاں صاحب اصغر حسین رح (م ۱۳۶۴ھ) کے یہاں منتقل ہو گیا، اور ابوداؤد

کے اسباق ان کے یہاں ہونے لگے، میاں صاحب عام طور پر طویل تقریر نہیں فرماتے تھے، بلکہ بقدرِ ضرورت بولتے تھے، البتہ جہاں ضرورت ہوتی تھی، مفصل تقریر فرماتے تھے۔ دورہ کے سال دو مزید کتابیں آپ نے اور پڑھیں ـــــ سراجی مولانا گل محمد خان (م ۱۳۵۵ھ) سے پڑھی اور ہدایہ آخرین مولانا حکیم محمد حسن صاحب (م ۱۳۴۵ھ) سے۔

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح نسائی شریف اس سال حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نے پڑھائی، آپ کا قیام اس زمانہ میں مدینہ منورہ میں تھا، اتفاق سے تشریف لے آئے، نسائی ان کے یہاں کردی گئی تھی، ایک طرف طلبہ کو نسائی پڑھاتے تھے اور دوسری طرف بخاری شریف کے درس میں باضابطہ شیخ الہند رح کے یہاں شریک ہوتے تھے، اور عبارت خوانی کی ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی استاذ شاگرد میں سوال و جواب بھی ہوتا تھا، مولانا گیلانی نے نسائی حضرت مدنی رح سے ہی پڑھی، خود لکھتے ہیں:

> "گویا بخاری کے سبق میں رفاقت کا اور نسائی میں تلمذ کا، ان دوگونہ نسبتوں کا شرف حضرت مدنی رح کی ذاتِ گرامی سے بحمد اللہ اس ذرہ ناچیز کو حاصل ہوا۔" (دارالعلوم جمادی الاول ۱۳۷۲ھ)

یہ بھی لکھا ہے:

> زندگی میں یہی پہلا موقع تھا اور آخری موقع بھی کہ براہِ راست عربی زبان میں مطالب کی تقریریں اپنے استاذ سے سنیں، حضرت مدنی مدینہ کی مسجد میں بزبان عربی درس دینے کے عادی تھے یہاں بھی حسبِ عادت جو کچھ فرماتے فصیح عربی زبان میں فرماتے۔" (ایضاً)

طالب علمی کے تین دور ماحصل یہ ہے کہ مولانا گیلانی کی طالبِ علمانہ زندگی کے تین دور ہوئے، پہلا دور گیلانی میں گذرا، جہاں آپ نے ناظرہ قرآن، اردو، فارسی اور ابتدائی

عربی کی کتابیں پڑھیں، وہاں کے اساتذہ میں صرف مولانا کے محترم چچا مولانا حکیم سید ابوالنصر کا نام بحیثیت استاذ آیا ہے، ممکن ہے کوئی اور بھی رہا ہو، مگر ان کا نام کہیں نہیں مل سکا۔

دوسرا دور طالبِ علمی کا ٹونک میں گذرا، اور یہ سب سے لمبا زمانہ تھا، وہاں آپ نے معقولات میں ایساغوجی سے لے کر شرح اشارات اور شفار تک پڑھی، اور اسی کے ساتھ فقہ اور اصولِ فقہ، عربی ادب، ریاضی، فلسفہ، ہیئت کا پورا نصاب ختم کیا، وہاں کے اساتذہ میں معقولات کے استاذ حضرت مولانا حکیم سید برکات احمد صاحب تھے اور فنون کے استاذ حضرت مولانا محمد اشرف صاحب تھے۔

تیسرا دور طالب علمی کا دارالعلوم دیوبند میں گذرا، یہاں آپ نے صرف ایک سال رہ کر علمِ حدیث کی تکمیل کی، اس دور کے اساتذہ میں استاذ العلماء شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانی رح، محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رح، شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رح، عارف باللہ حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین صاحب رح، عارف باللہ حضرت مفتی عزیز الرحمن صاحب عثمانی رح، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رح، حضرت مولانا غلام رسول صاحب رح، حضرت مولانا گل محمد خان صاحب رح اور مولانا حکیم احمد حسن صاحب برادر شیخ الہند رح۔

شوال ۱۳۳۱ھ میں دیوبند آکر دارالعلوم میں داخل ہوئے، اور شعبان ۱۳۳۲ھ میں سالانہ امتحان دے کر فراغت حاصل کی، یہاں پہونچ کر طالب العلمی کا رسمی دور ختم ہوگیا۔

سالانہ نتیجہ ۱۳۳۲ھ کی روداد میں جہاں دورۂ حدیث کے کامیاب طلبہ کے نام درج ہیں، آپ کا نام تیسرے نمبر پر درج ہے، دورۂ حدیث میں دس کتابوں کا امتحان ہوا کرتا ہے، ان کتابوں میں صرف مؤطا امام محمد میں آپ کا نمبر کم آیا ہے، جس کے

متعلق مولانا گیلانی نے لکھا ہے کہ جب حضرت الاستاذ مولانا غلام رسولؒ سے تذکرہ آیا تو فرمایا، اسباق میں نہ آنے کا نتیجہ ہے، مولانا کے الفاظ یہ ہیں:

"خدمت میں حاضر ہوکر عرض رسا ہوا...... اس وقت برہم ہوکر فرمانے لگے کہ سبق سے اور غائب رہا کرو۔"

اس سنہ کی روداد سے یہاں ہر کتاب کا نمبر درج کیا جاتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند میں اعلیٰ نمبر پچاس ہے۔ گویا جو حیثیت سرکاری مدارس میں سَو نمبر کو حاصل ہے، وہی دیوبند میں پچاس نمبر کو دیا گیا ہے، آپ کے سالانہ امتحان کے نمبرات یہ ہیں۔

بخاری شریف	مسلم شریف	ابوداؤد شریف	
۵۱	۵۱	۵۰	
ابن ماجہ شریف	نسائی شریف	شمائل ترمذی	
۵۰	۵۰	۵۰	
ترمذی شریف	موطا امام مالک	طحاوی	موطا امام محمد
۴۹	۴۸	۴۵	۳۹

اس طرح آپ اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہوئے اور فرسٹ ڈویژن میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ مجموعی نمبر (۵۰۰) میں آپ نے (۴۸۳) نمبرات حاصل کئے۔

اساتذہ واکابر کی کرم فرمائیاں

مولانا گیلانی محنتی بھی تھے اور ذہین بھی اور اسی کے ساتھ ذی استعداد اور باادب بھی، پھر آپ کی تربیت ایسے گھرانہ میں ہوئی تھی جو صرف تعلیم یافتہ ہی نہیں تھا، بلکہ مہذب، متمدن اور ساتھ ہی عالموں کا خاندان تھا، اس لئے قدرتًا اس کے اثرات پورے طور پر آپ میں پائے جاتے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ دورِ طالب العلمی میں جہاں رہے، اساتذہ واکابر کے لئے وجہِ افتخار بن کر رہے اور اساتذہ نے عزت بخشی۔

مقبولیت دارالعلوم دیوبند میں جب آئے تو حضرت علامہ کشمیریؒ نے آپ کا امتحانِ داخلہ لیا، اچھی استعداد پاکر چند جملے فرما دیئے، بس اسی وقت سے آپکی استعداد کی تعریف ہونے لگی پھر جب فاسد خیالات اور شکوک وشبہات کا زور ہوا، اور آپ کو اپنے دین وایمان کی فکر دامن گیر ہوئی، تو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانیؒ نے باطنی توجہ ڈالی، اور آپ کے دل کی دنیا بدل ڈالی، اس کے بعد بھی شیخ الہندؒ نے برابر آپ پر نظرِ کرم رکھی، جس کی قدرے تفصیل گذر چکی۔

اہتمام کی طرف سے قدردانی فراغت کے بعد ٹونک اور حیدرآباد قسمت آزمائی کے لئے پہنچے کہ مسلمانی ریاستوں میں شاید کوئی مناسب حال جگہ مل جائے، اور تمام سے گھوم پھر کر پھر دارالعلوم کا قصد کیا، جس کی تفصیل آگے آرہی ہے، اس وقت حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے خوش آمدید کہا، اور بغیر کسی سفارش کے دارالعلوم کے علمی کاموں میں لگالیا، اور آپ نے تدریس، تبلیغ اور تحریر تینوں خدمات یہاں انجام دیں

مولانا شبیر احمد عثمانی کی توجہ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے آپ کی طالب علمی کے زمانہ میں جب دارالعلوم سے علیحدگی اختیار کرلی تو دوسرے ذہین طلبہ کے ساتھ آپ کو بھی اپنے گھر بلاکر ابوداؤد کا سبق خصوصی طور پر پڑھاتے رہے، اور آپ کی ذات سے اپنی محبت واخلاص کا اظہار فرمایا اور آپ کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

حضرت کشمیریؒ کی سفارش جس زمانہ میں دارالعلوم میں آپ کو معین المدرسین کی صف میں رکھا گیا، اور القاسم والرشید کے مضامین کی ترتیب وتزئین آپ کے سپرد ہوئی، تو اس وقت کے صدرالمدرسین حضرت کشمیریؒ نے ان لفظوں میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ نائب مہتمم سے آپ کی سفارش فرمائی۔

"آپ کے یہاں جو درس کا کام کرتے ہیں' وہ تحریر کا کام نہیں کرتے، یا نہیں کرسکتے' جو تحریری سلیقہ رکھتے ہیں، اُن سے آپ تقریر ووعظ کا کام نہیں لے سکتے، الغرض ان تینوں شعبوں میں یعنی درس، تحریر وتقریر کے لئے اسی وجہ سے آپ کو الگ الگ آدمی رکھنے پڑتے ہیں، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اس غریب (مناظر احسن) سے رسالہ کی ادارت اور تحریر کا کام بھی آپ لیتے ہیں، درس وتدریس کا کام بھی اس کے سپرد کرتے رہے جہاں کہیں سے طلبی آئی وعظ وتقریر کے لئے بھی بھیجتے رہے۔ گویا تینوں شعبوں کا کام حسب دلخواہ وہ تنہا انجام دیتا رہا اب اگر ان تینوں مدوں کے سلسلہ میں ایک ایک آدمی کی تنخواہ اُسے دی جائے، تو شاید اس کا یہ ناجائز مطالبہ نہ ہوگا۔"

(رسالہ دارالعلوم محرم ۱۳۷۲ھ)

نائب مہتمم حضرت مولانا عثمانیؒ نے اعتراف کیا اور مولانا گیلانی سے فرمایا۔

"بھائی مولانا انور شاہ صاحبؒ تم (مناظر احسن) سے تو غیر معمولی طور پر متأثر نظر آتے ہیں۔" (ایضاً)

حضرت کشمیریؒ کی محبت جس زمانہ میں حیدرآباد مولانا گیلانی کو خبر پہونچائی گئی کہ حضرت شاہ صاحبؒ تم سے ناراض ہیں، ٹھیک اسی زمانہ میں حضرت کشمیریؒ نے اپنے دستخطِ خاص سے ایک رجسٹرڈ خط لکھا، جس کے متعلق مولانا کا بیان ہے۔

"پڑھتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا، اللہ اللہ سنانے والے مجھے کیا کیا سناتے رہے، اور آنکھیں، آج کیا دیکھ رہی ہیں، مودّت ومحبت سرفرازی، اور محبتِ بے کراں کے سوا اور کچھ نہ تھا، ایک خاص خدمت کے لئے اس ذرّہ ناچیز کا انتخاب فرمایا گیا تھا الخ۔"

(رسالہ دارالعلوم محرم ۱۳۷۲ھ ص ۳۹)

حضرت مفتی صاحبؒ سے تأثر بلا اختلاف حضرت مفتی عزیزالرحمٰن صاحب ولی کامل سمجھے جاتے تھے، بہت سادہ مزاج تھے، مولانا گیلانی لکھتے ہیں کہ نماز پڑھنے کبھی کبھی انکی مسجد میں بھی چلا جایا کرتا تھا، تاکہ ان کے پیچھے نماز پڑھنے کی سعادت حصہ میں آئے، اس زمانہ میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ صاحب پر صوفیانہ مشاغل کا غلبہ تھا، وہ اس زمانہ میں حضرت مفتی صاحبؒ کی مسجد میں چلہ کش تھے حضرت مفتی صاحبؒ حافظِ قرآن بھی تھے، تراویح اس (چھوٹی مسجد) میں خود سناتے تھے مولانا گیلانی مرحوم بھی ایک دن تراویح پڑھنے وہاں چلے گئے، نماز میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، جس سے مولانا مرحوم بہت متأثر ہوئے، اس کی تفصیل خود مولانا کے قلم سے سُنیئے:۔

"مفتی صاحب قبلہ حسبِ دستور وہی اپنی نرم سُبک رَو آواز میں قرآن پڑھتے چلے جاتے تھے، اسی سلسلہ میں قرآنی آیت دَبَرُوْا

لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَہَّارِ، پر پہونچے، نہیں کہہ سکتا کہ خود مفتی صاحب کس حال میں تھے، کان میں قرآن کے یہ الفاظ پہونچے اور کچھ ایسا معلوم ہوا کہ کائنات کا سارا حجاب سامنے سے اچانک ہٹ گیا، اور انسانیت کھل کر اپنے وجود کے آخری سرچشمے کے سامنے کھڑی ہے، گویا جو کچھ قرآن میں کہا گیا، محسوس ہوا کہ وہی آنکھوں کے سامنے ہے، مولانا شبیر احمد سے تو بے ساختہ چیخ نکل پڑی، سب پر یہی کیفیت طاری تھی، چیخ و پکار کا ہنگامہ برپا تھا، لیکن مفتی صاحب کو وہ وقار بنے ہوئے امام کی جگہ کھڑے تھے، جدید کیفیت جو ان پر تھی، وہ صرف یہی تھی کہ خلاف دستور بار بار اسی آیت کو مسلسل دہراتے چلے جاتے تھے، صفیں درہم برہم ہو گئیں، کوئی ادھر گرا تھا، کوئی اُدھر پڑا تھا، آہ، آہ کی آواز مولانا شبیر احمد کی زبان سے نکل رہی تھی، صف میں ایک طرف وہ بھی پڑے تھے، کچھ دیر بعد لوگ اپنے آپ میں واپس ہوئے، مفتی صاحب اپنی جگہ کھڑے اسی آیت کو پڑھتے رہے، جب دوبارہ صف بندی ہوتی تب پھر آگے بڑھے۔ (رسالہ دار العلوم شوال ۱۳۷۲ھ ص ۴۲)

مولانا گیلانی نے درست لکھا ہے کہ "کتابی و درسی تعلیم کے سوا دار العلوم کا سارا ماحول اس زمانہ میں اسباق ہی اسباق تھا" حضرت مفتی صاحب عارف باللہ تھے روزانہ اوابین میں آٹھ پارے قرآن پڑھتے تھے، اور آپ کی بہت ساری کرامتیں مشہور تھیں اس واقعۂ خاص سے مولانا گیلانی کے قلب پر گہرا اثر پڑا، کہنا چاہئے مولانا گیلانی میں دل کی صفائی، جاذبیت اور تعلق مع اللہ میں دیوبند کے اساتذۂ و اکابر کی توجہ کا بڑا دخل تھا، مواد خاندانی تھا، اساتذۂ دار العلوم کی نگاہوں نے

اُسے کندن بنا دیا۔

مولانا حافظ احمد صاحبؒ سے تأثر اسی طرح جس زمانہ میں مولانا دار العلوم میں معین المدرسین کی حیثیت سے رہتے تھے، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ مہتمم دار العلوم دیوبند کے ایک نجی واقعہ سے مولانا گیلانی کافی متاثر ہوئے۔ اور خاندان قاسمی کی عظمت دل میں پیوست ہو گئی۔ یہ واقعہ بھی مولانا ہی کے قلم سے سنئے، لکھتے ہیں:۔

"اللہ، اللہ، وہ کتنی کڑی اور سخت گھڑی تھی، جب حکومت قائمہ کی طرف سے حضرت مفتی محمد احمد صاحبؒ خلف صالح حضرت نانوتویؒ کے نام یہ فرمان مدرسہ آیا، کہ نہری علاقہ میں زمین کا ایک بڑا سر سبز شاداب رقبہ آپ کی خدمت میں حکومت پیش کرتی ہے، شاید سیکڑوں ہی ایکڑ یا بیگھے پر حکومت کا یہ موہوبہ رقبہ مشتمل تھا، مشورے کی اس مجلس میں جس میں حکومت کا یہ فرمان غور و خوض کیلئے پیش ہوا، اس فقیر کو بھی بلا کر شریک کر لیا تھا، قبول کیا جائے یا نہ قبول کیا جائے؟ اس پر دیر تک بحث ہوتی رہی... پشتہا پشت کی فراخ حالی کی ضمانت حکومت کے جس جاگیری عطیہ میں پوشیدہ تھی، ایک ٹھوکر میں وہ قدموں کے نیچے ڈالدی گئی۔ اور سیدنا الامام الکبیر مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلف صالح سے جس کی توقع کی جاسکتی تھی، وہی توقع پوری ہوئی، ادھر ہی ادھر سے حکومت کو جواب دے دیا گیا۔"

(رسالہ دار العلوم شوال ۱۳۷۲ھ)

مولانا لکھتے ہیں کہ مخصوص لوگوں کے سوا اس کی کسی کو کانوں کان خبر بھی ہونے

پائی، اپنے متعلق تحریر فرماتے ہیں:۔

فقیر اگر شوریٰ کی اس مجلس میں شریک نہ ہوتا، تو وہ بھی قطعاً اس سے ناواقف ہی رہتا۔ ...... اس محدود حلقہ کے سوا کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی"۔ (رسالہ دارالعلوم شوال ۱۳۷۲ھ)

مولانا خاندانِ قاسمی کے اس ایثار سے کافی متاثر ہوئے، اور اس سے بھی کہ اس کا چرچا قطعاً عوام میں نہ پھیلنے دیا، اور نہ ہونے دیا کہ مہتمم صاحبؒ نے دارالعلوم کی خاطر یہ ایثار کیا ہے، مولانا کے الفاظ ہیں:۔

"ایثار و قربانی کا اگر یہ واقعہ ان لوگوں میں پیش آتا جو خالق سے زیادہ مخلوق کی ستائشوں کے پیاسے ہیں، تو خدا ہی جانتا ہے کہ کس کس طرح سے اس کا چرچا نہ پھیلایا جاتا، لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں اس محدود حلقہ کے سوا جس میں اس مسئلہ کو پیش کر کے فیصلہ کیا گیا تھا، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی، کہ پیش کرنیوالوں کی طرف سے کیا پیش ہوا تھا، اور واپس کرنے والوں نے کس چیز کو واپس کیا، تَغَمَّدَهُمُ اللّٰهُ لِغُفْرَانِهٖ وَطَابَ ثَرَاهُمْ

(ایضاً)

دارالعلوم کے اکابر اور ذمہ داروں کی اس پاک وصاف زندگی کا مولانا پر بڑا اثر پڑا، اور خود مولانا گیلانی نے اپنی زندگی میں دولت کو کبھی کوئی وقعت نہیں دی، اور جہاں رہے مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کے نام کو بلند و بالا کیا، اور روشن و تابناک رکھا۔

اکابر کی نوازش اس زمانہ میں ایک واقعہ حضرت مولانا سید میاں اصغر حسین صاحبؒ کا پیش آیا۔ مولانا گیلانی ملازم اور دارالعلوم کے مدرس ہو جانے کے بعد بھی

طالب العلموں کی ہی طرح رہتے سہتے تھے، ایک دن ادھر سے حضرت میاں صاحبؒ کا گذر ہوا، دیکھا کمرہ میں کوئی چارپائی اور اچھا بستر نہیں ہے، پوچھا کس چیز پر سوتے ہو؟۔ مولانا نے عرض کیا، انہی چٹائیوں پر سو جاتا ہوں، اس قدر گفتگو کے بعد حضرت میاں صاحبؒ تشریف لے گئے، دوسرے وقت ایک آدمی پلنگ لیکر پہونچ گیا، کہ مولوی مناظر احسن کے لئے یہ میاں صاحبؒ نے پلنگ بھیجا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں' اس کا مجھ پر بے انتہا اثر پڑا، حالانکہ حضرت میاں صاحبؒ خود سادہ مزاج تھے' اور آپ کا رہن سہن بہت معمولی تھا، ان کے مکان پر دیکھا گیا کہ:۔

"مٹی کے ایک چبوترے پر بوریئے کا ایک مُصلّٰی پڑا ہوا ہے، سامنے مٹی کا ایک لوٹا ہے اور بان کی بنی ہوئی چند چارپائیوں کے سوا اور کچھ نہ ہوتا جن پر آنے والے آکر بیٹھتے"۔

(رسالہ دارالعلوم شوال ۱۳۷۲ھ ص ۴۵)

مگر اپنے ایک عزیز شاگرد کے لئے جو دارالعلوم ہی میں مدرس ہو چکا تھا، یہ پسند نہیں فرمایا کہ چٹائیوں پر پوری رات گذارے، بطورِ خود اپنے مکان سے اپنے آدمی کے ہاتھ پلنگ بھیجا، تاکہ وہ لکھ پڑھ کر جب تھک جائے تو پلنگ پر آرام کرے، اور عام طلبہ محسوس کریں کہ یہ طالبُ العلم نہیں، استاذ ہے، واقعہ ہے کہ پہلے کے اساتذہ کیا تھے، اپنے ہونہار شاگردوں کو حقیقی اولاد سے کسی طرح کم نہیں چاہتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

قیامِ دارالعُلوم کے زمانہ میں سیر و تفریح

دارالعلوم کے طلبہ کے لئے سیر و تفریح کی جگہیں عام طور پر اطراف کے کچھ مزارات اور قصبے ہیں، نیا طالبُ العلم ان کی شہرت سن کر وہاں جانے کی خواہش ظاہر کرتا ہے، اور جب کبھی کوئی چھٹی ہوتی ہے، ساتھیوں کی ٹولی بنا کر طلبہ نکل جاتے ہیں، آج کل تو ساری سہولتیں فراہم ہیں سڑکیں بھی پختہ بن گئیں، بسوں، ٹیکسیوں کا نظام بھی قائم ہوگیا، کرایہ پر سائیکلیں بھی مل جاتی ہیں، مگر مولانا گیلانی کی طالب العلمی کے زمانہ میں یہ سہولتیں حاصل نہ تھیں، کیوں کہ پچہتر سال پہلے ان ترقیوں کا تصور بھی نہ تھا، انگریزوں کی حکومت تھی، ملک غلام تھا، نئی ایجادوں کی فراوانی آج جیسی نہیں تھی، البتہ اُس زمانے میں امن و امان اور سکون و اطمینان آج سے زیادہ ضرور تھا، جان و مال کا کہیں کوئی خطرہ نہیں تھا، لوگوں میں دھوکہ دہی جھوٹ، سازش وغیرہ کا عام رواج نہیں ہوا تھا۔

دیو بند میں قیام کی مدت مولانا گیلانی نے شوال ۱۳۳۱ھ میں دیو بند میں آکر دورۂ حدیث میں داخلہ لیا تھا، سال بھر اس سلسلہ میں رہنا پڑا، فراغت کے بعد اِدھر اُدھر فکرِ معاش میں پھرتے رہے جس کی تفصیل اپنی جگہ آئے گی، پھر چھ سات مہینے کے بعد دیو بند آگئے، اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ دُور بین نے آپ کا انتخاب کرلیا، اور معین المدرسین اور رسالہ القاسم و الرشید کے مرتب کی حیثیت سے کام پر لگالیا، سال ڈیڑھ سال کم و بیش اس طرح بھی رہنا ہوا، اس طرح قیام کی کل مدت ڈھائی سال سے زیادہ نہیں ہوتی ہے، خود مولانا نے بھی لکھا ہے:۔

"دارالعلوم میں خاکسار کے قیام کی مدت دو ڈھائی سال سے زیادہ نہیں ہے"۔ (رسالہ دارالعلوم صفر ۱۳۷۳ھ ص ۳۹)

کلیر کی حاضری جس سال دورۂ حدیث میں داخل ہوئے اسی سال بقرعید کی چھٹی میں ۷/۸/ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ کو کلیر حاضری کا ارادہ فرمالیا۔ اور وہاں پہونچ گئے، یہاں حضرت علی احمد صابر رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے، جو سلسلۂ چشتیہ کے ایک مشہور و مقبول بزرگ ہیں، یہ مزار بڑی نہر کے کنارے، رڑکی سے کوئی پانچ چھ کیلومیٹر کی دوری پر واقع ہے، یہاں ہر زمانہ میں خواص و عوام دونوں فیوض و برکات حاصل کرنے کی غرض سے پہونچتے رہے ہیں، اب تو ماشاء اللہ کافی رونق آچکی ہے، وہاں بازار سا بن گیا ہے مگر آج سے ستر سال پہلے ویران سا رہا ہوگا، مزار اور مسجد کے سوا شاید ہی دو چار مکان وہاں ہوں گے۔

مولانا نے خود اپنا واقعہ بیتے ہوتے دن میں اس طرح لکھا ہے:۔

"خوب یاد ہے عید الاضحیٰ کی تعطیل مدرسہ (دارالعلوم) میں ہوئی اچانک خیال آیا، اس تعطیل سے فائدہ اٹھانا چاہیے، کلیر شریف آستانہ صابریؒ کی زیارت کے لئے روانہ ہوا، رُڑکی اسٹیشن سے اتر کر گٹھری بغل میں دبائے نہر کے کنارے کنارے بہتے ہوئے صاف و شفاف پانی کی دید سے لذت .... اندوز ہوتے کلیر شریف پہنچ گیا روضہ میں داخل ہوگیا، روضہ پر پہونچ کر حسبِ دستور فاتحہ خواں ہوا"

(رسالہ دارالعلوم ربیع الاول ۱۳۷۳ھ ص ۳۹)

سفر برائے اصلاحِ حال اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا یہ سفر بالکل یکہ و تنہا تھا، کوئی دوسرا ساتھی ساتھ نہ تھا، اور یہ بھی کہ رُڑکی سے کلیر تک پیدل گئے، اور اس زمانہ میں اس کے سوا دوسرا چارۂ کار بھی نہ رہا ہوگا، یہ وہی زمانہ تھا جس میں مولانا پر ایک

خاص حال طاری تھا، اور شکوک و شبہات نے گھیرے میں لے رکھا تھا، جو حضرت شیخ الہندرحؒ کی توجہِ خاص سے بعد میں ختم ہوا، کلیر بھی اسی خاص حال کی اصلاح کی غرض سے جانا ہوا تھا، فاتحہ خوانی سے فارغ ہو کر مسجد پہونچے اور وہاں تلاوت کلام اللہ میں مشغول ہو گئے، رُخ قبلہ کی طرف تھا، ایک آدمی آیا اور ڈانٹ پلانے لگا، کہ پُشت روضہ کی طرف ہے کیا اس کا خیال نہیں؟ حالانکہ مسجد سے روضہ مشرق و جنوب کی جانب واقع ہے، آمنے سامنے نہیں ہے۔

مولانا لکھتے ہیں:۔

"میں نے عرض کیا بھائی! مسجد میں بیٹھنے کی طبعی صورت یہی ہو سکتی ہے، جس طرح بیٹھا ہوا ہوں، پھر میں نے کہا کہ آپ تو صوفی ہیں صوفیوں کا مشہور نظریہ ہے " ہرجا کہ نظر کردم سیمائے تو می بینم "، سمجھ گئے کہ کوئی وہابی المزاج آدمی ہے بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے"

(ایضاً)

کھانا منجانب خانقاہ | کھانے کا وقت ہوا، اور کھانے کا تقاضا پیدا ہوا، کہاں کھانا کھایا جائے، اس زمانہ میں وہاں کوئی ہوٹل نہیں تھا، لیکن آپ نے دیکھا ایک صاحب چند چپاتیاں اور مسور کی دال کا پیالہ لئے آرہے ہیں، انھوں نے کہا جب تک یہاں قیام ہے، انشاء اللہ کھانا یہاں پہونچتا رہے گا، پانی بھی لا کر دیا، کھانا کھا لیا جب تک ٹھہرے یہ کھانا ملتا رہا، کام تلاوت اور ایصالِ ثواب کے سوا دوسرا کوئی نہ تھا، لکھتے ہیں:۔

"عید کا دن اسی مسافرت کی حالت میں آگیا، خانقاہ کے علاقے میں نماز ہوئی اس میں شریک ہو گیا"۔ (ایضاً ص۸۴)

قبر کو سجدہ کرتے دیکھ کر | بقرعید کی نماز بعد سجادہ نشیں کو دیکھا، جُبّہ و عمامہ کے ساتھ،

"روضہ کے سامنے وہی پہونچے اور ان کی وہی پیشانی جو ابھی کچھ دیر پہلے آسمان و زمین کے خالق کے سامنے سے اٹھی تھی، روضہ کے سامنے رکھتے ہوئے سربسجود تھے"۔ (ایضاً)

مولانا لکھتے ہیں یہ ایمان سوز منظر دیکھ کر کانپ گیا، اور حیرت ہوئی کہ جس بزرگ نے زندگی بھر تلقین کی تھی کہ خدا کے سوا کسی غیر کو سجدہ نہ کیا جائے اُسکے ماننے والے اسی کو سجدہ کر رہے ہیں، مولانا لکھتے ہیں:۔

"میرا خون کھول رہا تھا، کاش سجدہ کرنے والے صاحب کو یہ دکھانے کی قوت مجھ میں ہوتی کہ نفرت و ملامت بلکہ لعنت کا کتنا بڑا طوفان تھا: جو صاحب مزار کی روح مبارک سے نکل کر سجدہ کرنے والے اور ان کے سجدہ کا احاطہ کئے ہوئے تھا:" (ایضاً)

کلیر سے منگلور کا پیادہ پا سفر | نماز عید کے بعد ایک صاحب آپ سے آکر ملے اور مولانا کو زبردستی اپنے مکان لے گئے، وہاں انھوں نے کھانا اور سوّیاں وغیرہ کھلائیں، اس طرح عید کا مزہ بالکل کرکرا نہیں ہوا، کام و دہن نے لذت پائی، انہی صاحب سے منگلور کا راستہ معلوم کرکے، وہیں سے منگلور کے لئے پیدل روانہ ہو گئے کہانی خود مولانا سے سنئے:۔

ان سے ہی پوچھا منگلور نامی قصبہ اس علاقہ میں کس طرف ہے، راستہ انھوں نے بتا دیا، کچھ دور رخصت کرنے کے لئے ساتھ رہے، جب وہ پلٹ گئے، تو خوب یاد ہے بند کے جوتے بھی پاؤں سے نکال لئے، اور اپنی گٹھری میں ان کو بھی باندھ لیا اور چل پڑا، آفتاب جب غروب ہو چکا تھا، اُفتاں و خیزاں کسی نہ کسی طرح منگلور تک پہونچنے میں کامیاب ہو گیا"۔

گویا پورے دن پیادہ پا رواں دواں رہے، اور منزل پا لینے کے بعد دم لیا۔ مگر جس مسجد میں پہلے گئے تھے، اس کے ایک ذمہ دار نے مولانا کی گٹھری لے کر مسجد سے باہر پھینک دی، اور کچھ صلواتیں بھی سنائیں، ایک طرف تکان سے چور چور، دوسری طرف یہ میزبانی، اس مسجد سے نکل کر جامع مسجد کا راستہ پوچھتے ہوئے وہاں پہونچے، اور اب ذرا عمامہ وغیرہ باندھ لیا کہ مولوی معلوم ہونے لگیں۔ یہاں نمازیوں کو جب معلوم ہوا کہ یہ دارالعلوم دیوبند کے طالبُ العلم ہیں، تو اچھی مدارات ہوئی، ماحضر حاضر کیا، قیام کی جگہ بتادی، جس مقصد سے وہاں گئے تھے معلوم ہوا کہ وہ مقصد پورا نہ ہو سکے گا، مقصد مولانا نے ظاہر نہیں کیا ہے۔ کہ وہ کیا تھا غالبًا وہاں بھی کسی بزرگ سے ملاقات کا ارادہ ہو گا۔

رات منگلور کی مسجد کے کمرہ میں گذاری، نیند خوب آئی کہ تھکے ماندے تھے، ہمت جواب دے رہی تھی، مگر صبح کو آنکھیں کھلیں تو ایسا محسوس ہوا کہ تکان دور ہو چکی ہے، کچھ وقت گذار کر دیوبند کا راستہ لیا۔ اور پیدل چل کر دیوبند پہونچے۔

اس طرح عیدِ اضحیٰ کے ایامِ تعطیل سفروں میں گذر گئے، اور واپس آ کر پھر اپنے پڑھنے لکھنے میں مشغول ہو گئے، ایام طالبُ العلمی میں دیوبند رہتے ہوئے اوّل و آخر بس اسی سفر کا تجربہ ہوا۔

بعد فراغت دیوبند میں فراغت کے بعد چھ سات ماہ یا سال سوا سال بعد مولانا گیلانی جب دیوبند دوبارہ آئے، تو حضرت مولانا حبیبُ الرحمٰن عثمانی رح نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے آپ کو دارالعلوم میں رکھ لیا، مولانا عثمانی رح کا قاعدہ تھا کہ ذہین و ہونہار طلبہ کو نظر میں رکھتے تھے، اور بعدِ فراغت اس کی تربیت کا انتظام کرتے تھے۔

اس زمانہ میں آپ سے متعلق چند کام تھے، کوئی مدرس چھٹی پر گیا، تو ان دنوں میں ان کے اسباق پڑھا دینا، رسالہ القاسم اور الرشید کی ترتیب و تزئین کی

خدمات انجام دینا، اور اگر کہیں سے واعظ و مقرر کی طلبی آگئی تو بحکم اہتمام وہاں پہونچکر تقریر و وعظ کہنا، اور عوام و خواص کو نصیحت کرنا،

گروکل کانگڑی کا سفر ایک سفر کا اس زمانہ میں بھی مولانا گیلانی کو اتفاق ہوا، پنڈت دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج کے ماننے والوں نے ایک خاص طرح کی تعلیم گاہ گروکل کانگڑی میں جاری کر رکھی تھی، جہاں ہندو طلبہ کو مذہبی تعلیم دی جاتی تھی.... مولانا گیلانی کو اس کالج کے دیکھنے کا بہت شوق تھا، ایک مرتبہ رُڑکی تقریری پروگرام میں مدرسہ کی طرف سے جانا ہوا، وہاں تقریر سے فارغ ہو کر سوچا موقع غنیمت ہے، گروکل کانگڑی سے ہو آئیں، اور دیکھ کر آئیں کیا نظام ہے، اور تعلیم کس طرح کی ہوتی ہے۔

کانگڑی کا عزم اس ارادہ کو وہاں کے لوگوں سے ذکر کیا، لوگوں نے سمجھایا کہ موسم برسات میں جنگلی علاقہ میں جانا کسی طرح مناسب نہیں، مگر مولانا جانے پر بضد ہوئے، کسی کی نہیں سنی، جوانی کے عالم میں یہی ہوتا ہے، جب لوگوں نے اندازہ لگا لیا کہ یہ ماننے کے نہیں، تو ایک سن رسیدہ شخص نے راستہ کے لئے کھانا پکوا کر ساتھ کیا، اور بتایا کہ وہاں کس طرح جائیں گے، ایک لوٹا بھی ساتھ کر دیا، مولانا رُڑکی میں ٹرین میں بیٹھ کر نو بجے رات میں "ہردوار" اسٹیشن پہونچے، وہاں سرائے تھی، مگر مسلمانوں کو قیام کی اجازت نہیں تھی، مولانا اسٹیشن سے سرائے گئے، اور سعی کی کہ رات میں قیام کی اجازت مل جائے، مگر سرائے کے ذمہ دار راضی نہیں ہوئے، کہ ایک مولوی مسلمان کو قیام کی اجازت دے دی جائے، واپس آ کر اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ایک درخت کے زیرِ سایہ رات گذاری، صبح کو معمولی سا جو بستر ساتھ تھا، خوشامد کر کے کرایہ پر سرائے میں جمع کرا دیا، اور راستہ معلوم کرنے لگے کہ گروکل کانگڑی کا راستہ کہاں سے ہے، کوئی بات پوچھنے والا تک نہیں تھا، ایک بوڑھا سادھو ملا، اس کو

ترس آیا، اس نے بتایا کہ اس طرح فلاں جگہ جا کر کشتی سے اس پار ہو جائیں، اور وہاں کانگڑی جائیں۔

کانگڑی کا راستہ مولانا نے یہی کیا۔ اس گھاٹ پر پہونچے، کشتی سے اس پار ہوئے، مگر وہاں سے کانگڑی کی طرف جانے والا کوئی آدمی نظر نہیں آیا، سنسان جنگل ہو کر پیدل کا راستہ تھا، مرتا کیا نہ کرتا، ناچار تنہا جانے پر آمادہ ہو گئے۔

مولانا کا بیان ہے:

"اللہ کا نام لے کر تنِ تنہا اس جنگل میں گھسا، زادِ راہ اور کتاب والی گٹھری بغل میں تھی، جنگل کی پگڈنڈی پر چل پڑا، راستہ بہت جلد مل گیا، وقت صبح سات آٹھ کا تھا، سر جھکائے پگڈنڈی پر چلنے لگا۔" (رسالہ دار العلوم دیوبند رجب ۱۳۷۳ھ)

راستہ کی کٹھنائیاں راستہ میں کئی نالے آئے، جن کی پگھلی ہوئی برف بہہ رہی تھی، نیچے برف کے چکنے ٹکڑے پھیلے ہوئے تھے، پاؤں ڈالنا پانی میں آسان نہ تھا، مگر چارہ کار کیا تھا۔ پانی میں داخل ہوئے تو اب پاؤں جمانا بڑا مشکل ہو رہا تھا، مگر جیسے تیسے پار کیا، کچھ آگے چل کر ایک مردِ پیر ملا، جس کی لمبی ڈاڑھی بھی تھی، مولانا کو دیکھ کر اسے رحم آیا، اور اس نے کہا، چلئے میں آپ کو پہنچا کر آؤں، مولانا نے اس کو تائیدِ غیبی سمجھا، اس بڈھے کو مولانا کے اس سفر کے اختیار کرنے پر حیرت تھی، کہ تن تنہا اس جنگل سے گذرنے کی کیسے ہمت کی۔

کانگڑی کالج میں چنانچہ وہ آپ کے ساتھ ساتھ وہاں تک آیا جہاں سے عمارت صاف نظر آنے لگی تھی، یہاں پہونچکر اس بڈھے نے کہا لیجئے آپ منزل پر پہونچ گئے، میں چلا۔ اور وہ واپس ہو گیا۔ یہ گیارہ بجے دن کا وقت ہوگا۔ مولانا کانگڑی کی عمارت میں داخل ہوئے تو آدمیوں سے ملاقات

ہوئی، مولانا نے بتایا کہ مجھے اس کالج کے پرنسپل سے ملنا ہے۔ کسی نے وہاں پہنچا دیا۔ پرنسپل گرم جوشی کے ساتھ ملا، درس بند کر دیا۔ اور دیر تک باتیں کرتا رہا، اس نے یہ بھی بتایا کہ اس ادارے کی وہی حیثیت ہے جو آپ کے یہاں ندوہ کی ہے۔ یعنی قدیم و جدید کو باہم قریب لانا اور دوری کو ختم کرنا۔

باقی یہ سنسان جنگل والی جگہ اس کے لئے اس غرض سے منتخب کی گئی ہے کہ شہری تمدن کے زہریلے اثرات سے طلبہ محفوظ رہ سکیں اور یکسو ہو کر اپنی تعلیم میں منہمک رہیں، یہاں جگہ وافر ہے۔ اساتذہ و طلبہ یہاں سبزی کی کاشت کرتے ہیں کہ کھانے میں کام آتے، دودھ دہی کے لئے مویشی بھی پالتے ہیں۔

کالج کی سیر اپنے کالج کے مقاصد سمجھا کر پرنسپل نے ایک آدمی کو مولانا کے ساتھ کر دیا کہ وہ مولانا گیلانی کو ہر کلاس میں لے جائے، اور دکھلائے کہ تعلیم کسطرح ہو رہی ہے، اور پھر کتبخانہ کی بھی سیر کرائے، وہ آدمی ملنسار تھا بڑی محبت سے تمام کالج میں پھرایا، جب سب کچھ دکھایا جا چکا تو اُس نے مہمان خانہ میں لاکر کہا کہ آپ اب یہاں آرام کریں، بارہ بج چکے تھے، مہمان خانہ صاف ستھرا عمدہ تھا مہمان خانہ کی طرف سے دن کا کھانا پیش ہوا، مولانا نے تناول کیا، آرام کیا، ظہر کا وقت آیا تو ہلکی آواز سے اذان دے کر اسی میں نماز ادا کی، عصر کے وقت تک پھر آرام کرتے رہے، عصر پڑھ کر واپسی کا ارادہ کر لیا، پرنسپل کو خبر ہوئی تو آکر ملا، بہت کچھ سمجھایا کہ اب واپسی کا وقت نہیں رہا، رات یہیں گذاریں، کوئی تکلیف نہیں ہوگی، مگر موہوم خیالات اور جوشِ جوانی نے مل کر ایک بات نہیں سننے دی، آمادۂ سفر ہو ہی گئے، حالانکہ معلوم تھا کہ تین چار گھنٹے پیدل کا راستہ ہے، کیوں کہ ابھی صبح ہی آئے تھے۔

کانگڑی سے واپسی پرنسپل نے مجبوراً مولانا کو رخصت کر دیا، دن کا آخری

وقت، جنگل کا سنسان راستہ، جہاں کسی آدم زاد کا پتہ نہیں، برسات کے دن، تن تنہا پگڈنڈی پکڑے گردن جھکائے چلتے رہے، کنارے آئے تو آفتاب غروب ہو چکا تھا، اندھیرا چھانے لگا تھا، خود تحریر کرتے ہیں:۔

"تاریکی گویا پھیل رہی تھی، میں نے سر پکڑ لیا کہ اب کیا ہوگا، میں نے خدا کی نعمت کا انکار کیا تھا، گروکل کے مہمان خانہ میں شب گذاری کے ارادہ کو خواہ مخواہ ترک کیا تھا، اب اس کی سزا یہ تھی کہ گنگا کے ایک جنگلی نالے کے کنارے جس کے ایک طرف گھنا جنگل اور دوسری طرف اونچے خوفناک پہاڑ اور تیسری طرف دریا کا نالہ، رات اس ٹاپو میں یا اللہ کیسے گذاروں گا۔" (رسالہ دارالعلوم رجب ۱۳۷۲ھ)

یہ بھی لکھا ہے:۔

"کہ ساحل پر جہاں تک نظر جاتی تھی دُور دور تک کوئی آدمی نظر نہیں آتا تھا، اب تاریکی پھیل چکی تھی، اب سر پکڑ لیا کیا ہوگا، گھبرانے لگا، مغرب کی نماز کا آخری وقت ہو رہا تھا، سوچا جو ہونا ہوگا، ہوگا" مغرب کی نماز تو پڑھ لی جائے، نیت باندھ کر نماز ادا کی، دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا تھا کہ کچھ آہٹ محسوس کی، کچھ لوگ بیل ہنکاتے آرہے ہیں، دوڑ کر وہاں پہنچا کہ میں بھی اس پار جانا چاہتا ہوں، میری گھبراہٹ دیکھ کر کہنے لگے پریشانی کی کوئی بات نہیں، ہم لوگوں کے ساتھ پار اتر جانا، اب جان میں جان آئی، چنانچہ ان بنجاروں نے ملاح کو آواز دی، اس پار سے کشتی ان کو لینے آگئی، اس میں بیٹھ کر میں بھی اللہ اللہ کر کے اس پار پہونچا، اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا، سرائے سے بستر واپس لیا اور ہردوار اسٹیشن پہنچا۔" (ایضاً)

"جان بچی لاکھوں پایا" اسی کو کہتے ہیں، اب ٹرین کا سفر تھا، گھبرانے کی بات تھی نہیں، ٹرین میں بیٹھ کر رڑکی ہوتے ہوتے دیوبند واپس پہونچے، اللہ کا شکر ادا کیا کہ مسافر اپنی قیام گاہ بخیر آگیا۔

اندرونِ دیوبند تفریح دیوبند سے باہر سیر و سیاحت میں ان دو واقعات کے سوا اور کچھ نہیں مل سکا۔ البتہ اندرونِ دیوبند جن طلبہ کے ساتھ زمانۂ طالب العلمی میں رہتے تھے وہ کبوتروں اور خرگوشوں کا شکار عام طور پر کیا کرتے تھے، اور کبھی کبھی مچھلیوں کا بھی، یہ سب صوبہ بہار کے رہنے والے تھے، مولانا لکھتے ہیں:۔

"کبھی کبھی فقیر بھی "شب شکاری" کی اس مہم میں اس ٹولی کے ساتھ رات رات بھر کھیتوں اور میدانوں میں بھٹکتا پھرتا تھا، مگر اس ٹولی کا سب سے زیادہ عضوِ ضعیف شمار کیا گیا۔"

(رسالہ دارالعلوم محرم ۱۳۷۲ھ ص ۳۵)

کبوتروں کا شکار کبوتروں کا شکار عام طور پر رات میں ہوا کرتا تھا، اُس زمانہ میں — کسانوں نے کھیتوں کو پانی دینے کے لئے اپنے اپنے کھیتوں میں کچے کنوئیں کھود رکھے تھے، ان کنوؤں میں طاق نما گڈھے ہوتے تھے، رات میں کبوتروں کا ملجا و ماویٰ یہی ہوتے تھے، شکاری انہی کنوؤں پر جال ڈال کر کبوتروں کو پکڑا کرتے تھے۔ مولانا لکھتے ہیں:۔

"خدا جانے کس طرح پتہ چلا لیتے کہ اس کنوئیں میں کبوتروں کی کافی تعداد ہے، یہ فیصلہ کر کے جال پہلے کنوئیں پر پھیلا دیا جاتا۔ اور ایک رسہ جو ساتھ رہتا تھا اسی کو ہاتھ میں پکڑ کر حکیم منظر حسن صاحب اپنے خاص رفقاء کے ساتھ کنوئیں میں اتر جاتے، ان لوگوں کے اترنے کے ساتھ ہی کبوتر اڑنے لگتے، کنوئیں سے باہر نکلنا

چاہتے، لیکن جال میں گرفتار ہو جاتے ——— ایک ایک مہم میں بسا اوقات تین، تین سو چار سو تک کبوتر ہاتھ آجاتے تھے، پَو پھٹنے کے ساتھ ہی ہم لوگ مدرسہ میں داخل ہو جاتے، صبح کو ذبح کئے ہوئے کبوتروں کی پکائی دیگوں میں ہوتی۔"

(رسالہ دارالعلوم محرم ۱۳۷۳ھ ص ۳۵)

مچھلیوں اور خرگوشوں کا شکار اسی طرح مچھلیوں کا بھی شکار ہوتا تھا اور خرگوشوں کا بھی مولانا نے لکھا ہے:۔

"مچھلیوں اور کبوتروں کے ساتھ ساتھ خرگوشوں کی بھی کافی تعداد ہر دوسرے تیسرے دن شکار ہوتی تھی، گیہوں کے کھیتوں میں بکثرت خرگوش رہا کرتے تھے، اور یہ طلبہ کبھی کبھی لاٹھیوں سے ہی مار لیتے تھے۔" (ایضاً)

مولانا لکھتے ہیں، "میں خرگوش کے کھانے میں شریک نہیں ہوتا تھا" "لیکن خدا جانے میرا دل اس کھانے پر آخر وقت تک کیوں راضی نہ ہوا، زیادہ سے زیادہ کبھی کبھی مصالحہ تو روٹی میں لگا لیتا، لیکن بوٹی شاید ہی کبھی استعمال کی ہو۔" (ایضاً ص ۳۶)

گنے کا رس اس تفریح میں کبھی کبھی گنے کے رس کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ مولانا نے لکھا ہے:۔

"ایک دفعہ بدقسمتی سے شب گردی کی اس مہم میں فقیر بھی ساتھ ہو گیا تھا، گنے کی کافی تعداد حاصل ہوئی، خیال کیا گیا کہ ان کا رس نکالا جائے، لیکن بیل طالبُ العلم کہاں سے لائیں، بالآخر طے کیا گیا کہ بجائے بیلوں کے طلبہ ہی کولہو کو چلائیں۔ اس موقع پر

حصہ رسدی کے مطابق تھوڑی دیر کے لئے اس پنچوڑنے کے اس کولہو میں خاکسار کو بھی جوتا گیا۔" (ایضاً)

آموں اور بیروں کی دعوت مولانا نے لکھا ہے کہ آپ کی طالب العلمی کے زمانہ میں دیوبند کے باشندے طلبہ کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا کرتے تھے اور اپنے کھیتوں اور باغوں میں عمدہ مہمانی کرتے تھے، اور حقِ مہمانی ادا کر کے خوش ہوتے تھے۔

"اپنی اپنی بیریوں میں بلا کر طلبہ کی بیروں سے ضیافت یا آموں کے زمانہ میں مدعو کر کے آموں کی سخاوت ایک عام بات تھی۔" (ایضاً ص ۲۷)

امن و عافیت کی زندگی دیوبند کی طالب العلمی کے متعلق مولانا کا احساس ہے کہ:۔

الغرض دارالعلوم دیوبند کا ماحول کم از کم اُس زمانہ (۱۳۲۲ھ) میں جب فقیر کو اس احاطہ میں زندگی گذارنے کا موقع ملا امن و عافیت راحت و آرام کے اسباب سے معمور تھا۔" (ایضاً ص ۳۶)

کوئی شبہ نہیں کہ آج سے ستر پچھتر سال پہلے جب اس ملک میں انگریزوں کی حکمرانی تھی، مسلمان خوشحال بھی تھے، اور اطمینان و سکون کی دولت سے مالا مال بھی ملک میں اس قدر مدارس قائم نہیں ہو سکے تھے، جو تعداد اب پائی جاتی ہے، گنے چُنے مدارس تھے، ان مدارس میں اس وقت بھی دارالعلوم دیوبند سب سے بڑا اور مرکزی مدرسہ تھا، اور قصبہ دیوبند کے باشندے طلبہ کے ساتھ بڑی محبت اور حسنِ سلوک سے پیش آتے تھے۔

حضرت نانوتویؒ کا احسانِ عظیم حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم دیوبند کی قبر کو اللہ تعالیٰ اپنے نور سے منور رکھے اور ان کا خاندان پھلتا پھولتا رہے، دارالعلوم اور دوسرے مدارس قائم کر کے دین اور اسلام کی اشاعت کی

بڑی عظیم خدمت انجام دے گئے۔ آج جو بھی مدعی ہو، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ سب صدقہ ہے حضرت نانوتویؒ اور آپ کے مرشد ورفقاء اور احباب کا اور ساتھ ہی باشندگانِ دیوبند کی ملی ہمدردی کا، بالخصوص ان اسلاف کی دعاءِ نیم شبی اور آہِ سحر گاہی کا کہ ملک بلکہ عرب و عجم کا گوشہ گوشہ علماء و مشائخ سے بھرا ہوا نظر آتا ہے اور دین کا چرچا عام ہے، اپنا خیال ہے کہ علماءِ دیوبند میں جو لوگ حضرت نانوتوی ؒ کے لئے دعا گو نہیں وہ کفرانِ نعمت کے مرتکب ہیں، وہ یہ نہیں سوچتے کہ یہ دولتِ علم و فضل ان کے گھرانے اور خاندان میں اور ان کے حصہ میں کس راستہ سے آئی، اور یہ عزت و مکرمت کس راہ سے حاصل ہوئی، من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے۔

شاد باش و شاد زی اے سرزمینِ دیوبند
ہند میں تو نے کیا اسلام کا جھنڈا بلند

بعد فراغت ـــــ معاش کی تلاش میں

شعبان ۱۳۳۲ھ میں مولانا گیلانی نے دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کا سالانہ امتحان دیا، اور اس میں نمایاں کامیابی حاصل کی، طالب العلمی کا زمانہ جیسا کچھ خوش گوار اور بے فکری کا ہوتا ہے، ظاہر ہے، بچپن سے فراغت تک ایک دائرہ بنا ہوتا ہے، طالبُ العلم اس کے اندر چکر کاٹتا رہتا ہے، اگر علمی مناسبت حاصل ہوتی ہے، تو تھوڑی بہت فکر پڑھنے اور مطالعہ کی ہوتی ہے، ..... ورنہ اس کی فکر یا گھر والے کرتے ہیں، یا پھر مدرسہ کے ذمہ دار، ذہنی کشمکش سے واسطہ عموماً نہیں پڑتا ہے۔

بعد فراغت احساس ذمہ داری لیکن جونہی فراغت کا وقت قریب آتا ہے، خیالات ہجوم در ہجوم آنے شروع ہو جاتے ہیں، کہ بعد فراغت کیا ہوگا؟ زندگی کس لائن پر گذاری جائے گی؟ وہ ذمہ داری محسوس کرنے لگتا ہے، کہ گھر والے کہیں گے کہ کچھ کرو، خود اپنا احساس بھی یہی ہوتا ہے کہ کچھ کرنا چاہئے، مگر کرے کیا؟ اور کیا لائن اختیار کرے؟ اہم سوال سامنے آکھڑا ہوتا ہے۔

مدرسہ کی زندگی جب ختم ہو جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک ایسے چوراہے پر کھڑا ہے، جہاں سے ہر طرف راستے جاتے ہیں، مگر تفصیل کسی کی معلوم نہیں ہے۔ کہ وہاں منزل پر پہونچکر کیا کرنا ہوگا، اور یہ کہ خود اس راستہ کی منزل کیسی ہے، کیوں کہ دنیا کے سرد وگرم اور نشیب و فراز سے وہ غریب قطعاً ناواقف ہوتا ہے، مختلف کاموں کا خیال آتا ہے اور جاتا ہے، مگر دل

کسی پر نہیں جمتا ہے۔

ایسے وقت میں اگر کوئی استاذ، گھر کا مربی یا کوئی مہربان ہاتھ پکڑ کر ایک راستہ پر لگا دیتا ہے، تو وہ بہت ساری مصیبتوں سے بچ جاتا ہے اور جس راہ پر لگا دیا جاتا ہے چلتا رہتا ہے۔ لیکن اگر خود اپنی رائے پر اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے تو اس کی ذہنی کشمکش کا حال نہ پوچھئے کیا ہوتا ہے، اور کن مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ذریعہ معاش کی فکر مولانا گیلانی کی طالب العلمی جب ختم ہو چکی، تو وہ بھی اس فکر میں پڑ گئے کہ کون سی راہ اختیار کی جائے، اور مستقبل کے لئے ذریعہ معاش کیا ہو؟ ساتھ یہ بھی پیش نظر تھا کہ جو کچھ پڑھا ہے، بس اسی دائرہ میں کچھ کام کرنے کی صلاحیت ہے، اس کے سوا کسی اور کام کا قطعاً نہیں ہوں، خود آپ نے لکھا ہے:

”معاوضہ جس کام کا دنیا میں مل سکتا ہے ایسے کام کی — صلاحیت نہیں۔“ (رسالہ دارالعلوم رجب ۱۳۷۴ھ)

آپ پڑھ چکے ہیں کہ ابتدائی تعلیم کے بعد مولانا کی پہلی منزل ٹونک قرار پائی تھی، سات آٹھ سال وہاں طالب العلمی کے نام پر گذر رہے تھے، اور وعظ و تقریر کی راہ سے کچھ ماننے والے بھی پیدا ہو گئے تھے، دیوبند صرف ایک سال رہنا ہوا تھا۔ جاننے اور ماننے والوں کا کچھ اندازہ نہیں تھا، تیسری جگہ اپنا وطن تھا جو ایک مختصر آبادی کا گاؤں تھا، جہاں کاشت کاری کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں ہوتا تھا۔

ٹونک کا سفر اس لئے مولانا گیلانی نے سمجھا اور درست سمجھا کہ ان کے لئے اگر کوئی صورت نکل سکتی ہے تو وہ ٹونک میں ہی، اور ان کے لئے سب سے مناسب جگہ وہی ہے پھر وہاں ابھی ان کے اساتذہ زندہ تھے، دوسرے

جاننے والے بھی تھے، اور ساتھ ہی وہ مسلمانی ریاست بھی تھی، جہاں ریاست کا سکہ چلتا تھا، گو وہ بہت مختصر علاقہ تھا۔

پہلی ملازمت پانچ روپے ماہوار پر چنانچہ گھر سے نکل کر سیدھے ٹونک پہونچے اساتذۂ کرام سے ملے، اور بتایا کہ اب انکو کسی کام پر لگایا جائے، جو آپ کے مستقبل کو روشنی بخش سکے، اتفاق سے اس وقت مدرسہ خلیلیہ ٹونک میں تدریس کی کوئی جگہ خالی نہیں تھی، اس لئے وہاں کے لوگوں نے سردست مولانا کو کتب خانہ میں رکھدیا کہ وہ فہرست سازی کی خدمت انجام دیں۔ یہ وہی مولانا گیلانی ہیں جو اپنی طالب العلمی میں اساتذۂ کرام کے نورِ نظر تھے، ساتھیوں میں ممتاز تھے، اور پڑھنے لکھنے میں کافی محنت کرتے تھے اور ذکی و با استعداد شمار ہوتے تھے۔ یہ بھی کہا گیا کہ، پھر جونہی مدرسہ میں جگہ نکلے گی تم کو لے لیا جائے گا۔ حق المحنت کتبخانہ سے صرف پانچ روپے طے پایا، اور وہ بھی نواب شاہی سکہ سے، گویا انگریزی روپے سے پونے چار روپے۔

پانچ سے بیس ماہوار مرتا کیا نہ کرتا اس مجبوری میں اسی کو غنیمت جانا، اور یہ خدمت قبول کر لی، اور فہرست سازی کا کام کرنے لگے دو ماہ بعد مدرسہ میں ایک مزید مدرس کی ضرورت ہوئی، اربابِ مدرسہ نے اس جگہ پر مولانا گیلانی کا تقرر کر دیا، استعداد پر سبھوں کو پہلے ہی سے اعتماد تھا، مشاہرہ مدرسہ سے پندرہ روپے طے کیا گیا، اسطرح مدرسہ سے ماہانہ بیس روپے ملنے لگے، جس کو مولانا نے شروع میں اپنے لئے غنیمت جانا، پانچ دس روپیہ کا ایک ٹیوشن کر لیا، نواب صاحب کے توشک خانے کے داروغہ میرٹھ کے رہنے والے سید محمد یعقوب صاحب کے بچہ محمد یوسف نامی کو ابتدائی اردو وغیرہ پڑھانا ہوتا تھا۔

ترقی کی فکر اس زمانہ میں پچیس تیس روپے ماہانہ آمدنی مولوی کے لئے کم نہیں

تھی، عام طور پر چھوٹے مدارس میں علماء کی یہی تنخواہ ہوتی تھی اور اتنے میں ایک مولوی اوسط طریقہ پر باسانی زندگی گذار لیا کرتا تھا، مگر بقول مولانا گیلانی۔

"اور یہ ساری منزلیں تین چار مہینے میں طے ہوتیں، دنیا طلبی کے امکانات کے اس غیر متوقع تجربے نے وساوس پیدا کرنے شروع کئے۔" (رسالہ دارالعلوم رجب ۱۳۷۴ھ ص ۱۹)

مولانا ذہین تھے، آپکو اپنی استعداد پر بھروسہ بھی تھا، اور جوش جوانی کا جنون بھی، سوچا ہوگا ذرا چل پھر کر اور تجربہ کیا جائے کہ مولوی کی سطح سے کوئی اونچی یا ممتاز جگہ مل سکے۔ اور مستقبل ذرا اطمینان بخش ہو، یہ مولانا کے بلند حوصلہ ہونے کی بات تھی، اور ایک انسان کو ایسا سوچنا چاہئے بھی تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

ایک ریاست سے دوسری ریاست میں | چونکہ آپ کی زندگی کا اس وقت بڑا حصہ مسلمانی خود سر ریاست میں گذرا تھا، اس لئے برطانوی قلمرو کو اپنے لئے مفید نہیں سمجھتے تھے۔ اور سوچتے ہوں گے انگریزی حکومت میں جب علماء کے لئے کسی محکمہ میں کوئی جگہ سرے سے نہیں رکھی گئی ہے تو توقع کس چیز کی رکھی جائے۔ ہائی اسکول میں مولوی رکھے جاتے تھے، مگر اس کا مشاہرہ بھی تیس پینتیس روپے ماہانہ سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔

حیدرآباد کا سفر | اس لئے مولانا کے ذہن میں ٹونک کے بعد حیدرآباد ریاست کا نام آیا، جہاں میر عثمان علی خاں کی حکومت تھی، اور وہ بھی آزاد ریاست تھی، اور ٹونک سے بہت بڑی، وہاں علماء اور علم نوازی دونوں تھی، اس خیال نے رفتہ رفتہ فیصلہ کی صورت اختیار کرلی، اور طے کر لیا کہ ٹونک سے رخصت ہو کر حیدرآباد

پہونچنا ہے اور وہاں قسمت آزمائی کرنی ہے، لیکن بقولِ مولانا:۔

"یہ جانتا تھا کہ بخوشی ٹونک سے مجھے لوگ جانے نہ دیں گے آخر اپنے ایک مخلص دوست کو دل کے فیصلہ سے آگاہ کرکے ان سے یہ چاہا کہ ٹونک جہاں سے اسٹیشن دس پندرہ کوس کے فاصلہ پر تھا، وہاں تک پہونچانے کے لئے کسی ایسی سواری کا بندوبست فرمادیں کہ رات کی تاریکی میں ٹونک سے نکل جاؤں، انھوں نے بندوبست کردیا۔" (ایضاً)

اب فکر ایک ساتھی کی ہوئی کہ تنہا اس قدر لمبا سفر مناسب نہ ہوگا، کوئی نہ کوئی ساتھی بھی ہو، ایک طالب علم جس کا نام انوار اللہ آبادی تھا، مولانا سے وہ پڑھتا بھی تھا اور مولانا کے ہی ساتھ رہتا بھی تھا، گویا شاگرد اور خادم دونوں تھا، ساتھ ہی مخلص، راست باز اور وفادار بھی تھا، اس کو رفیق سفر بنایا، وہ غریب مولانا کی محبت میں تیار ہوگیا، مولانا لکھتے ہیں:۔

"شباشب ٹونک سے روانہ ہو کر اسٹیشن پہونچا، اور سیدھے حیدرآباد کا ٹکٹ لے، راہیٔ دکن ہوا، حیدرآباد کے اسٹیشن "نام پلی" پہونچا، وہ دن آج تک یاد ہے، میرے رفیق نے پوچھا کہ شہر میں کہاں ٹھہرنے کا ارادہ ہے، حیدرآباد میرے لئے قطعاً اجنبی شہر تھا کہاں جاؤں؟ چند لمحے بعد خیال آیا کہ یہاں مشہور عربی مدرسہ نظامیہ نامی ایسی جگہ ہے جہاں مولویت کو پاؤں ٹیکنے کی شاید گنجائش ملجائے۔" (ایضاً)

مدرسہ نظامیہ میں | مولانا نے جھٹکہ نامی سواری کی، اور دونوں استاذ شاگرد مدرسہ نظامیہ پہونچ گئے، دروازے پر سامان اتارا، اندر سے کوئی طالب علم نکلا،

علیک سلیک کے بعد وہ اپنے کمرہ میں ان دونوں اجنبی کو لے گیا، اور طالب علم ہی سمجھ کر لے گیا، پھر تھوڑی دیر میں دوسرے طلبہ بھی آ آ کر ملنے لگے، تین چار دنوں میں طلبہ میں گھل مل گئے، اس طالب العلم نے میزبانی کا بھی شرف حاصل کیا۔ اتفاق سے ٹونک کے پڑھے ہوئے ایک ساتھی مولوی شاہ سید مقبول احمد صاحب مل گئے، جو صوبہ مہاراشٹر کے رہنے والے تھے، اور پیر خاندان سے تعلق رکھتے تھے، پیری مریدی خاندانی پیشہ تھا، وہ بڑی بے تکلفی اور محبت سے ملے، ملنے جلنے کے بعد انھوں نے کہا کہ اچھا ہے میں تم کو حضرت مولانا انوار اللہ خاں سے ملاؤں گا، جو اس زمانہ میں امور مذہبی کے معین المہام (وزیر) تھے، اور مدرسہ نظامیہ کے سرپرست بھی تھے۔

مولانا انوار اللہ سے ملاقات | مولانا انوار اللہ صاحب کی ڈیوڑھی (کوٹھی) مدرسہ کے قریب ہی محلہ شکر کوٹے میں تھی، ایک دن مقبول صاحب مولانا کو ساتھ کر کے ان کے مکان پر پہونچے، تاکہ مولانا گیلانی کو وزیر امور مذہبی سے ملا دیں، کوٹھی شاندار، لمبی چوڑی تھی، اس احاطہ میں داخل ہوئے تو ایک دوسرے ملنے والے اجمیر درگاہ کے متولی مولوی نثار احمد نظر پڑے، وہ اس وقت وزیر صاحب کے یہاں مہمان تھے وہ بھی آ کر مولانا گیلانی سے ملے اور آپ کے ساتھ مولانا انوار اللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ کا تعارف بہت ہی مخلصانہ اور وقیع انداز میں اور بہت ہی اچھے جملوں کے ساتھ کرایا، آپ کی تقریری اور علمی صلاحیتوں کا تذکرہ بھی کیا۔

تعارف کے بعد جب ذرا اطمینان ہوا تو وزیر صاحب نے مولانا گیلانی سے دریافت کیا کہ آپ کا قیام اس وقت کہاں ہے؟ بتایا کہ مدرسہ نظامیہ میں، اور ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں، جب وہاں سے مل کر مولانا واپس ہوئے اور مدرسہ پہونچے تو معلوم ہوا کہ سرپرست صاحب نے لکھ بھیجا ہے کہ ٹونک سے جو طالب العلم آئے ہیں انھیں مطبخ سے نمبر اول کا کھانا دیا جائے، تین چار دنوں تک مدرسہ ہی

میں قیام رہا، اور برابر وزیر امور مذہبی کے یہاں آمد و رفت جاری رہی یہ ایک درویش صفت عالم دین تھے، اور وزیر ہونے کے باوجود اہل علم کے بہت قدردان تھے۔

مولانا انوار اللہ کے یہاں | کچھ دنوں کے بعد جب راہ و رسم بڑھی تو وزیر صاحب نے فرمایا کہ مدرسہ میں آپ کو تکلیف ہوتی ہوگی، میرے مکان میں بہت گنجائش ہے، یہاں آجائیں، ان شاء اللہ کوئی تکلیف نہ ہوگی، مولانا گیلانی مسافر تو تھے ہی اور کچھ دنوں حیدرآباد میں قیام کرنا تھا، لہٰذا ان کی یہ فرمائش غنیمت معلوم ہوئی اور غور و فکر کے بعد مدرسہ سے وزیر امور مذہبی مولانا انوار اللہ صاحبؒ کی کوٹھی میں آ گئے، انھیں ایک کمرہ دے دیا گیا، خدام کو ہدایت کر دی گئی کہ کوئی تکلیف نہ ہونے پائے، استاذ و شاگرد دونوں یہیں رہنے لگے۔

فتوحات مکیہ کے درس میں شرکت | مولانا انوار اللہ خان ایک ذی علم، ذی استعداد اور وسیع النظر عالم دین تھے، رات میں شیخ اکبر بن عربیؒ کی مشہور کتاب "فتوحات مکیہ" کا علماء کو درس دیا کرتے تھے، حیدرآباد میں رہنے والے بڑے بڑے جبہ و دستار والے علماء اس درس میں شریک ہوا کرتے تھے اور مولانا گیلانی بھی اس درس میں شریک ہونے لگے اور درس دینے والے ان سوالات کے جوابات بھی دیا کرتے تھے۔

مولانا گیلانی کی تقریر | کچھ دنوں کے بعد وزیر صاحب کو مولانا گیلانی کے ذوق تصوف اور استعداد کا اندازہ ہوا تو ایک دن مولانا سے فرمانے لگے، میری روز روز سنتے ہو لیکن کبھی اپنی بھی سناؤ گے، مولانا نے عذر پیش کیا کہ حضرت کے سامنے میری زبان کیسے کھلے گی، پھر درس میں شریک ہونے والے سارے پرانے قسم کے ہی علماء ہوتے ہیں، ان کے موجود ہوتے میری حیثیت کیا ہے؟ وزیر صاحب کہتے رہے اور مولانا ٹالتے رہے، جب کئی ہفتے اسی طرح گذر گئے، اور دیکھا کہ وزیر صاحب مانتے ہی نہیں، ان کا اصرار اپنی جگہ جاری ہے، تو مولانا گیلانی لکھتے ہیں کہ ہمت

کر کے تقریر کا میں نے ارادہ کر لیا۔ لیکن خود لکھتے ہیں کہ:۔

"اب یاد نہیں کہ کس موضوع پر تقریر کی گئی، لیکن اتنا خیال ہے کہ مولانا انوار اللہ خاں مرحوم نے اس زمانہ میں چند خاص کتابیں لکھی تھیں، جن میں مقاصد الاسلام، کتاب العقل، حقیقۃ الفقہ، افادۃ الافہام خاص طور پر پُر مغز کتابیں ہیں، میرے مطالعے سے یہ کتابیں گذر چکی تھیں، بیچ بیچ میں اُن کتابوں کے خاص خاص اہم مضامین کا تذکرہ اس تقریر میں کچھ اس طریقہ سے کیا جا رہا تھا جس سے مولانا (انوار اللہ) اس لئے متأثر ہو رہے تھے کہ انکی محنت سے استفادہ کرنے والے بھی پائے جاتے ہیں، تقریر جب ختم ہوئی تو مولانا کی شفقت و مہربانی اس غریب مسافر (مناظر احسن) کے ساتھ قدرتاً بڑھ گئی، دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ، حلقۂ درس میں شریک ہونے والوں سے شناسائی کا موقع ملا۔" (ایضاً ص۲۱)

ملا مراد کابلی کی کرم فرمائی انہی میں ایک ملا مراد نامی بزرگ تھے، جو کتابوں کے خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے، یہ کابل کے رہنے والے تھے، عرصہ سے حیدرآباد میں ہی رہ گئے تھے، ان کی توجہ مولانا گیلانی کی طرف بہت بڑھ گئی، انھوں نے دوسرے دن کے لئے مولانا کو اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا اور خود آکر مولانا کو ساتھ اپنے یہاں لے گئے، ان کی شہر حیدرآباد میں بہت سارے اہلِ علم سے شناسائی تھی اور ہر طبقہ سے ان کا ملنا جلنا تھا، مولانا گیلانی سے کہنے لگے، میں آپ کو یہاں کے اہلِ علم طبقہ سے ملاؤں گا، مولانا اب مُلا مراد سے بھی ملنے جلنے لگے اس طرح ایک اور قدرداں کا اضافہ ہوا، جو ماشاء اللہ مخلص بھی تھے اور اہلِ علم کے قدرداں بھی۔

مہاراجہ کشن پرشاد ملا مراد کابلی نے سب سے پہلے مولانا کو مہاراجہ کشن پرشاد سے ملانے کا پروگرام بنایا، مہاراجہ علم دوست، علماء نواز، اور علمی گفتگو کا بڑا عمدہ ذوق رکھتے تھے، تصوف کا بھی بہت ہی ستھرا ذوق تھا، مسئلہ وحدت الوجود سے خاصی دل چسپی رکھتے تھے، اور حیدرآباد کے بڑے رؤسا میں سے تھے، ایکدن ملا مراد کابلی کے ساتھ مہاراجہ کشن پرشاد کی مجلس میں حاضری ہوئی، ملا صاحب نے فارسی زبان میں مولانا کا تعارف وقیع انداز میں کرایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا۔

"اس شخص کی کم عمری پر نہ جایئے، ہندوستان سے آنے والوں میں اس قسم کی تقریر کرنے والا میری نظر سے کوئی نہیں گزرا

(رسالہ دارالعلوم یادِ ایام عمر گذشتہ ص۱)

مہاراجہ کی توجہ مہاراجہ ایسے ذی علم کی تلاش میں ہی رہتے تھے، مل کر خوش ہوئے، اور بقول مولانا گیلانی:۔

"مہاراجہ بہادر اچھی طرح ملے، باتیں ہونے لگیں، ان کو وحدۃ الوجود کے مسئلہ سے خاص دل چسپی تھی، چھیڑ کر اسی مسئلہ پر آگئے، میں جب اس پر بولنے لگا تو دیکھا مہاراجہ چند ہی فقروں کے بعد کچھ سنبھل سے گئے، اور میری گفتگو کو بغور سُننے لگے، ...... کہنے لگے، جس طریقہ سے تم نے اس مسئلہ کو میرے سامنے بیان کیا ہے، کیا چند مولوی جو کچھ وہابی خیال کے ہیں ان کو جمع کر کے سنانا چاہوں تو ان کے سامنے تقریر کرو گے؟" (ایضاً ص۲)

علماء کے سامنے تقریر مولانا نے فرمایا، کوئی مضائقہ نہیں جو کچھ میں نے سمجھا ہے اس کو انھیں سمجھانے کی سعی کروں گا، چنانچہ اس کے لئے تاریخ طے ہو گئی کہ مہاراجہ کی کوٹھی میں ان مولویوں کو تاریخِ مقررہ پر جمع کیا جائے، ان کی کوٹھی "شاہ علی بنڈے" نامی محلہ میں تھی، چنانچہ تاریخِ مقررہ پر یہ اجتماع ہوا، مولانا

لکھتے ہیں :۔

"مہاراجہ نے حکم دیا میں کھڑا ہوگیا، جو کچھ عرض کرنا چاہا تھا، اُن علماء کے سامنے بھی اسی طرح بیان کرتا رہا سبھوں نے تعریف کی"

(ایضاً)

اب اس کے بعد مہاراجہ مولانا کا اور گرویدہ ہوگیا، ایک دن کہنے لگا کہ اس میں کیا مضائقہ ہے کہ آپ مولانا انوار اللہ صاحب کے کافی دنوں مہمان رہ چکے، اب کچھ دنوں میرے مہمان بن جائیں، مولانا نے اس پر معذرت کی اور اسے اپنے لئے مناسب نہیں سمجھا، اخیر میں مہاراجہ صاحب کہنے لگے، کہ آتے جاتے رہیں، مولانا نے کہا اس میں حرج نہیں، ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا،

مولانا حسب وعدہ مہاراجہ کے یہاں بھی آتے جاتے رہے اور علمی مسائل پر گفتگو بھی ہوتی رہی، مہاراجہ اپنی تصنیفات کی ایک ایک کاپی مولانا کو دیتے رہے اور اس کے متعلق رائے بھی معلوم کرتے رہے۔

حیدرآباد کی دو ممتاز شخصیتیں حیدرآباد میں دو شخصیتیں بہت ممتاز شمار ہوتی تھیں۔ مسلمانوں میں نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خاں صاحب مرحوم (م ۱۳۳۶ھ) اور ہندوؤں میں مہاراجہ کشن پرشاد، ایک امورِ مذہبی کے مدار المہام تھے، اور دوسرے وزیرِ اعظم حیدرآباد کے پیش کار، جن کی ذاتی آمدنی دس گیارہ لاکھ سالانہ تھی، پانچہزار ماہوار تنخواہ پشتینی خدمت کی تھی، یعنی کام کریں یا نہ کریں خزانہ عامرہ سے پانچہزار کی رقم ماہانہ ملتی رہے گی۔

ذریعہ معاش کا جائزہ مولانا کو اب خیال آیا کہ جس مقصد سے حیدرآباد آنا ہوا تھا اس پر توجہ دی جائے۔ مولانا کے الفاظ ہیں :۔

"اس کے بعد میرا وہی وسوسہ جس نے ٹونک میں فیصلہ کا قالب

اختیار کیا تھا، سامنے آیا، معاشی ذرائع کے امکانات کا جائزہ لینے لگا، لیکن خلافِ توقع کافی مایوسیوں کا تجربہ ہونے لگا، حیدرآباد اس زمانہ میں وہ حیدرآباد نہ تھا جس میں جامعہ عثمانیہ جیسا طویل وعریض تعلیمی ادارہ قائم ہوا، تعلیمات کے اسکولوں کی تعداد بھی حد سے زیادہ ناکافی تھی، ان کی تنخواہیں بھی چالیس پچاس روپے سے زیادہ عموماً نہیں ہوا کرتی تھیں، مدرسہ نظامیہ جو میرے لئے سب سے زیادہ مناسب ہو سکتا تھا وہاں بھی غریب مولوی کو تقریباً معاشی لحاظ سے اسی حال میں پا رہا تھا، جس میں ہندوستان کے عربی مدارس کے معلمین مبتلاء تھے، البتہ ایک دار العلوم کالج تھا جس میں تنخواہوں کا معیار عام عربی مدارس سے قدرے بلند تھا، لیکن جہاں تک اندازہ ہوا اس کی حالت بھی "یک انار صد بیمار" سے زیادہ نہ تھی ..... بعض بہی خواہوں نے مشورہ دیا کہ حکومت حیدرآباد کے کسی انتظامی محکمہ میں داخل ہونے کی کوشش کیوں نہیں کرتے، انتہا ان مشوروں کی یہ تھی کہ ایک صاحب نے محکمۂ پولیس کے طرف بھی توجہ دلائی، اس وقت تک حیدرآباد میں وکالت کے لئے انگریزی یونیورسٹیوں کے سند یافتہ ہونے کی ضرورت نہ تھی، ایک راہ یہ بھی تھی، دوسری راہوں کے ساتھ یہ بھی پیش ہوتی رہی۔" (ایضاً ص ۲۲)

بعدِ جائزہ دل کا حال اس جائزہ اور مشوروں کے بعد مولانا کے ذہن وفکر کو چوٹ لگی وہ تو آئے تھے کہ کام تو درس وتدریس کا ہی ہو، مگر مشاہرہ ایسا ہو کہ آرام وعافیت کے ساتھ زندگی بسر ہو سکے، یا خاندان میں جیسے انگریزی پڑھنے والے ذرا صاف

ستھرے اور نوکر چاکر کے ساتھ رہتے ہیں، ان کے لئے بھی کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے، تاکہ وہ اپنے ہم چشموں میں حقیر نہ شمار ہوں۔

مگر یہاں تو مسئلہ ہی الگ سامنے آیا کہ جب تک لائن نہیں بدلتی بڑی تنخواہ حیدرآباد میں بھی گو مسلمان ریاست ہے نہیں مل سکتی ہے، مولانا گیلانی اپنے مزاج کے اعتبار سے دین اور علم دین کی خدمت سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں تھے کیوں کہ آخر بچپن سے اس وقت تک جس علم کے حاصل کرنے میں عمر کھپائی تھی، اسکا حاصل کیا ہوا، اور کیا حصہ میں آیا؟

پھر ذہنی کشمکش اس تجربہ کے بعد حیدرآباد کے قیام کے فیصلہ کو بدلنے کا ارادہ ہونے لگا، یہاں پہونچ کر مولانا پھر ذہنی کشمکش کے شکار ہو گئے اور بڑی الجھن میں پھنس گئے مولانا نے اپنے اس ارادہ کا تذکرہ ایک دن کسی موقعہ سے مہاراجہ کے سامنے بھی کیا مولانا لکھتے ہیں:۔

"یہ سننے کے ساتھ ہی کہ میں حیدرآباد سے جانا چاہتا ہوں، دیکھا کہ مہاراجہ نے عجیب طرح سے مجھے دیکھا، واپس ہونے کا فیصلہ شاید ان کے لئے کچھ عجیب تھا مجھ سے کہنے لگے آخر کیوں کیا بات ہے؟ اور اس کے ساتھ یہ بھی کہنے لگے کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ مولانا فضیلت جنگ کے یہاں سے اٹھ کر ہمارے یہاں چلے آؤ، پھر اصرار کرنے لگے کہ میں تم کو جانے نہ دوں گا، گرد و پیش کے مصاحبو نے کہنے لگے ان کے رہنے سہنے کا نظم فلاں مکان میں کر دیا جائے آخر میں یہاں تک بول اٹھے مولوی صاحب آپ اندازہ نہیں کر رہے ہیں کہ کون یہاں پر آپکو اپنے یہاں ٹھہرنے پر مجبور کر رہا ہے"۔

(رسالہ دارالعلوم شعبان ۱۳۷۴ھ ص ۳۲)

مگر مولانا برابر معذرت کرتے رہے، اخیر میں کہا کہ اپنے اساتذہ سے کچھ اور پڑھنا سیکھنا ہے، جس کا نظم حیدرآباد میں نہیں ہو سکتا، اس پر مہاراجہ نے کہا:۔

"حیدرآباد میں ارباب کمال کی کمی نہیں ہے، جس عالم سے جو کچھ پڑھنا چاہو گے، میں اس کا بندوبست کر دوں گا، سواری پر تم انکے یہاں چلے جانا، جو کچھ پڑھنا چاہتے ہو پڑھنا"۔ (ایضاً)

مہاراجہ کا ذہن مصاحبوں سے مہاراجہ نے مخاطب ہو کر مسکراتے ہوئے کہا، کہ مولوی صاحب پہلی مرتبہ وطن سے دور نکل آئے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے ان کا جی گھبرا گیا ہے، مولانا یہ سب سنتے رہے، مہاراجہ نے جو حصہ اپنی حویلی کا مولانا کے لئے منتخب کیا تھا، مولانا نے اس کو بھی چل پھر کر دیکھا، بڑے ٹھاٹ کے سامان اور راحت و عافیت کی چیزیں فراہم تھیں، سواری کا بھی انتظام تھا، جس وقت جہاں جی چاہے بآسانی جا آ سکتے ہیں۔

عقل و دل کی جنگ مہاراجہ کے یہاں سے اپنی قیام گاہ آکر مولانا سوچ میں پڑ گئے کیا کریں،؟ خود لکھتے ہیں:۔

"مہاراجہ کی باتوں کو سوچنے لگا، کش مکش کا عجیب حال تھا بیکسی کے اس عالم میں مہاراجہ جیسے آدمی کا مہربان ہو جانا، جو کچھ وہ کر سکتے تھے میری فلاح و بہبود کے لئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس میں کمی نہ کریں گے ــــــ ایک طرف یہ ساری باتیں تھیں اور دوسری طرف خیال آتا کہ دین کی تعلیم میں عمر کا اتنا بڑا حصہ جو صرف ہوا سیدنا شیخ الہند اور حضرت الاستاذ الکشمیری کے حلقہائے درس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کے سننے اور پڑھنے کا آخر انجام میرے لئے کیا یہی تھا، کہ ایک غیر مسلم امیر کی مصاحبت اور

ندیمی میں اپنی زندگی گذاروں گا، یہ خیال سامنے آتا اور معلوم ہوتا دنیا مجھ پر تاریک ہوگئی، مہاراجہ کی سرپرستی میں کسی محکمہ میں اچھی ملازمت بھی مل سکتی تھی، وکالت کا امتحان بھی دے سکتا تھا ——— نفس حیلے حوالوں کے حربے کے ساتھ سامنے کھڑا ہو جاتا، لیکن دل کہتا کہ پھر اس کا جواب کیا ہوگا، جب پوچھا جائیگا کہ کیا اسی لئے قرآن وحدیث کی تعلیم تجھے دی گئی تھی، مولانا انوار اللہ خان کی حویلی کے مغربی سمت کا وہ کمرہ اور اس کی زمین شہادت دے سکتی ہے کہ شاید رات بھر کروٹیں بدلتا رہا ——— ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت مجھے اس راہ سے ہٹانا چاہتی ہے، قبول کرنے والے نے مجھے ٹھکرا دیا ——— اس وقت ایک عجیب حال طاری تھا، انوار عزیب آنکھوں میں آنسو بھر لاتا، مجھے روتا دیکھکر وہ بھی روتا، میں کہتا انوار، کسی امیر کی گرمیٔ بزم میں اپنی ساری صلاحیتوں کی حرارت جھونک دوں، کیا یہ زندگی کی کوئی قیمت ہوئی، اس سے کہیں بہتر تھا کہ میں کچھ نہ پڑھتا، کسی گاؤں میں ہل جوتتا، کسی سڑک پر بیٹھکر جوتیاں گانٹھتا۔" (ایضاً ص ۳۴)

ذہنی کشمکش کا خاتمہ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا اس وقت جس دوراہے پر کھڑے تھے اور جس امتحان سے دوچار تھے، کس قدر سخت تھا، پوری رات کس بے چینی، تڑپ اور ذہنی کشمکش میں گذری، واقعہ ہے سونا آگ کی بھٹی میں تپ کر ہی خالص ہوتا اور نکھرتا ہے، جب تک اس منزل سے نہیں گذرتا قلب میں اخلاص، دماغ میں صفائی و بلندی اور مزاج میں حمیت و غیرت اُبھر کر نہیں آتی۔

مولانا لکھتے ہیں:۔

"صبح ہونے تک میری ذہنی کشمکش ختم ہوگئی، مولانا انوار اللہ خان کی خدمت میں حاضر ہوکر روانگی کی اجازت حاصل کرلی۔" (ایضاً ص ۳۵)

پیچھے کی طرف واپسی حیدرآباد جس دنیا کی طلب میں گئے تھے، خود دل و دماغ نے اس کے خلاف فیصلہ کیا، دنیا مل رہی تھی، مہاراجہ خوشامد کر رہا تھا، تمام توقعات کی تکمیل کا ایما ہو رہا تھا، مگر اس پر ذہن مطمئن نہ ہو سکا، اور پھر اسی تاریک مستقبل کے جنگلوں میں واپسی کا عزم کرلیا، جہاں سے نکل کر تابناک مستقبل کی تلاش میں حیدرآباد کی خاک چھانی تھی، اپنا خیال ہے یہ شیخ الہند کی کرامت تھی، اور دوسرے اساتذہ کی توجہات کا اثر، کہ دنیا کو لات مارنے پر آمادہ ہوگئے۔

مہاراجہ کی قدر افزائی حیدرآباد سے جس دن واپسی ہونے والی تھی، مہاراجہ کشن پرشاد نے پہلوان سخن ثاقب بدایونی کی معرفت اخراجاتِ سفر کے لئے ایک معقول رقم مولانا گیلانی کی خدمت میں بھجوائی، اور یہ پیغام بھی بھیجا۔

"مہاراجہ نے سلام کہا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے، مولوی صاحب کہدیجو کہ ان کا سفر خرچ ہے، نوعمری کی وجہ سے وہ گھبرا گئے ہیں کہدیجو گھر پہونچنے کے بعد جب دل و دماغ ٹھکانے ہو جائے تو بغیر کسی مخمصہ کے وہ میرے پاس چلے آئیں۔" (ایضاً)

مالی تنگی کے باوجود مہاراجہ کی رقم لینے سے انکار کر دیا، ثاقب نے سمجھایا کہ سفر میں آپ نکل رہے ہیں، پتہ نہیں کیا صورت پیش آئے یہ رقم آپ کی طلب اور خواہش کے بغیر آئی ہے، لینے میں تأمل نہ ہونا چاہئے، مہاراجہ سے جو تعلقات رہے ہیں، اس کا بھی تقاضا ہے، کہ ان کی دل شکنی نہ ہو، بہرحال اس تجربہ کار کی باتوں میں آکر وہ رقم قبول کرلی، اور شکریہ کا خط لکھ کر ثاقب صاحب کے

حوالہ کیا۔

حیدر آباد سے واپسی وہی حیدر آباد جہاں ٹونک کی مدرسی چھوڑ کر آئے تھے، آج وہاں سے واپسی ہو رہی ہے، اب غالباً ۱۳۳۳ھ شروع ہو چکا تھا، بلکہ کچھ مہینے بھی گذر گئے تھے۔

حیدر آباد اسٹیشن پہونچکر سوال پیدا ہوا، کہاں کا ٹکٹ لیا جائے، ذہن میں مولوی شاہ مقبول احمد کا نام آیا جن سے حیدر آباد آنے کے وقت ملاقات ہو چکی تھی وہ منماڑ کے پاس ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، مولانا نے اپنے شاگرد انوار سے کہا کہ منماڑ کا ٹکٹ لے لو آگے دیکھیں گے۔

منماڑ میں نزول اتفاق دیکھئے مولانا کی ٹرین جب منماڑ اسٹیشن پہونچی اور پلیٹ فارم پر اترے تو دفعۃً مولوی مقبول احمد نظر آئے، قدرت نے انھیں مولانا کے استقبال کے لئے پہلے سے غیر شعوری طور پر بھیج دیا تھا، دونوں ساتھیوں میں مصافحہ معانقہ ہوا، پوچھنے اور گفتگو کرنے سے معلوم ہوا کہ مولوی مقبول احمد صاحب اپنے مریدوں میں جا رہے ہیں اور اسی ارادے سے گھر سے نکل کر یہاں آئے ہیں۔

مولوی شاہ مقبول احمد صاحب نے عرض کیا کہ مناظر احسن صاحب! بڑا اچھا ہو آپ میرے ساتھ میرے حلقہ میں کچھ دنوں کے لئے تشریف لے چلیں، تفریح بھی ہو گی اور آپ کی تقریری صلاحیتوں سے مجھے فائدہ بھی ہو گا، اور اس فائدے میں ان شاء اللہ آپ کو یاد رکھا جائے گا۔ ہزار دو ہزار رقم کی امید بھی دلائی۔

ساتھی کے مرید آباد میں دنیا چھوڑ کر ہی حیدر آباد سے بھاگے تھے، اس لئے اسکا لالچ تو کیا رام کرتا، ہاں ساتھی کا خیال اور ساتھ ہی تفریح کے ارادہ نے مولانا کو تیار کر دیا، کہ کچھ وقت نکل جائے گا، ممکن ہے غم ہلکا ہو جائے، مولانا کے خادم و شاگرد مولوی انوار احمد بھی ساتھ تھے۔

مولانا لکھتے ہیں:۔

"اپنی پوری مولویانہ زندگی میں پندرہ بیس دن کا یہ سفر اور اس کے تجربات و مشاہدات میرے لئے عجیب تھے گجرات کے علاقہ میں سید مقبول کے آبائی مریدوں کی بستیاں تھیں، نواپورہ اور بردولی ان دو بستیوں کے نام یاد رہ گئے۔" (رمضان ۱۳۷۴ھ ص ۳۸)

یہ سفر بڑا دلچسپ رہا بڑی آؤ بھگت رہی، معتقدوں کا ہجوم بھی تھا، اور پیر صاحب کے نذرانے بھی بہت اچھے رہے، مریدین وعظ کے لئے بڑا اہتمام کرتے شامیانہ لگاتے، پھولوں سے اس کو سجایا جاتا، بردولی کے بعد راندیر بھی جانا ہوا وہاں بھی ان کے مریدوں کا اچھا خاصا حلقہ تھا، مختصر یہ کہ احترام و اکرام، خوش آمدید کہنے والوں اور استقبال کرنے والوں کی کمی نہیں تھی، گرما گرم مولانا کی تقریریں بھی ہر ہر آبادی میں خوب خوب ہوتیں۔

غیرت و حمیت کا بخار پندرہ بیس دنوں تک بڑے اطمینان و سکون کے ساتھ پیر مقبول صاحب کے مریدوں میں چکر لگاتے رہے، کہ دفعۃً پھر جی گھبرا گیا اور وہی دنیا گرفتی کا خیال آیا کہ دنیا نے اب تک نہیں چھوڑا بلکہ وہ جکڑ لینے پر آمادہ ہے۔

خود لکھتے ہیں:۔

"غیرت و حمیت کا بخار سا معلوم ہوا کہ مجھ پر چڑھا چلا جاتا ہے، اپنے آپ سے دل میں نفرت پیدا ہونے لگی، یہ اور اسی قسم کے خیالات کا ہجوم اس شدت کے ساتھ ہوا، کہ اپنے گشتی سفر کو قطعی طور پر ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا گیا، مولوی مقبول احمد صاحب کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ رات کا وقت تھا، شدت کے ساتھ ان کا انتظار کرتا رہا، جوں ہی وہ کمرہ میں داخل ہوئے بغیر کسی تمہید کے میں نے

ان کو مطلع کیا کہ بھائی! کل میں یہاں سے چلا جاؤں گا، اب آپ جانیں اور آپ کا کام، ان کا چہرہ فق ہوگیا، ——— میرے اصرار کو دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے ——— انھوں نے اپنی خصتانہ آمدنی سے کچھ دینا بھی چاہا لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی، مہاراجہ نے جو کچھ دیدیا تھا، وہی کافی تھا، اور اپنی زندگی کی یہ دوسری لغزش گاہ تھی جس پر پھسلنے کے بعد توفیقِ الٰہی نے ہاتھ پکڑ لیا۔"

(ایضاً ص۲۹)

مادرِ علمی کی کشش وہاں سے روانہ ہوکر مولانا احمد آباد ایک دن کے لئے اُترے، تاکہ سلاطین کی یادگاریں چل پھر کر دیکھ سکیں، جن کے دیکھنے کا مدت سے شوق تھا، وہاں مسجدوں، مقبروں کو دیکھ کر واپسی اس طرح ہوئی کہ، بقول مولانا:۔

"اس وقت تک اپنے مستقبل کی تلاش میں خود نکلا تھا، لیکن اب اپنی یہ واپسی اس فیصلہ کے ساتھ تھی کہ مستقبل ہی میرے سامنے جس شکل میں بھی آئے گا اسی کے ساتھ اپنے کو راضی رکھنے کی کوشش کروں گا، اور اِنَّ رَبِّیْ سَیَھْدِیْنِ کہتا ہوا احمد آباد سے ریل پر سوار ہوکر چلا ——— احمد آباد سے اِدھر اُدھر رُخ کئے بغیر یکسوئی کیسا تھا میں سیدھا دیوبند کی طرف روانہ ہوا، دیوبند میں کن حالات سے سابقہ ہوگا؟ ان سے قطعاً خالی الذہن ہوکر دارالعلوم کی طرف اس لئے بھاگا چلا آرہا تھا کہ وہ دیوبند کا دارالعلوم ہے جہاں اپنی متعلمی کے چند دن گذرے ہیں ——— میں نے حیدرآباد کو دل سے نکال دیا تھا، سرمایہ دار تاجروں کے اس علاقہ کو بھلا چکا تھا، جہاں تقریباً پندرہ دن تک ایک خاص قسم کی زندگی

گذارنے پر مجبور ہوا تھا، اب دل میں بھی صرف دیوبند تھا، اور دماغ میں بھی دیوبند تھا۔" (ایضاً ص۳۰)

دارالعلوم دیوبند میں آپ کو یاد ہوگا، دورۂ حدیث کے سال شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانی رح نے مولانا گیلانی سے ان کے وساوس کا تذکرہ سنکر فرمایا تھا جاؤ اب کبھی شکوک وشبہات نہ ہوں گے، اور کچھ پیشین گوئی بھی فرمائی تھی، مولانا کو دراصل اپنے استاذِ محترم کی، دعاؤں ہی نے ٹونک، حیدرآباد اور گجرات کہیں چین لینے نہیں دیا، دنیا آئی اور ساز و سامان کے ساتھ آئی، مگر غیبی مدد ہوتی رہی، اور سب سے متنفر ہوکر استاذ کے قدموں میں کشاں کشاں آرہے تھے اور اس مادرِ علمی کی گود بے تاب تھی جہاں درسِ حدیث میں کایا پلٹ ہوتی تھی، ورنہ یہ واپسی کسی اور توقع پر نہیں تھی، مولانا نے مہاراجہ حیدرآباد کا تذکرہ کرتے ہوئے بہت درست لکھا ہے۔

"ان (مہاراجہ) کا دربار میری حرص وہوس کی بھوک بجھانے کے لئے کافی تھا، ان کی طرف سے ایسے اشارے بھی مل چکے تھے... بغیر کسی تگ ودو اور جدوجہد کے میرے لئے کم ازکم اس قسم کی زندگی کی گنجائش نکل چکی تھی، ایک طرف یہ حال تھا، دوسری طرف خیال آتا کہ حیدرآباد سے واپسی کے بعد برطانوی ہند کے اسی علاقہ میں بھگتنا پڑے گا، جہاں کے باشندوں کے لئے ملّا کا وجود ناقابلِ برداشت بن چکا ہے، معاشی نقطہ نظر سے اندھیرا اور صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا، ——— اس تاریک مستقبل کے جنگل میں گھس پڑنے کا ارادہ کرہی لیا گیا۔" (ایضاً ص۳۱)

اسے دارالعلوم کی کرامت کے سوا کیا کہا جائے گا، کہ اس کا ایک فرزند

دنیاوی معاشی زندگی کی روشنی سے نکل کر تاریک مستقبل کی طرف کشاں کشاں بھاگا آرہا ہے، کسی منزل پر اس کا جی نہیں لگتا، یا پھر مولانا گیلانی کے لفظوں میں یہ کہا جائے کہ:-

"لیکن عالمِ اسباب کے لحاظ سے جہاں تک میرا اپنا احساس ہے دارالعلوم دیوبند کے ماحول اور تھوڑی بہت اس کی تربیت کا یہ قدرتی اثر تھا کہ ان دونوں لغزش گاہوں پر پھسلتے پھسلتے سنبھل گیا ——— اور یکسوئی کے ساتھ سیدھا دیوبند کی طرف روانہ ہوا۔"

(رسالہ دارالعلوم رمضان ۱۳۷۴ھ ص۴۰)

حکیم منظر حسن بہاری مولانا کے رفیقِ قدیم ابتک دارالعلوم میں ہی تھے، فارغ نہیں ہوئے تھے، مولانا دارالعلوم پہونچکر اُن کے مہمان بن گئے۔

قدرت کی کرشمہ سازی دیکھ رہے ہیں قدرت کی کرشمہ سازی، ایک مولوی اپنی عقل کی رہنمائی میں اتنا لمبا سفر کرتا ہے۔ اس کی قابلیت سے اچھے اچھے دولت مند متأثر ہوتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ ایسا عالمِ دین اس کی علمی مجلس کی رونق بن کر رہے وہ اسکو تمام اخراجات اور سامانِ راحت بھی پیش کرتا ہے جس کی اس کو ضرورت ہے، دنیا پوری دلربائی کے ساتھ اس کا ساتھ دینے پر دست بستہ کھڑی ہے مگر علمِ الٰہی کا شعور جونہی بیدار ہوتا ہے، ماضی کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگتی ہے، قال اللہ اور قال الرسول کی صدائے باز گشت اس کو جھنجھوڑ ڈالتی ہے۔ دفعۃً اس کا دل، اس کی عقل کے خلاف آمادۂ پیکار ہو جاتا ہے، اور وہ اپنے کو مجبور پاتا ہے کہ خدمتِ دینِ مبین کی طرف بے سوچے سمجھے چل پڑے

ربّ العالمین کا منشا تھا کہ مولانا گیلانی دنیا کے بجائے دینی ماحول اختیار کریں، اور اپنے کو تقدیر الٰہی کے حوالہ کر دیں، بالآخر یہی ہوا، حیدرآباد کی راحت کو چھوڑ دیا، اور مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند کی بہت معمولی زندگی اختیار

کرنے کے لئے دوڑ پڑے۔

پہلے سے نہ کوئی توقع ہے، نہ کوئی پیش کش، موہوم مستقبل کے نام پر واپسی ہوئی ہے، ظاہر؟ یہ بے عقلی کی بات کہی جائے گی، مگر مولانا کے سامنے جو مستقبل آیا، جیسا کہ آپ پڑھیں گے، یقین کرنا ہوگا مَن کانَ لِلّٰہ کانَ اللّٰہُ لہٗ۔ جو اپنے کو خدا کے سپرد کر دیتا ہے، اللہ اس کا ولی وحامی بن جاتا ہے۔ اور اس انسان کے مستقبل کو روشن کر دیتا ہے، دین ودنیا دونوں کی نعمتوں سے نوازتا ہے، اور اسے خواص وعوام میں مقبول بنا دیتا ہے۔

تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، مولانا گیلانی رح کے متعلق آپ پڑھیں گے، کہ رب العالمین نے انھیں تدریجًا کس طرح بڑھایا، علم وعمل کے اعتبار سے بھی، شہرت وناموری کے لحاظ سے بھی اور دنیاوی وجاہت کی راہ میں بھی دارالعلوم دیوبند ہی بظاہر ان کی ساری علمی عملی ترقیوں کا زینہ بنا، یہاں سے چل کر دوبارہ حیدرآباد پہونچے، اور جامعہ عثمانیہ کے استاذ دینیات بنے، اور پھر وہاں رہ کر دین اور دینی علوم کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔

دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس

مولانا گیلانی معاش کی فکر میں ٹونک گئے، مدرس ہوئے، پھر ترقی کے رجحانات نے ان کو حیدرآباد پہنچایا، تقدیر نے یاوری کی معاشی ترقی کی راہیں سامنے آئیں، اُسنے آواز دی، بلکہ خوشامد کی، مگر قدرت کو کچھ اور بنانا تھا، سب سے دست کش ہو کر دیوبند آگئے تفصیل آپ پڑھ چکے۔

یہاں آکر نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے، مزاج پرسی کے بعد مولانا عثمانی رح نے پوچھا، اتنے عرصہ کہاں رہے، مولانا گیلانی نے اجمالاً وہ سارا قصہ سنایا، جو آپ پہلے پڑھ چکے دارالعلوم نے خوش آمدید کہا| مولانا عثمانی رح بڑے مردم شناس، مردم ساز، اور علم نواز تھے، پہلے ہی ملاقات میں اپنے ادارہ کے اس ہونہار فرزند کو تسلی دی، اور بقول مولانا گیلانی۔

"اسی وقت اپنے اختیار خاص سے اتنا خود ہی کر دیا کہ طعام وقیام کے بارے سبکدوش ہو گیا، یعنی دس روپے ماہ وار میرے نام جاری فرمانے کا حکم یہ فرماتے ہوئے انھوں نے دیا کہ سردست کچھ درس و تدریس کا کام مدرسہ میں کرو --- اور القاسم اور الرشید مدرسہ سے نکلنے والے ان دونوں سالوں میں لکھتے رہو، آگے میں کوئی مستقل نظم تمہارے لئے کروں گا"

(ایضاً)

ماہانہ دس روپے | یہ وہی مناظر احسن گیلانی ہیں جو ٹونک مدرسہ خلیلیہ میں

مستقل مدرس ہو چکے تھے، جہاں ان کو بیس تیس روپے ماہانہ مل رہے تھے، پھر وہاں کی مدرسی چھوڑ کر حیدرآباد گئے، جہاں بڑی آو بھگت ہوئی دنیا بن سنور کر سامنے آئی، مگر حیدرآباد سے مہاراجہ کشن پرشاد کی سی شخصیت کی پیشکش کو رد کر کے دیوبند آئے ہوئے ہیں۔ اور بس دس روپے پر مگن اور خوش ہیں۔

مولانا گیلانی بغرضِ ملازمت دیوبند میں کب آئے کہیں کوئی وضاحت و صراحت نہیں ملتی، مگر القاسم دیوبند میں مولانا کے مضامین کا جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ۱۳۳۴ھ کے ماہ ربیع الاول میں تشریف لائے۔ کیوں کہ پہلا مضمون ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ میں ملتا ہے، اور اس کے بعد مسلسل مضامین کا سلسلہ ذی الحجہ ۱۳۳۵ھ تک چلا جاتا ہے۔

یہ طے ہے کہ ۱۳۳۲ھ کے ماہِ شعبان میں سالانہ امتحان ہوا، رمضان کی چھٹی بس وطن گئے، تین چار ماہ وطن میں گذرا، محرم ۱۳۳۳ھ یا اسی کے آس پاس ٹونک تشریف لے گئے، چار پانچ مہینے وہاں مدرسہ خلیلیہ میں درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ وہاں سے نکل کر حیدرآباد پہونچے، اور یہ پورا سال اسی سفر و سیاحت میں گذر گیا، ۱۳۳۴ھ کے ابتدائی مہینوں میں دیوبند واپس آئے۔

۱۳۳۴ھ کی رودادِ دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت معین المدرسین آپ کا نام ملتا ہے۔ مشاہرہ دس روپے ماہانہ درج ہے، مگر ساتھ ہی کیفیت کے خانہ میں یہ بھی درج ہے کہ صرف ایک ماہ کی تنخواہ پائی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں معین المدرسین کے نام سے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رح نے باختیار خصوصی تقرر کر دیا، پھر مشورہ کے بعد دس کے بجائے تیس روپے تنخواہ ہوئی جیسا کہ مولانا نے آپ بیتی میں لکھا ہے، چونکہ بحیثیت مدرس ایک نئے آدمی کو اتنی تنخواہ نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس لئے کسی اور

مدے مولانا کو یہ تنخواہ ملتی رہی، کیوں کہ روداد دارالعلوم ۱۳۲۵ھ میں ملازمین کے خانے میں مولانا مناظر احسن گیلانی کا نام نہیں ملتا — ذی قعدہ ۱۳۲۴ھ کے القاسم میں مولانا کے نام کے ساتھ "مدون" کا لفظ ملتا ہے، جو مرتب کے قائم مقام ہے۔ اور ذی الحجہ ۱۳۲۴ھ کے القاسم سے اداریہ بعنوان "نبذات" بھی کئی ماہ تک مولانا کے قلم سے لکھا ہوا موجود ہے۔

دس سے تیس روپے ماہانہ یہ ایک ضمنی بات تھی، عرض یہ کیا جارہا تھا کہ مولانا گیلانی گھوم پھر کر دارالعلوم دیوبند آ گئے، اور مولانا عثمانی رح نے انھیں خوش آمدید کہا اور بلا تاخیر دس روپے ماہانہ جاری کر دیا اور کام بھی حوالہ کر دیا، اور مولانا مفوضہ خدمات بخوشی انجام دینے لگے، پڑھاتے بھی تھے، اور القاسم والرشید کی ترتیب و تزئین کی خدمت بھی انجام دیتے تھے، گو ٹائٹل پر اس حیثیت سے نام کسی اور کا ہوتا تھا، مولانا لکھتے ہیں:۔

"بس اتنا یاد رہ گیا ہے کہ دس روپے ماہوار کی یہ تنخواہ صرف ایک ماہ مجھے ملی، اس کے بعد مدرسہ میں باضابطہ ملازمت کا آغاز تیس روپے ماہوار سے شروع ہوا، جو دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے طے کیا تھا۔" (رسالہ دارالعلوم رمضان ۱۳۷۰ھ ص۴۱)

اس تنخواہ کے سلسلے میں مولانا رقم طراز ہیں:۔

"دارالعلوم کے باہر تیس کا وزن کچھ ہی ہو، لیکن دارالعلوم کے احاطہ میں مجھ جیسے نو آموز کے لئے شاید یہ کافی امتیاز تھا، — اس تنخواہ سے کامل طور پر اگر مطمئن نہیں تو چنداں غیر مطمئن بھی نہ تھا (ایضاً)

حضرت کشمیری کی نظر میں تیس روپے ماہوار تنخواہ غالباً محدث العصر حضرت کشمیری کی سفارش پر ہوئی، جیسا کہ خود مولانا گیلانی نے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کے

حوالہ سے لکھا ہے، کہ مولانا عثمانی ایک دن فرمانے لگے۔

"بھائی مولانا انور شاہ صاحب تم سے تو غیر معمولی طور پر متأثر نظر آتے ہیں، تمھاری درخواست جب پہونچی تو میں نے شاہ صاحب سے اس مسئلہ میں مشورہ کیا، جواب میں انھوں نے کہا کہ آپ کے یہاں جتنے کام کرنے والے ہیں، ان کو دیکھتا ہوں کہ جو درس دیتے ہیں وہ تحریر کا کام نہیں کرتے، یا نہیں کر سکتے — جو تحریری سلیقہ رکھتے ہیں ان سے آپ تقریر و وعظ کا کام نہیں لے سکتے، الغرض ان تینوں شعبوں، یعنی درس اور تحریر و تقریر کے لئے، اسی وجہ سے آپ کو الگ الگ آدمی رکھنے پڑتے ہیں، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ اس غریب سے رسالہ کی ادارت و تحریر کا کام بھی آپ لیتے رہے، درس و تدریس کا کام بھی اسکے سپرد کرتے رہے، جہاں سے طلبی آئی وعظ و تقریر کے لئے بھی بھیجتے رہے، گویا تینوں شعبوں کا کام حسب دل خواہ وہ تنہا انجام دیتا رہا، اب اگر ان تینوں مدوں کے سلسلے میں — ایک ایک آدمی کی تنخواہ اسے دی جائے تو شاید اس کا یہ ناجائز مطالبہ نہ ہوگا۔" (دارالعلوم محرم ۱۳۷۲ھ)

استاذ کی توجہ سے خود اعتمادی استاذ کو اپنے ہونہار شاگرد کا بہت خیال ہوتا ہے، چونکہ حضرت شاہ صاحب نے داخلہ کا امتحان لیا تھا، اور اپنے شاگرد کے جوابات سے خوش ہوئے تھے، پھر سال بھر دورۂ حدیث میں شاگرد حاضر رہا، درمیان درمیان میں جہاں سوالات کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی سوال بھی اثنائے درس میں کرتا تھا، ان سب سے اندازہ ہو گیا تھا کہ آگے

چل کر ابھرے گا، خود مولانا گیلانیؒ کو علمی لائن سے جو عقیدت حضرت کشمیریؒ سے تھی اس کا اندازہ "احاطۂ دار العلوم میں بیتے ہوئے دن" کے پڑھنے سے ہوتا ہے، اس لئے حضرت کشمیریؒ کا مشورہ بہت مناسب تھا، اور سچ پوچھئے تو یہیں سے مولانا گیلانی میں خود اعتمادی پیدا ہوئی۔

تیس روپے مشاہرہ ہو جانے کے بعد مولانا گیلانی اپنی مفوضہ خدمات محنت سے انجام دینے لگے، درس و تدریس کی خدمات بھی انجام دیتے، دونوں رسائل القاسم والرشید کے مضامین کی ترتیب اور مضامین کی کمی کی تکمیل کا فریضہ بھی انجام دیتے، کہیں دیہات یا آس پاس سے واعظ کی طلبی آتی تو وہاں بھی بھیجدیئے جاتے تھے، اور جا کر تقریر کر آتے، گویا مدرس بھی تھے، مبلغ بھی اور رسالہ کے مدیر بھی۔

دیو بند سے بہار کچھ مہینوں کے بعد وطن جانے کی ضرورت پیش آئی، رخصت لیکر گیلانی پہنچے، گیلانی میں کچھ دنوں رہے وہیں دار العلوم کے ایک قدیم فارغ مولوی سید علی عظیم سے ملاقات ہوئی، وہ ایک اسکیم ساز بلکہ بقول مولانا اسکیم باز تھے، علمی و دینی خدمات کے لمبے لمبے پروگرام بنا رکھے تھے، انھوں نے بہکایا کہ وہ بہار میں رہ کر علم دین کی خدمت انجام دیں، دار العلوم کے لئے آدمیوں کی کمی نہیں ہے، مگر بہار کو آدمی نہیں ملتا ہے، مولانا اس کے چکر میں آ گئے، اور غالباً قرب وطن کی وجہ سے آ گئے۔

مونگیر میں مولانا گیلانی اس سلسلہ میں سب سے پہلے خانقاہ رحمانی مونگیر حاضر ہوئے، جہاں قطب العالم بانیٔ ندوۃ العلماء لکھنؤ، حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری بقید حیات تھے، ان کی گفتگو اور مشوروں سے اندازہ ہوا کہ آپ بھی سید علی عظیم کی رائے کی تائید میں ہیں، گو کھل کر کچھ نہیں فرمایا، البتہ ضرورت کا اظہار فرمایا۔

مولانا نے اس کا تذکرہ ایک مضمون میں خود کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"اب میں دار العلوم دیو بند سے حدیث کی صرف سند لیکر نہیں بلکہ دیو بند میں درس و وعظ کے ساتھ ساتھ القاسم والرشید، مدرسے کے دو پرچوں کی ادارت کی خدمت کرنے کے بعد بہار واپس لوٹا۔ حضرت مولانا محمد علی صاحب قبلہ رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ مونگیر میرا مرکز قرار پایا، اس وقت دلی کی جمعیۃ العلماء کا خواب بھی نہ دیکھا گیا تھا، طے ہوا کہ صوبہ بہار کے علماء کو پہلے ایک نقطہ پر متحد کیا جائے ــــ صوبہ کی جمعیۃ کے پہلے اجلاس کے لئے قصبہ بہار شریف کا انتخاب عمل میں آیا، مونگیر کی خانقاہ کی طرف سے جمعیۃ کی شرکت کے لئے خاکسار بھیجا گیا۔" (حیاتِ سجاد ص۱۵)

مولانا دیو بند سے ایک ماہ کی رخصت پر آئے تھے، مونگیر میں تین مہینے رہ گئے۔

دیو بند سے طلبی مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے دیر کی وجہ دریافت فرمائی تو پہلے لیت و لعل سے کام لیتے رہے، پھر مجبور ہو کر لکھا کہ کچھ لوگوں کا ایسا مشورہ ہے کہ بہار ہی میں رہ کر خدمتِ دین کرو، لہٰذا اگر آں محترم کی اجازت ہو تو یہاں رہ جاؤں، ساتھ ہی بعض کاموں کا پروگرام بھی لکھ کر بھیجا۔

مولانا عثمانیؒ نے جواب میں تحریر فرمایا یہ سب قصے تمھاری ناتجربہ کاری اور جوشِ جوانی کے ہیں، تمھارے لئے مناسب یہی ہے کہ دار العلوم آجاؤ، جن کاموں کا تم نے ذکر کیا ہے، ان کے لئے دار العلوم سے زیادہ بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ یہاں دار العلوم کا وسیع کتب خانہ ہے، اس کا رسالہ القاسم اور الرشید ہے پریس ہے، تم چاہو گے تو یہ تمھارے حوالہ کر دیا جائے گا، آدمیوں کی ضرورت ہوگی

تو یہاں کے فضلار میں سے ان کا انتخاب کر کے رکھ لیا جائے گا۔

رہا مشاہرہ، تو یہاں جو معیار ہے وہ زمانہ کے اعتبار سے پست ہے، مگر تمھارے لئے طے کر دیا گیا ہے کہ تم کو تیس کے بجائے اب دارالعلوم پچاس دیگا۔

بہار سے دیوبند ادھر تین چار مہینے بہار میں رہ کر کاموں کا تھوڑا بہت تجربہ بھی ہو چکا تھا کہ یہ صوبہ اپنے یہاں کے علمار کے حق میں کتنا بخیل اور قدر ناشناس ہے۔ باتیں بنانے والوں کی کمی نہیں، مگر وقت پر کوئی ساتھ دینے کے لئے آمادہ نظر نہیں آتا ہے حوصلہ افزائی کرنے والوں کی بہت کمی ہے، تنقید کرنے والے البتہ بہت زیادہ ہیں مولانا عثمانی رح کے خط نے قیام بہار کے پہلے ارادہ کو مضمحل کر ڈالا۔ بہار میں رہنے کا عزم کمزور پڑ گیا۔ اور فیصلہ کرنا پڑا کہ بہار چھوڑ کر پھر دیوبند کا ہی قصد کرنا بہتر رہے گا، پھر مولانا عثمانی ایک تجربہ کار عالم دین ہیں، انھوں نے جو کچھ لکھا ہے بجا ہے ہوا بھی یہی کہ بہار سے بستر باندھ کر پھر دارالعلوم پہونچ گئے، اور مولانا عثمانی کی خدمت میں حاضر ہو گئے، مولانا عثمانی نے سارا انتظام حسب وعدہ کر دیا اور مولانا گیلانی نے اپنا کام شروع کر دیا۔

کلکتہ میں توہین رسولؐ کا حادثہ لیکن قدرت کو دارالعلوم میں آپ کا قیام شاید اب منظور نہ تھا، ابھی ایک مہینہ ہی گذرا تھا کہ بقول مولانا گیلانی:۔

"اچانک کلکتہ میں ہنگامہ شروع ہوا، مختصر یہ ہے کہ "ڈیلی نیوز" نامی غالباً کوئی انگریزی اخبار تھا جس میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض ناسزا الفاظ ...... شائع ہوتے، کلکتہ کے مسلمانوں میں غم اور غصہ کی لہر دوڑ گئی، بات بڑھتی ہی چلی گئی، تا آنکہ کل ہند پیمانے پر فیصلہ کیا گیا کہ باضابطہ ایک مجلس ہی بنائی جائے جس کا مقصد ہی یہ ہو کہ اس قسم کی بے ادبیوں کی راہ ہمیشہ کیلئے مسدود ہو جائے

کلکتہ میں ارادہ کیا گیا کہ سارے ہندوستان سے علمار کو طلب کر کے ایک اجتماعِ عظیم کیا جائے، اور حکومت سے مطالبہ کیا جائے کہ آئندہ اس قسم کی ناہمواریوں کے انسداد کی وہ ضمانت لے"۔

(رسالہ دارالعلوم دیوبند اگست ۵۵ ۱۹ء)

دیوبند سے کلکتہ یہ برطانوی حکومت کا دور تھا اور اُس وقت ملک میں سیاسی طوفان کا زور ہو رہا تھا، کہ یہ نئی آندھی اُٹھی، کلکتہ مسلمان تاجروں کا اچھا خاصا مرکز تھا، وہاں سے مہتمم دارالعلوم کے نام مسلمانان کلکتہ کی درخواست پہونچی کہ دارالعلوم سے کافی علمار تشریف لائیں، اور سارے ذمہ دار حضرات بھی زحمتِ سفر برداشت کریں، دارالعلوم نے اس درخواست پر غور کر کے فیصلہ کیا کہ حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم، حضرت العلامہ انور شاہ کشمیری صدر المدرسین چند دیگر علمار اور ان کے ساتھ مولانا گیلانی پر مشتمل ایک وفد کلکتہ جائے، اس کی تاریخ وغیرہ طے کر دی گئی، اور کلکتہ اطلاع بھیجدی کہ وفد فلاں تاریخ میں ان شاراللہ پہنچے گا۔ اس کے مطابق دیوبند سے کلکتہ کے لئے علمار دیوبند کا وفد روانہ ہوا، الٰہ آباد ٹرین پہونچی تو دیکھا گیا کہ اسٹیشن ماسٹر مولانا حافظ محمد احمد صاحب کا نام لے لے کر ہر ڈبے میں پوچھ رہا ہے کہ کیا وہ تشریف رکھتے ہیں، ان کے نام کلکتہ سے ایک تار میرے پتے سے آیا ہوا ہے، جب وہ اس ڈبے کے پاس پہنچا جس میں یہ سارے بزرگ بیٹھے ہوئے تھے، تو اسٹیشن ماسٹر نے معلوم کر کے وہ تار مہتمم صاحب کے حوالہ کیا اور تار کا ترجمہ بھی سنا دیا کہ اسمیں لکھا ہوا ہے کہ آپ لوگ واپس ہو جائیں، کلکتہ کی حالت حد سے زیادہ نازک ہوتی چلی جا رہی ہے، تفصیل خط سے معلوم ہوگی۔

یہ سننا تھا کہ سارے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے، سامان اتارا جانے لگا، مولانا عثمانی نے فرمایا کہ سب اتر جائیں مگر مولوی مناظر احسن اسی ٹرین سے کلکتہ

جائیں، اور وہاں جلسہ میں تقریر کی ضرورت ہو تو شریک ہو کر تقریر کریں، اور حالات سے مطلع کریں۔

پٹنہ میں چھوٹے بھائی کا اصرار چنانچہ سب اُتر گئے، مولانا گیلانی تنہا رہ گئے۔ بالکل جوان العمر، لمبا کرتا، اور دو پلی ٹوپی سر پر، ٹرین سے نہیں اُترے، انھوں نے دیوبند سے روانہ ہوتے ہوئے اپنے چھوٹے بھائی مکارم احسن کو تار کے ذریعہ اطلاع کر دی تھی کہ فلاں ٹرین سے پٹنہ ہوتے ہوئے کلکتہ وفد جا رہا ہے، میں بھی شریک ہوں، پٹنہ اسٹیشن پر ملنے کی کوشش کرنا۔

ٹرین جب پٹنہ پہونچی، تو دیکھا کہ مکارم میاں موجود ہیں، وہ مولانا سے مصر ہوئے کہ بھائی جان آپ بھی یہیں اتر جائیں، کلکتہ کا حال اچھا نہیں ہے بڑا نازک ہے، مولانا گیلانی مصر تھے کہ بہر حال جانا ہے، بھائی نے دامن پکڑ کر چاہا کہ مولانا کو نیچے اُتار لیں، مگر ان کے ہاتھ کو جھٹک دیا، ٹرین نے سیٹی دی اور روانہ ہو گئی، وہ حسرت و افسوس سے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔

اس وقت کا حال مولانا لکھتے ہیں:۔

"اب بھی اپنے اس ایمانی حال کو جب یاد کرتا ہوں — سمجھ میں نہیں آتا میں کیا تھا اور کیا ہو گیا، حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا مشہور شعر ؎

فان ابی و والدتی و عرضی
لعرض محمد منکم فداء

اسی ڈبہ میں جس میں میرے سوا کوئی نہ تھا پڑھتا جاتا تھا اور روتا جاتا تھا، سرمستی و وارفتگی کے انہی خیالات میں ہوڑہ اسٹیشن پر میل مجھے لے کر پہونچ گیا، اسٹیشن استقبال کرنیوالے مسلمانوں سے بھرا ہوا تھا، یقین تھا کہ آج دارالعلوم دیوبند مسلّم کلکتہ منتقل ہو کر چلا آ رہا ہے، —— ہر طرح کے لوگ موجود تھے ٹھہرنے کے ساتھ ہی لوگ پنجاب میل پر ٹوٹ پڑے، لیکن علماء کا کسی ڈبہ میں پتہ نہ چلا، شور برپا ہو گیا، فقیر تنہا کس مپرسی کے عالم میں پلیٹ فارم پر اُترا، اور اطلاع دی کہ دیوبند کے علماء آپ لوگوں کا تار پا کر الٰہ آباد سے واپس ہو گئے، صرف اس فقیر کو اجازت دی گئی ہے وہ حاضر ہو گیا ہے۔" (ایضاً ص۴۳)

کلکتہ کے مسلمانوں کا حال ہر شخص کو حیرت تھی کہ ایسا تار کس نے دیا، اور کس کے مشورے سے دیا، مگر کچھ پتہ نہ چلا، مولانا گیلانی کو آنریبل مولوی عبدالرحیم اپنی کار پر بٹھا کر اپنی کوٹھی میں لے گئے، جہاں تمام علماء کے قیام کا انتظام تھا عام لوگوں پر مایوسی طاری تھی، کہ علماء کا وفد نہیں آیا، راستہ سے تار کیوجہ سے واپس ہوا۔

مولانا کا بیان ہے کہ میں جب وہاں تنہا رہ گیا، ایک صاحب تشریف لائے جن کا نام عبدالصمد تھا، وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر بولے، تار میں نے دیا تھا مگر میرے نام کا تذکرہ کسی سے آپ ہرگز نہ کریں، ورنہ عوام میری دھجیاں اڑا دیں گے حالات کی نزاکت کا تقاضا یہی تھا جو کیا گیا، یہ بھی مولانا سے عرض کیا کہ آپ میرے یہاں آ جائیں انھوں نے صاحب خانہ سے اس کی اجازت بھی لے لی۔ مولانا وہاں چلے گئے، مولانا کا بیان ہے۔

"حکومت اور مسلمانوں کے درمیان کش مکش آخری نقطہ تک پہونچ چکی تھی، مسلمانوں کی جماعت جلسہ کرنے پر اصرار کر رہی تھی، حکومت بزور اس کو روکنا چاہتی تھی، بات بڑھتی جارہی

تھی، اسی دن یا دوسرے دن زکریا کی مشہور مسجد میں مسلمانوں پر گولیاں بھی چلا دی گئیں، کافی مسلمان شہید بھی ہوئے — اور زخمیوں کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ میرا حال یہ تھا کہ حاجی عبد الصمد سے بار بار کہتا کہ مجھے چھوڑ دیجئے، مسلمانوں کے ساتھ ہنگامہ میں شریک ہو جاتا ہوں، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت پر مسلمان اپنا خون بہا رہے ہیں، میرا خون آخر کہاں کا قیمتی ہے؟ حاجی صاحب کو اندیشہ ہوا کہ اپنا دماغی توازن میں کھو چکا ہوں... مخالفت نہیں کرتے بلکہ کہتے ہاں مولانا میں بھی چلتا ہوں، بعض باتوں کا انتظار ہے۔" (ایضاً ص۴۴)

بہاری رفقاء کی قید میں انہی حالات سے مولانا دوچار تھے کہ بہار کے بعض انگریزی خواں طلبہ مولانا کو ڈھونڈتے ہوئے حاجی عبد الصمد صاحب کے یہاں پہونچے، دیکھا تو واقعی ان کا حال دیگر گوں ہے، انھوں نے کہا، اچھا چلئے جلسہ گاہ تک پہونچاتا ہوں، موٹر پر بٹھایا۔ اور چل پڑے اور کلکتہ کے ایک کنارے والے محلہ میں پہونچے، اور ایک مکان میں مولانا کو داخل کر کے کہنے لگے، اب آپ اس احاطے سے باہر نہیں جا سکتے، گویا انھوں نے اپنا قیدی بنا لیا، اور پوری نگرانی کرنے لگے، یہاں صباح الدین عبد الرحمان صاحب نے تھوڑی تفصیل دی ہے وہ لکھتے ہیں:

"اس زمانہ میں کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار "انڈین ڈیلی نیوز" نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں کوئی گستاخانہ تحریر شائع کی تو علماء کی ایک جماعت کلکتہ پہونچی، جس میں مولانا گیلانی بھی تھے، ان کی دینی حمیت اور ایمانی غیرت اس قدر جوش میں

آئی، کہ شاتم رسول اور اس کے ہم مذہبوں کے خلاف فتویٰ دیدیا کلکتہ کے ایک دوسرے اخبار "اسٹیٹس مین" نے ایک افتتاحیہ لکھ کر حکومت کو ان کے خلاف ابھارا، اور گرفتاریاں شروع ہو گئیں، مولانا کے دوستوں اور ہم وطنوں نے انکو کلکتہ چھوڑنے پر مجبور کیا، اور وہ زبردستی بمبئی اور مدراس کے راستے سے دیوبند روانہ کر دیئے گئے، مگر راستہ میں بقرعید کا چاند دیکھ کر حیدرآباد میں اُتر پڑے۔" (معارف اعظم گڑھ ماہ اپریل ۱۹۵۷ء)

مولانا گیلانی لکھتے ہیں کہ کئی دن دوستوں کی قید میں رہا، وہ سب اخبار پڑھ کر حالات بتاتے تھے کہ ہندو مسلم فساد چھڑ گیا ہے، جہاں کسی کو تنہا پاتے ہیں ایک دوسرے کو قتل کر ڈالتے ہیں، ٹرینوں میں بھی اس طرح کے خوں ریز واقعات پیش آ رہے ہیں، دوسرے پٹنہ اور گیا جانے والی ٹرین کے راستہ میں کوئی پل ٹوٹ گیا ہے اسلئے ٹرین کی آمد و رفت بند ہے۔

کلکتہ سے دیوبند کے لئے روانگی مولانا سے وعدہ لیا گیا کہ اگر وہ کلکتہ شہر میں داخل نہ ہوں تو ان کو دیوبند بھیجنے کا انتظام کیا جا سکتا ہے، مولانا نے وعدہ کر لیا، طے ہوا کہ ناگپور میل سے روانگی ہو، اور حیدرآباد جا کر دوسری ٹرین لیں اور وہاں سے دہلی ہو کر دیوبند پہونچیں، مولانا لکھتے ہیں۔

"بہاری طالب العلموں نے اسٹیشن پہونچا کر ٹکٹ لیا اور ناگپور میل میں بٹھا دیا۔ اور سمجھا دیا کہ راستہ میں جنکشن آئے گا، وہاں ٹرین بدل جائے گی، وہاں سکندرآباد، حیدرآباد والی گاڑی پر بیٹھ جانا، وہاں سے منماڑ ہو کر ... دیوبند پہونچ جاؤ گے، سوچا راہ میں حیدرآباد آئے گا، گذر جاؤں گا، لیکن جب گاڑی سکندرآباد

پہونچی، تب معلوم ہوا کہ کل اضحیٰ والی عید کا دن ہے، آپس میں لوگ اس کا چرچا کر رہے تھے، کیا عید میری اس سال کی ریل میں گذر جائے گی، جواب اس کا یہ ملا کہ اپنے ایک خاص عزیز مولوی سید محی الدین حیدر آبادی ہیں، ــــــ اس لئے عید کی نماز پڑھنے کی نیت کر کے حیدر آباد میں اُتر گیا، اور اسی عجیب و غریب وحشیانہ شکل و صورت کے ساتھ لنگی باندھے سید محی الدین کی قیام گاہ تک پہنچا، دیکھ کر پریشان ہوئے، میں نے قصہ سنایا کہ بھاگا ہوا کلکتہ سے دیو بند جا رہا ہوں، کل عید ہے اس لئے اتر گیا ہوں۔" (رسالہ دار العلوم اگست ۱۹۵۵ء صـ ۴۵)

حیدر آباد میں بقر عید اور پھر قیام ا یہ عید اضحیٰ ۱۳۳۵ھ کی تھی، جیسا کہ پہلے کے واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے، یہاں اُتر کر پھر مولانا حیدر آباد کے ہی ہو کر رہ گئے، دیو بند نہیں لوٹ سکے۔ خود مولانا نے لکھا ہے۔

"ایک دن کی جگہ تیس سال سے زیادہ مدت اسی حیدر آباد میں مجھے گذارنی پڑی، اور یہ تقدیر کا کرشمہ تھا کہ پانچ اور دس روپے کی تنخواہ سے جس کی معاشی زندگی شروع ہوئی وہی ہزار روپے ماہوار کی تنخواہ سے وظیفہ یاب ہو کر اب پھر اسی مستقر الی حین کی طرف واپس ہو گیا، جہاں کی مٹی سے اس نے سر نکالا تھا دار العلوم کے احاطہ سے جتنی جدائی، اس منزل پر ختم ہو جاتی ہے۔" (ایضاً)

قیام حیدر آباد ا حیدر آباد میں کیوں رہے، کیسے رہے، دیو بند واپسی کیوں نہ ہوئی؟ اس کی تھوڑی تفصیل صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کے مضمون میں

ملتی ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"راستے میں عید اضحیٰ کا چاند دیکھ کر حیدر آباد اُتر پڑے، وہاں مولانا حمید الدین فراہی سے ملاقات ہوئی، اس زمانہ میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہونے والی تھی، مولانا فراہی نے ان کو یونیورسٹی میں درخواست دینے کا مشورہ دیا، وہ دیو بند چھوڑنا نہیں چاہتے تھے لیکن خود دیو بند والوں نے ان کو یہ رائے دی کہ دکن میں دیو بند کے ایک عالم کا قیام دینی حیثیت سے مفید ہو گا۔ اس لئے انھوں نے درخواست دے دی، ان کا تقرر ایک سال تک یونیورسٹی میں نہ ہو سکا، اس درمیان میں وہ مولانا فراہی سے درس لیتے رہے، مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی صاحب اس زمانہ میں حیدر آباد کے صدر الصدور تھے، اور وہاں کے دینی و علمی سرگرمیوں کے مرکز تھے، مولانا فراہی، مولانا گیلانی کو ان کے پاس لے گئے، اور یہ کہا، ان کو بطور امانت آپ کے سپرد کرتا ہوں، شروانی صاحب نے فرمایا، "یہ امانت میرے پاس محفوظ رہے گی۔" ــــــ مولانا گیلانی اپنی ایک تحریر میں فرماتے ہیں ــــــ "اُن کے لطف و کرم کی موسلا دھار بارشوں کا سلسلہ اس ملاقات کے بعد شروع ہوا، وہ زندگی کے آخری دنوں تک برستا رہا، امانت کا پورا حق ادا کرنے والے نے ادا کر دیا۔" ــــــ حیدر آباد کے قیام کے زمانے میں یہ بیمار ہو گئے، شروانی صاحب ان کو اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے اور وہاں علاج کرایا، اس کے بعد وہ

اپنے وطن گیلانی چلے گئے، یہاں آنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی سے تقرر کا خط ملا، اور وہ ۱۹۲۰ء میں شعبۂ دینیات میں استاذ مقرر ہو گئے اور ۱۹۴۹ء میں اس شعبہ کے صدر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے، پانچ سو پنشن ملی۔"

(معارف اعظم گڈھ اپریل ۱۹۵۶ء)

مولانا فراہی کے درس میں | مولانا گیلانی استاذ مقرر ہونے سے پہلے مہینوں مولانا حمید الدین فراہی کے درس قرآن میں شریک ہو کر استفادہ کرتے رہے۔"

علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) نے مولانا فراہی کے قیام حیدرآباد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"اسی کے ساتھ درسِ قرآن کا ایک حلقہ قائم کیا، مغرب کے بعد یہ مجلس جمع ہوتی تھی، مولانا تقریر فرماتے تھے، لوگ شکوک پیش کرتے تھے، وہ جواب دیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد یہ مجلس ختم ہو جاتی تھی، ہمارے فاضل دوست مولانا ——— مناظر احسن گیلانی جو اس وقت جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر ہیں وہ اس مجلس کے خاص لوگوں میں تھے، ایک دو دفعہ مجھے بھی شرکت کا اتفاق ہوا۔" (حیاتِ حمید ص۱۸۵)

حکیم الامۃ تھانوی کی نظر میں علمی خدمات کے نام پر دارالعلوم دیوبند میں مولانا کا کوئی ڈیڑھ سال قیام رہا، اس عرصہ میں اسباق بھی پڑھانے پڑے، وعظ و تقریر کے لئے باہر بھی جانا پڑا، اور القاسم و الرشید میں مضامین بھی لکھتے رہے اسکا مطلب یہ ہوا کہ آپ ایک ذی استعداد مدرس بھی تھے، عمدہ مقرر بھی اور اچھے انشاء پرداز اور مقالہ نگار بھی، مولانا جس زمانہ میں مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ

پر مقالہ لکھ رہے تھے، تو حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ (م ۱۹۴۳ء) سرپرست دارالعلوم نے پیشین گوئی فرمائی تھی کہ یہ مضمون نگار یا تو محقق ہے اور اگر ابھی محقق نہیں ہے تو ان شاء اللہ آئندہ محقق بنے گا، مولانا گیلانی نے اسے خود بھی ایک جگہ نقل کیا ہے، لکھتے ہیں۔

"حکیم الامۃ مولانا اشرف علی التھانوی قدس سرہٗ گو فقیر کی شخصیت سے اس وقت تک ناواقف تھے، اپنے ایک خاص گرامی نامہ سے سرفراز فرمایا، یہ بھی ارقام فرمایا تھا کہ مقالہ نگار سے میں ذاتی طور پر واقف نہیں ہوں، لیکن اس مضمون کو دیکھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر وہ محقق نہیں ہو چکے ہیں تو محققیت متوقعہ کی دلیل ان کا یہ مضمون ضرور ہے۔"

(مقالاتِ احسانی ص۲۸۲)

مولانا کے مضامین کی ابتداء | مولانا گیلانی نے اپنا پہلا مضمون القاسم میں شیخ الہندؒ کی فرمائش پر "خیر الامم کا طغرائے امتیاز" کے عنوان سے زمانہ طالب العلمی میں جو لکھا تھا، وہ چھ قسطوں میں شائع ہوا، ذی قعدہ، ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ ——— ربیع الاوّل، جمادی الثانی، شوال، اور ذی قعدہ ۱۳۳۲ھ کے القاسم میں پڑھا اور دیکھا جا سکتا ہے۔

مولانا گیلانی نے لکھا ہے:

"کیا جانتا تھا کہ آئندہ اس "القاسم" کی ادارت سے اپنی علمی زندگی کی بسم اللہ ہو گی "خیر الامم کا طغرائے امتیاز" یہی پہلا مقالہ تھا جو ارشاد گرامی (حضرت شیخ الہندؒ) کی تعمیل میں لکھا گیا تھا، چند شمارے اس مضمون کے مسلسل القاسم میں

شائع ہوتے رہے۔"

(رسالہ دارالعلوم جمادی الاول ۱۳۷۲ھ)

لیکن جب ایک ڈیڑھ سال بعد دارالعلوم میں تقرر ہو گیا، اور القاسم والرشید حوالہ کیا گیا، تو پھر بہت سارے مضامین آپ نے لکھے، اور وہ شائع بھی ہوتے رہے، ——— خود لکھتے ہیں:۔

"پھر تو القاسم اور الرشید دارالعلوم سے شائع ہونیوالے دونوں مجلّوں کے ساتھ ایک ایسا رشتہ قائم ہوا کہ بسا اوقات دونوں رسالوں میں فقیر کے ہفوات کے سوا کچھ اور ہوتا ہی نہ تھا۔" ——— (ایضاً)

رسائل میں مضمون نویسی مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس زمانہ تک رسالوں میں مضامین لکھنا علماء علمی وقار کے کچھ مناسب نہیں سمجھتے تھے، حالانکہ اس کو ختم کرنے کے لئے القاسم والرشید میں حکیم الامت حضرت تھانوی رح، عارف باللہ مفتی عزیز الرحمٰن رح، شیخ التفسیر مولانا شبیر احمد عثمانی رح، حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی رح کے مضامین شائع ہوتے رہتے تھے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ جب مضامین فراہم نہ ہوتے، تو تنہا مولانا گیلانی رح تمام مضامین مختلف ناموں سے لکھ کر خانہ پُری کرتے اور اس کی ایک نئی ترکیب خود نکالی تھی ——— خود لکھتے ہیں:۔

زندہ مضمون نگاروں سے مایوس ہو کر ان لوگوں کے مضامین شائع کرنے لگا، جو دنیا میں موجود نہ تھے، پرانے فائل اٹھا کر ان رسالوں کو اٹھا کر دیکھئے مضمون نگاروں کی فہرست میں آپکو امام غزالی رح، امام رازی رح، شیخ ابن عربی، علامہ محمود آلوسی رح جیسے بزرگوں کے نام ملیں گے۔" (ایضاً)

رسالہ القاسم اور الرشید میں اوپر گذر چکا ہے کہ مولانا گیلانی رح حیدر آباد سے ۱۳۳۴ھ میں دارالعلوم دیوبند واپس آ گئے، اور معین المدرسین کی صف میں آپ کا حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رح نے تقرر کر دیا، درس و تدریس کا کام انجام دیتے رہے، پھر القاسم والرشید سپرد کیا کہ ان دونوں میں ترتیب مضامین کی خدمت بھی انجام دیا کرو، اور مضامین کی جب کمی رہ جائے تو خود لکھ کر پورا کرو۔

ترتیب رسائل القاسم والرشید کے فائل دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مولانا گیلانی نے ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ سے ان دونوں رسالوں میں پابندی سے اپنے مضامین دینا شروع کر دیا تھا، بلکہ القاسم میں فہرست مضامین کے اندر اپنے نام کے ساتھ انہوں نے "مدوّن" کا لفظ بھی لکھنا شروع کر دیا تھا، اور ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ سے القاسم میں اداریہ کیلئے "نبذات" کا عنوان بھی قائم کر دیا تھا گو یہ عنوان دو چار ماہ سے زیادہ باقی نہ رہا جیسا کہ رسالہ کی جلدوں سے معلوم ہوتا ہے۔

مضامین کی ابتداء دوبارہ واپسی کے بعد پہلا مضمون القاسم میں "دامغات الاغلوطات" (مغالطوں کا سر شکن) متعدد قسطوں میں لکھا اور شائع ہوا، یہ سلسلہ مضامین ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ سے شروع ہو کر صفر ۱۳۳۶ھ پر ختم ہو جاتا ہے، آخری مضمون آپ کا "یہودیوں کی سازش" کے عنوان سے ملتا ہے الرشید میں پہلا مضمون "السائل وعواقبہ (بھیک مانگنے والوں کا انجام)" کے عنوان سے شروع ہوا ہے، اور یہ بھی ذی قعدہ ۱۳۳۴ھ کے پرچہ سے شروع کیا گیا، اور رمضان ۱۳۳۵ھ میں آخری مضمون بعنوان "بابا رتن ہندی" پر ختم ہوا۔ بعض مضامین کی سات سات قسطیں شائع ہوئیں۔ حضرت ابوذر غفاری صحابی پر متعدد قسطوں میں لمبا مضمون آیا، جو بعد میں کتابی شکل میں شائع ہو کر مقبول عام و خاص ہوا، اسی طرح بابا رتن ہندی بھی لمبا مضمون ہے۔ یہ بھی کتابی

شکل میں چھپا۔

عنوانات مضامین | مولانا کا کوئی مضمون دو چار قسطوں سے کم میں غالباً شائع نہیں ہوا ہے، الّا ماشاءاللہ! مضامین سب عالمانہ اور کہنا چاہیے تحقیقی انداز کے ہیں، جس سے مولانا کی وسعتِ نظری اور وسیع مطالعہ کا یقین کرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے چند مقالات و مضامین کے عنوانات یہ ہیں۔

(۱) دامغات الاغلوطات (۲) شیخ ابنِ عربی اور مسئلہ اتحاد وصول (۳) قرآن کے طرزِ استدلال پر ایک سرسری نظر (۴) الشہب والقرآن (۵) واقعہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا (۶) توحید القرآن (۷) مسئلہ جذب وکشش پر ایک تنقیدی نظر (۸) اعجاز قرآنی (۹) مذہب کی ضرورت (۱۰) خوارقِ عادات کے وقوع پر یورپ کی بعض شہادتیں (۱۱) حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ (۱۲) جدید اصولِ فقہ (۱۳) یہودیوں کی سازش (۱۴) تنازل وعواقبہ (۱۵) جبر السیئات بالحسنات (۱۶) عمر الدنیا (۱۷) الریاضۃ الجسمانیہ (۱۸) تاثیر الکواکب (۱۹) حسن المعاملہ۔ (۲۰) طیب الہند (۲۱) تاثیر الادویہ (۲۲) خصال الفطرۃ (۲۳) اہل دنیا کی اصلاح (۲۴) کراماتِ اولیاء (۲۵) میرے خواب (۲۶) دیوان العرب یا حماسہ قاسمی (۲۷) نام ونسب اور کنیت پر اسلامی تعلیمات کا اثر (۲۸) اخلاف سے فائدہ حاصل کرنیکا جدید طریقہ (۲۹) عورتوں کی بیعت (۳۰) بابا رتن ہندی (۳۱) فیصلہ آسمانی در فتنہ قادیانی۔

سوا سال ڈیڑھ سال کی مدت میں درس وتدریس اور تبلیغ کے ساتھ آپنے اتنے متنوع مضامین ان دونوں رسالوں میں لکھے، اور ان کے علاوہ بھی بعض مضامین لکھنے کی نوبت آئی، مضامین پر بحث علوم ومعارف کے تحت ہوگی، اور اسوقت صحیح اندازہ ہوگا کہ مولانا نے کس قدر محنت کی، اور کس قدر ذہن رسا آپ کو قدرت

کی طرف سے عطا کیا گیا تھا۔

بعض مضامین کتابی صورت میں | ان مضامین سے دو لمبے مضمون ایک "حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ" اور دوسرا "بابا رتن ہندی"، کتابی صورت میں بہت پہلے شائع ہوچکے ہیں، اور ان دونوں کتابوں کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

اس وقت کا ماحول یہ اچھی طرح یاد رکھیں کہ جس زمانہ میں یہ مضامین لکھے جارہے تھے ملک آزاد نہیں ہوا تھا، یہاں انگریزوں کی حکومت تھی، اور کہنا چاہیے اس کا دورِ شباب تھا، اسلامیات پر خود مسلمان کی طرف سے طرح طرح کے اعتراضات ہورہے تھے۔ اور عیسائیت کا جو پروپیگنڈہ اسلام کے خلاف ہورہا تھا، اس سے غیر شعوری طور پر باشندگانِ ہند کافی متأثر نظر آتے تھے۔

لیکن دارالعلوم دیوبند اس وقت بھی ایک آزاد ادارہ تھا، اور اپنے خاص نہج پر کام میں مشغول تھا، حکومت وقت سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں تھی یہی وجہ ہے کہ جب کوئی مخالفت پر آتا تھا تو حکومت وقت کو یہ کہکر برانگیختہ کرنے کی سعی کرتا تھا کہ یہ ادارہ انگریز دشمنی کا قلعہ ہے، یہاں سے جو نکلتا ہے، انگریزی حکومت کی جڑوں پر کلہاڑا چلاتا ہے۔ جس طرح آزادی کے کچھ دنوں کے بعد بعض لوگوں نے یہ کہہ کر بدنام کرنے کی ناپاک سعی کی کہ یہ پاکستان نواز ہے۔ چنانچہ ابتدائے آزادی میں خانہ تلاشی بھی ہوئی،

حکومتِ وقت بھی کبھی دھمکی سے اور کبھی لالچ سے رام کرنیکی کوشش کرتی دارالعلوم دیوبند کے صدر المدرسین شیخ الہند جب حج کے لئے مکہ مکرمہ تشریف لے گئے، انگریزوں نے وہیں گرفتار کراکے مالٹا روانہ کردیا تھا، جہاں انھوں نے سوا تین سال کے لگ بھگ مصائب اور جلاوطنی کی زندگی گذاری، مگر آپکے صبر واستقامت میں ذرا فرق نہیں آیا۔ وہاں آپ کے ساتھ شیخ الاسلام

حضرت مدنیؒ اور حکیم نصرت حسین بھی نظر بند تھے۔

دار العلوم کی خدمت مگر بایں ہمہ دار العلوم دیوبند اسوقت عملاً سیاسی ہنگاموں سے بڑی حد تک الگ تھلگ تھا، اور قرآن وحدیث اور فقہ وکلام کی تعلیم اور اس کی اشاعت میں خاموشی کے ساتھ مشغول تھا، اور یہی وجہ تھی کہ اس کے فرزند دنیا بھر میں پھیل گئے گو یہ بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ فرزندانِ دار العلوم کی ایک جماعت انگریزی حکومت کے خلاف سینہ سپر تھی اور وہ آزادی کے لئے جدوجہد میں مصروف تھی۔ بلکہ دار العلوم کے ممتاز افراد واشخاص بھی انگریزی حکومت کے خلاف سرگرم عمل تھے۔ مگر اس طرح کہ انکی وجہ سے دار العلوم زیرِ عتاب نہ آسکے، اور تعلیم واشاعت دین کی خدمت زد میں نہ آنے پائے، علمی محاذ اپنا کام کر رہا تھا اور سیاسی محاذ اپنا کام الگ کر رہا تھا، علمی محاذ سے درس وتدریس، تصنیف وتالیف، تبلیغ ومناظرہ تقریر وتحریر اور تعمیرِ سیرت کا کام جاری تھا، اور سیاسی محاذ سے برطانوی مظالم کی روک تھام اور ملکی آزادی کی سرفروشانہ جدوجہد ہو رہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ القاسم والرشید میں کبھی کوئی سیاسی مضمون نہیں چھپتا تھا، بلکہ صرف دینی، علمی، اصلاحی اور معاشرتی مضامین ہوا کرتے تھے۔ تاکہ مخالفین کو کوئی موقع دار العلوم پر ہاتھ ڈالنے کا نہ مل سکے۔

مولانا گیلانی کی مدتِ ملازمت میں شیخ الہند مولانا محمود حسن عثمانیؒ حجازِ مقدس جاچکے تھے اور پھر وہیں سے گرفتار کر کے مالٹا پہنچا دیئے گئے تھے۔ صدارتِ تدریس پر محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیری فائز تھے، جو براہِ راست شیخ الہندؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے، اور ہندوستان میں ممتاز علمی حیثیت رکھتے تھے۔

مجلسِ شوریٰ دار العلوم کی رُکنیت

مولانا گیلانی عثمانیہ یونیورسٹی میں جب استاذ ہو گئے تو دار العلوم دیوبند کی آمدورفت تقریباً بند سی ہو گئی، مگر دکن میں مسلکِ دار العلوم کی اشاعت وتبلیغ اور اس کی حفاظت کے ذمہ دار کی حیثیت سے پھر بھی باقی رہے، اور اربابِ دار العلوم نے اسی وجہ سے آپکو مشورہ دیا تھا کہ اپنے ایک فاضل کا وہاں رہنا مناسب ہوگا گو خود شہر حیدرآباد میں بھی دار العلوم کے بعض فضلاء ہر زمانہ میں موجود رہے اور انہوں نے بھی مسلکِ دار العلوم کی اشاعت کا فریضہ ادا کیا۔ مگر مولانا گیلانی کی حیثیت ایک نمائندہ کی تھی، جس کی ذات پر پورا اعتماد تھا۔

مسلک دار العلوم کے مبلغ مگر یہ حقیقت ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں دار العلوم، اسکے اکابر واسلاف کو روشناس کرانے والی شخصیت اس دور میں تنہا مولانا کی ذات تھی، مولانا کے اثرات اہل شہر میں بھی تھے، اور حلقۂ یونیورسٹی میں بھی، اس طرح خود حضور نظام والیِ دکن بھی مولانا کے علم وفضل سے کافی متأثر تھے۔ مولانا کے شاگرد بتاتے ہیں کہ حضور نظام مولانا گیلانی کی تقریر چھپ کر سنا کرتے تھے اور خوش ہوتے تھے، جس کی طرف اوپر اشارہ گذر چکا ہے۔

اربابِ دار العلوم دیوبند نے بھی مولانا گیلانی کو کبھی فراموش نہیں کیا خط وکتابت ہوتی رہتی تھی، آپ کے اساتذہ میں سے جب کوئی حیدرآباد شہر میں پہونچتا تو آپ آگے آکر استقبال کرتے، اور اسکے تعارف میں جتنا کچھ کر سکتے تھے اس میں کمی نہیں کرتے تھے۔

مجلس شوریٰ اور اس کی رکنیت دار العلوم کی سب سے ذمہ دار باڈی مجلسِ شوریٰ

ہے، اور اس کے اراکین ہر دور میں ملک کے مشہور ترین صاحبِ فضل و کمال ہوئے، چونکہ دارالعلوم ایک بین الاقوامی مذہبی تعلیمی ادارہ ہے، اس لئے جو بھی ممبر شوریٰ منتخب ہوا، اس کی شہرت و مقبولیت میں اس سے اضافہ ہی ہوا، کوئی شبہ نہیں اس مجلس کی ممبری اس ملک کے دیندار طبقہ میں ایک بڑا اعزاز ہے۔

مولانا رکن شوریٰ کی حیثیت میں | ایک وقت آیا کہ اربابِ دارالعلوم نے مولانا گیلانی کو اس مجلس کا رکن بنا لینا مناسب سمجھا، چنانچہ ۱۸ رشوال ۱۳۴۸ھ مطابق ۲۰ رمارچ ۱۹۳۰ء کو جب کچھ جگہیں خالی ہوئیں تو مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، مولانا عبدالوہاب دربھنگوی کے ساتھ مولانا سید مناظر احسن گیلانی کو بھی مجلسِ شوریٰ کا باضابطہ رکن منتخب کیا گیا (دیکھیے رجسٹر کارروائی مجلس شوریٰ)

اس رکنیت کے بعد مولانا گیلانی کے لئے دارالعلوم اپنی مادرِ علمی میں حاضری کی ایک نئی صورت پیدا ہو گئی، سال میں شوریٰ کے عام طور پر دو اجلاس ہوا کرتے ہیں مولانا برابر ان اجلاسوں میں شریک ہوتے رہے، اور اپنے گرانقدر مشوروں سے دارالعلوم کی خدمت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

اخیر میں جب صحت خراب ہوئی تو لمبے سفر سے گھبرانے لگے، ۱۸ رمحرم ۱۳۶۵ھ کی مجلس شوریٰ میں مولانا کا خط آیا کہ بیمار ہوں، تو مجلس میں ان کے لئے دعائیں کی گئیں جو درج رجسٹر ہے۔ اس کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے مجلس میں آنا بند کر دیا۔

مجلس شوریٰ سے علیحدگی | مولانا گیلانی فرماتے ہیں کہ جب میں نے محسوس کیا شوریٰ میں چند مخصوص حضرات کی رائے پر ہی فیصلہ ہونے لگا ہے دوسروں کے مشوروں کی اہمیت ختم ہو گئی ہے، تو سوچا کہ آنے جانے کا کوئی فائدہ نہیں، کام چلنا چاہیے چل رہا ہے، لہٰذا میں نے آنا جانا بند کر دیا، دارالعلوم کی طرف سے خطوط لکھے گئے کہ کیوں تشریف نہیں لاتے، تو مولانا گیلانی نے کچھ لکھنا بھی مناسب نہیں جانا

خاموشی اختیار فرمالی۔

مجلس شوریٰ منعقدہ ۲۰ رشوال ۱۳۶۷ھ کی کارروائی میں درج ہے کہ پانچ ممبران سے خط و کتابت ہوئی، تین نے معذرت کا خط لکھا، کہ آنے سے معذور سمجھا جائے، اور دو نے کوئی جواب نہیں دیا۔

ان دو میں ایک مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا بھی نام ہے، لہٰذا مجلس نے ان پانچ ممبران کی جگہ دوسرے پانچ علماء کا نام تجویز کیا، اس طرح اس تاریخ سے ضابطہ کے تحت مولانا گیلانی مجلس شوریٰ کی رکنیت سے علیحدہ قرار دیئے گئے۔ اور ممبری کا رشتہ ختم ہو گیا، گویا مولانا کم و بیش بیس سال دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ کے باضابطہ ممبر رہے، مولانا گیلانی کے خطوط میں ہے۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ دیوبند علمی ادارہ نہیں ہے؟ یا فقیر نمائندہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، بہرحال سوال و جواب میں تو "تو بمن رسی من بخدا رسم" خیال تھا کہ اگر دیوبند جانا ہوا لیکن اب آں خیال بشکست و آں ارادہ نماند۔" (مکاتیب گیلانی ص ۲۴۳)

۱۶ ررجب ۱۳۶۲ھ کی شوریٰ آخری تھی جس میں مولانا گیلانی شریک ہوئے اس کے بعد پھر کبھی مجلس میں شرکت کی نوبت نہیں آئی، وجہ وہی ہے جو اوپر نقل ہو چکی پانچ سال بعد مجبوراً مولانا کا نام مجلس کی رکنیت سے ختم کیا گیا۔

حکیم الامۃ کی وفات کا اثر | اسی شوریٰ میں حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ کی وفات کی المناک خبر دارالعلوم پہونچی تھی، ۲۰ راگست ۱۹۴۳ء کے خط بنام حضرت العلامہ سید سلیمان ندوی رح میں مولانا لکھتے ہیں۔

" دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں شریک ہونے کے لئے دیوبند گیا تھا، کیا معلوم تھا کہ دیوبند کی مجلس ماتم میں شریک

ہونا میرے لئے مقدر ہو چکا ہے، جس وقت مجلسِ شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا، دارالعلوم میں جماعت دیوبند کے اس ستونِ اعظم کے انہدام کی خبر پہونچی۔"

یہ بھی تحریر فرمایا:۔

"خدا جانے آپ کہاں ہیں دلی کی گلیوں میں آپ کو ڈھونڈا، اس لئے ڈھونڈتا تھا کہ مل کر روؤں گا اس یتیمی پر جو باپ کے مرنے کے بعد پھر دہرا گئی۔"

تعزیتی جلسہ میں تقریر اس موقعہ سے دارالعلوم میں تعزیتی جلسہ ہوا، تو مولانا گیلانی نے بھی اس میں تقریر فرمائی تھی، اپنے خط میں اس کا تذکرہ بھی انھوں نے کیا ہے۔

"حضرتِ والا (تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ ــــــــــــــــ کے متعلق دارالعلوم دیوبند میں عندالتعزیت جو ارتجالی تقریر خاکسار نے کی تھی صدق میں نظر سے گزری۔"

(پورا خط ملاحظہ فرمائیں معارف اعظم گڈھ مارچ ۱۹۶۳ء)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت تھانوی رح کی وفات کے بعد دیوبند آنے میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی، چنانچہ اس کے بعد آنا جانا بند ہو گیا تھا، خاکسار کی ایک حاضری کے موقع سے مولانا گیلانی رح نے حضرت تھانوی رح کا ایک گرامی نامہ اپنے نام دکھلایا تھا، جس کو ایک کتاب میں چپکائے ہوئے تھے، فرمایا کہ کیا عجب ہے کہ یہ خط میری مغفرت کا وسیلہ بن جائے۔ ان شاء اللہ حضرت کا حسنِ ظن خالی نہ جائے گا، طاب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ۔

حضرت تھانویؒ سے عقیدت اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا گیلانی رح کو حضرت تھانویؒ سے بے حد عقیدت تھی، ان کے علم و فضل، زہد و تقویٰ کے بڑے قائل تھے، اور انکی

حیات کو ملک و ملت کے لئے غنیمت جانتے تھے، اسی مجلس میں مولانا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ "جامع المجددین" پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا اکبر آبادیؒ نے برہان میں حضرت تھانوی رح پر تنقید کی تو اس کو پڑھ کر میں نے ان کو لکھا کہ اسے بند کریں اور اس کی تلافی کریں، چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا، جس پر بڑی خوشی ہوئی۔ اس واقعہ کو بیان کر کے فرمایا۔ بزرگوں پر تنقید عموماً مضر ہوتی ہے۔ اس سے بچنا ضروری ہے، سمجھ میں آئے قبول کرو، نہ سمجھ میں آئے خاموش رہو۔

مولانا گیلانی رح کی اولیاء اللہ کی تاریخ پر بھی بڑی عمیق و وسیع نظر تھی، اور ان... اہل اللہ سے ملک و ملت کو جو فائدے پہونچے اس کے دل سے معترف تھے، وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی ذی علم ان پر بے جا تنقید کر کے اپنی آخرت برباد کرے

حدیث میں آیا ہے کہ اللہ والوں کو چھیڑنا رب العالمین کو پسند نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لئے وعید آئی ہے، یہ مولانا کی خوبی تھی کہ اگر وہ اپنے کسی جاننے والے سے کوئی لغزش محسوس کرتے، فوراً اس کو مطلع کرتے۔

حضرت گیلانی رح کو دارالعلوم دیوبند سے بڑی عقیدت و محبت تھی، ایک دفعہ فرمانے لگے میرا جی چاہتا ہے کہ تم دیوبند میں رہ کر کام کرتے، اس وقت میں دارالعلوم معینیہ سانخہ ضلع مونگیر میں صدر مدرس کی حیثیت سے کام کر رہا تھا میرے وہم میں بھی نہ تھا ایسا کبھی ہوگا، مگر جب میں ۳ / صفر ۱۳۷۶ھ کو ملازم ہو کر دیوبند آیا، اور اس وقت کے مہتمم حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب نے میرے مرشد شیخ الاسلام حضرت مدنی رح کے مشورہ سے میرا از خود تقرر فرمایا، تو مولانا کا وہ جملہ کانوں میں گونجنے لگا۔

حیدرآباد عثمانیہ یونیورسٹی میں علمی اور دینی خدمات

مولانا گیلانی رحمہ اللہ ۱۳۳۴ھ کے ابتدائی مہینوں میں دیوبند پہونچے تھے، کہ اپنی زندگی قال اللہ وقال الرسول کے غلغلوں میں گذاریں گے، یہاں دارالعلوم دیوبند میں مدرس اور ملازم بھی ہو گئے تھے، اور ذی الحجہ ۱۳۳۵ھ تک بحیثیت خادم تدریس وتبلیغ خدمت بھی انجام دی۔

مگر قسمت ان کو علوم جدیدہ کے ماحول میں خادم اسلام بنا کر پیش کرنا چاہتی تھی کلکتہ کا ہنگامہ اس کا ذریعہ بنا، اور وہاں سے براستہ حیدرآباد دیوبند کے لئے ہی روانہ ہوئے تھے ..... کہ تقدیر الٰہی نے حیدرآباد اترنے پر مجبور کر دیا، وہی حیدرآباد جس سے ڈیڑھ سال پہلے دامن جھٹک کر دیوبند آ گئے تھے۔

دیوبند سے پھر حیدرآباد اس کی اجمالی روداد پہلے گذر چکی ہے کہ دیوبند سے حیدرآباد منتقل ہونے کی کیا صورت پیش آئی، یہاں مولانا کے شاگرد رشید غلام محمد بی۔ اے کے قلم سے مزید وضاحت ملاحظہ فرمائیں، وہ لکھتے ہیں۔

"بات یہ ہوئی کہ ان دنوں جامعہ عثمانیہ کی روزافزوں وسعت وترقی کے ساتھ شعبۂ دینیات میں ایک ٹھوس عالم کی ضرورت محسوس کیجا رہی تھی، اتفاقاً ۱۹۱۹ء میں مولانا گیلانی کا حیدرآباد آنا ہوا۔ اور یہاں علامہ حمید الدین فراہی[1] سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ علامہ فراہی اس

[1] مولانا فراہی کے حالات کے لئے دیکھئے حیات حمید شائع کردہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ضلع اعظم گڈھ۔

جوہر قابل کو پہچان گئے، مولانا نے خواہش کی وہ لکچری کے لئے جامعہ میں درخواست دیں۔ مگر مولانا کو دیوبند سے اس قدر اُنس ہو گیا تھا کہ اس مشورہ کی تکمیل میں تامل ہی رہا۔ لیکن جب خود حضرات دیوبند نے اس مشورہ کی تائید فرمائی تو مولانا کو اس کی تعمیل کرنا پڑی اور ۱۹۲۰ء میں بحیثیت لکچرر "دینیات لازم" جامعہ عثمانیہ سے متعلق ہو گئے، پھر عرصہ کے بعد شعبۂ دینیات میں منتقل ... کئے گئے پھر ریڈرر ہے، اور پروفیسر ہوئے، اور بالآخر اس شعبہ کی صدارت کو کئی سال تک زینت بخش کر ۱۹۴۹ء میں ریٹائر ہو گئے، وہ شعبہ کی جان تھے اور شعبۂ دینیات ان کا مجسم ارمان ہے"

(مقدمہ مقالاتِ احسانی ص۷)

قیام عثمانیہ یونیورسٹی اوپر گذر چکا ہے کہ حیدرآباد میں سب سے نمایاں سرکاری مدرسہ دارالعلوم کے نام سے قائم تھا، جو ریاست کے مختلف شعبوں میں کام کرنے کیلئے آدمی تیار کرتا تھا، اور جس کے مدرسین کی تنخواہوں کا معیار بلند تھا، اخیر میں اس کے پرنسپل حضرت مولانا حمید الدین فراہی (م ۱۳۴۹ھ) تھے۔ یہی دارالعلوم مولانا حمید الدین فراہی کی تحریک وتخییل اور بابائے اردو مولانا عبد الحق اور دوسرے لوگوں کی کوششوں سے عثمانیہ یونیورسٹی میں تبدیل ہوا، اگست ۱۹۱۹ء میں اسکی داغ بیل ڈالی گئی تھی، نواب عثمان علی خان والی حیدرآباد کے نام پر اس کا نام تجویز ہوا۔ اس کے قیام اور حالات پر "یادوں کی دنیا" نامی کتاب میں یوسف حسین خان نے روشنی ڈالی ہے، حیاتِ حمید میں بھی اس کا تذکرہ مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کے قلم سے موجود ہے[1]۔

[1] دیکھئے حیات حمید ص۱۷ و ص۱۸ و ص۲۶ و ص۳۷ مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ ۱۹۷۳ء۔

اس یونیورسٹی میں شعبہ دینیات کو خصوصی حیثیت دی گئی تھی، مگر جب اساتذہ کے تقرر اور گریڈ کے تعین کا وقت آیا تو چونکہ یہ برطانوی حکومت کا زمانہ تھا، کچھ لوگوں نے چاہا کہ دینیات کا شعبہ بے وزن رہے، اور اس شعبہ کے اساتذہ کا مشاہرہ بھی دوسرے شعبوں کے اساتذہ کے برابر نہ ہو۔ حضرت مولانا گیلانی فرماتے تھے کہ اس شعبہ کو اہمیت دینے، اس کے اساتذہ کے لئے دوسرے اساتذہ کے برابر مشاہرہ طے کرانے میں بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن[1] (م ۱۹۵۰ء) خان شروانی کی توجہ اور حمایت حاصل نہ ہوتی، تو اس میں کامیابی دشوار تھی مولانا گیلانی نے اس طرف اشارہ فرمایا ہے۔

لکھتے ہیں:۔

"اس کے بعد پھر کیا کیا ہوا، ربع صدی سے زیادہ مدت کے اس عرصہ میں کیا کیا دیکھا، کیا کیا سُنا، کن حالات سے گذرا، عثمانیہ یونیورسٹی میرے سامنے حیدر آباد میں کس طرح قائم ہوئی۔ —— استاذوں کی پہلی کھیپ میں شریک ہو کر اس عجیب وغریب تعلیم گاہ میں ہم کیسے داخل ہوئے، یونیورسٹی کے اندر اور یونیورسٹی کے باہر جو کچھ پیش آیا تھا۔ اس کو دکھانے والا کیا کچھ بنا بنا کر دکھاتا رہا، اب یہ داستانِ ماضی ہو چکی —— ورنہ یہ سینۂ روزگار کے جن اسرار کا گنجینہ بنا ہوا ہے، اب اس کو کُرید کر کیا کیجیے گا۔ روشنی بھی دیکھی اور تاریکی بھی، فراز بھی سامنے آیا اور نشیب بھی، چڑھا بھی، اور گرا بھی"۔

(رسالہ دار العلوم دیوبند اگست ۱۹۵۵ء، ص ۴۵)

[1] ان کی زندگی کے لئے دیکھئے کتاب "صدر یار جنگ" شائع کردہ ندوۃ العلماء لکھنؤ

اس سے اتنی بات تو ظاہر ہی ہے کہ حضرت مولانا گیلانیؒ اساتذہ کی پہلی کھیپ میں یونیورسٹی کے استاذ مقرر ہوئے، اور یونیورسٹی آپ کی آنکھوں کے سامنے قائم ہوئی، اور ابتدائی اتار اور چڑھاؤ سب مولانا کی آنکھوں کے سامنے ہوا۔

عثمانیہ یونیورسٹی میں مولانا کی حیثیت | چونکہ مولانا کی شہرت پہلے کافی ہو چکی تھی، حیدر آباد میں جو اہلِ علم کی دو اہم مجلسیں تھیں ایک فضیلت جنگ حضرت مولانا انوار اللہ خاں صاحب مدار المہام کی اور دوسری یمین السلطنت مہاراجہ کشن پرشاد پیشکار وزیر اعظم کی، دونوں وہاں کے علماء کے سامنے مولانا کی تقریریں یونیورسٹی کے قیام سے دو سال پہلے ہو چکی تھیں، پھر دیوبند میں ڈیڑھ سال رہ کر القاسم اور الرشید میں مولانا کے قلم سے علمی اور تاریخی مقالات کافی تعداد میں شائع ہو چکے تھے، تقریر اور درس وتدریس کی بھی مشق ہو چکی تھی، اور عوام وخواص میں کافی مقبول بھی تھے۔ اس لئے عثمانیہ یونیورسٹی میں کسی استاذ سے کسی اعتبار سے اپنے فن میں نیچے نہیں تھے، اور نہ نیچے سمجھے جاتے تھے۔ بحیثیت استاذ جب لکچر دینے لگتے تو طلبہ کی بھیڑ جمع ہو جاتی تھی، حتیٰ کہ ہندو طلبہ بھی کھچ کر آجاتے تھے، مولانا کا لکچر علم وفن اور اثر کے اعتبار سے ممتاز ہوا کرتا تھا، اور جامعہ کے ہونہار طلبہ لکچرز سُننے کے لئے ٹوٹ پڑتے تھے، عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک شاگرد نے بہت درست لکھا ہے:۔

"حضرت مولانا گیلانی پر مولیٰ کے کرم کی خاص نشانی پیدائش کے اعتبار سے قصباتی، مگر شہرت کے اعتبار سے عالمی، قد وقامت کے مختصر، مگر فکر ونظر کے ناپیدا کنار سمندر، علم وبصیرت کے یگانہ، مگر عام امورِ زندگی سے بے گانہ، دماغ کے زیرک، مگر دل کے دیوانے، ہوشیاری ومستی کا سنگم، میدانِ تقریر کے شہسوار اور تحریر کے سید القلم"۔

(تذکرہ شاہ ولی اللہ ص ۳)

استاذی اوصاف درس و تدریس میں کامیابی کے لئے جو چیزیں ضروری ہیں، مولانا میں وہ سب بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں، اخلاص، طلبہ سے ہمدردی و شفقت، مطالعہ کی وسعت و گہرائی، اندازِ بیان کی ندرت، اور اثر اندازی، علمی وقار ماحول اور تقاضائے زمانہ پر نظر، جب بولنے پر آتے مسلسل بولتے چلے جاتے، معلوم ہوتا تھا علم و تحقیق کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ مولانا بہت جلد یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ پر چھا گئے، مولانا کے ایک شاگرد لکھتے ہیں:۔

"مولانا گیلانی کی دقتِ نظر، وسعتِ فکر، علومِ دینی میں ان کا تبحر اور مسائلِ حاضرہ پر ان کی علمی دیانت اور مجتہدانہ جرأت، ان کی بے لوث خدمت اور جامعہ سے ان کی شیفتگی نے ان کی شخصیت کو ہر دور کے طلباء اور ہر شعبہ کے اساتذہ میں وہ عظمت اور محبوبیت عطا کر دی تھی، جو اُن سے پہلے یا بعد کسی کو نہ مل سکی ہے۔

ع یہ رُتبہ بلند ملا جس کو مل گیا"

(مقدمہ مقالات احسانی ص۸)

واقعہ ہے کہ مولانا نے اپنی بے پناہ محنت اور اخلاص سے تھوڑے ہی دنوں میں حیدر آباد شہر میں بھی، اور یونیورسٹی کے حلقہ میں بھی ایک امتیازی مقام پیدا کر لیا تھا، اسی کے ساتھ طلبہ میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی تھی، چنانچہ علم کے ساتھ دینِ قیم سے ان کی وارفتگی کی شان کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں ہے۔

مولانا میں اساتذہ کے اوصاف مولانا نے جن اساتذہ سے پڑھا تھا وہ سب اپنے دور کے بے نظیر علماء ربانیین تھے۔ علم و عمل میں ممتاز، مجتہدانہ شان کے مالک اور ذہن ساز تھے۔ خود سوچئے حضرت مولانا برکات احمد صاحب میر نگری

ثم ٹونکی (م ۱۳۴۷ھ) جیسے فاضلِ روزگار استاذ، عالمی شہرت کے مالک، جو اپنے وقت میں خیر آبادی مکتب فکر کے امام کی حیثیت رکھتے تھے، دوسری طرف دیوبندی مکتبِ فکر کے امام شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانی (م ۱۳۳۹ھ) محدث العصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ (م ۱۳۵۲ھ) مفسر قرآن حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے عبقری الذہن اور آفاقی الفکر اساتذہ کرام، تیسری طرف خود مولانا گیلانی کا سا مثالی حافظہ، ذہن اخاذ، فکر دور رس، اور نظر عمیق، پھر مطالعہ اور کتب بینی کا ذوق اور اس سے شغف!

جامعہ عثمانیہ میں استاذ ہوئے تو نئے علوم و افکار سے واسطہ پڑا، جدید علوم کے تعلیم یافتہ اور ماہرین سے مقابلہ کرنے میں ذہن و فکر نے کسب کمال میں تیز رفتاری دکھائی، پھر ماحول ایسا علمی ہاتھ آیا کہ اسمیں رہی سہی کسر پوری ہو گئی اور تھوڑے تجربات کے بعد ذہنی و فکری اُپج نے مولانا کو جدید و قدیم علوم کا سنگم بنا دیا۔

طلبائے یونیورسٹی میں بیداری کی سعی جن طلبہ کو آپ نے پڑھایا تھا آپ کے وکیل اور مخلص بن گئے، اور یہ ذہن نشین ہو گیا کہ تحصیل علم کا اصل مقصد ذہنی غلامی سے آزاد ہونا ہے اور اس میں کوتاہی جرم ہے، ان کی یہی عمر بننے، سنورنے اور اُبھرنے کی ہے اس غنیمت اوقات کا ضائع کرنا کسی طرح جائز نہیں، یونیورسٹی کا یہ ڈھانچہ ان کی ذہنی صلاحیت کو کار آمد بنانے کے لئے ہی عمل میں آیا ہے، ریاست کی اس ساری تعلیمی سرگرمی کا ماحصل نوجوانوں کی ذہنی و فکری اصلاح ہے، اور اس کے بعد جو کچھ ہے وہ ضمنی طور پر ہے، یہی وجہ ہے کہ ملک کے منتخب اہلِ علم کو اساتذہ کی صف میں لانے کی سعی کی گئی ہے، نظام حیدر آباد کے اخلاص کا بھی اعتراف کرنا ہوگا جس کے ثمرات سامنے آرہے تھے۔

مولانا گیلانی طلبہ پر قابو یافتہ تھے، طلبہ کو آپ سے اُنس پیدا ہو گیا، اور

انہوں نے اپنی تمامتر توجہ طلبِ علم پر لگادی، آپ کے ایک شاگرد کا ہی بیان ہے:

طلبا پر مولانا کی شفقت قدیم اساتذہ کے لطف وکرم کی ایک زندہ یادگار تھی، ان کی شفقت افادۂ علم ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ اپنے شاگردوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے وہ جامعہ کے اندر اور باہر ہمیشہ پوری قوت صرف فرماتے رہے، بلکہ بعض صورتوں میں ان کے نجی معاملات مثلاً شادی بیاہ میں بھی مولانا کے الطاف برابر شامل رہتے تھے۔"

(مقدمہ مقالاتِ احسانی ص۱۶)

ذوقِ مطالعہ کا کرشمہ مولانا گیلانی کا ذہن رسا تھا، مطالعہ سے قلبی شغف تھا، حافظہ قوی رکھتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وقت کا کوئی حصہ ضائع نہ ہوتا تھا، اور ہر وقت علم وفن میں غرق رہا کرتے تھے، کتب بینی کے ذوق وشوق نے بہت سارا مواد آپ کے ذہن میں فراہم کر رکھا تھا، تفسیر، حدیث، فقہ، علمِ کلام، اور تاریخِ اسلام مولانا کا خاص موضوع تھا، مگر اسی کے ساتھ نئے علوم کی کتابیں جو سامنے آجاتیں، مولانا بڑے شوق سے اُن سے بھی استفادہ جاری رکھتے، قلم بھی رواں دواں رہتا، اور زبان بھی اپنا کام کرتی رہتی، افادہ اور استفادہ سے کوئی لمحہ حتی الوسع خالی نہ ہوتا تھا۔

کسی ذہین وذکی استاذ کا جب یہ حال ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنے زمانہ میں مجتہدانہ انداز میں کام کرنے پر قادر ہوجائے گا،

کمالاتِ علمی مولانا عبدالباری ندوی (م ۱۹۷۶ء) نے لکھا ہے، جو خود جامعہ عثمانیہ میں استاذ تھے:۔

"تاہم ان کی ژرف نگاہی اور دور رس ذہن ایسے بہتر حقائق کو

پالیتا ہے، جن پر سلف سے خلف تک شاید ہی کسی مفسر قرآن کی نگاہ پڑی ہو۔" (مقدمہ مکاتیب گیلانی ص۔)

یہی بزرگ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"یوں مولانا کے علمی وذہنی کمالات پر ایک اچٹتی غلط انداز نظر کا عالم بھی یہ تھا کہ دس بیس منٹ بھی جو پاس بیٹھ جاتا، ان کے تفوق سے مسحور ہوئے بغیر نہ اٹھتا، ہر طرح کے علمی ودینی معلومات کی بہتات ان سے عجیب عجیب نتائج استنباطات، پھر حسنِ تعبیر کی ندرت وبرجستگی "ہر چیز بجائے خود" دامنِ دل "کے لئے" کرشمۂ دل کش "ہوتی نجی ومجلسی گفتگو یا خطاب خاص سے اوپر عام خطاب یا خطابت سنئے تو یہ کمالات اور زیادہ مبہوت کردیتے۔" (ایضاً)

مولانا کی صاف دلی عرض یہ کرنا ہے کہ مولانا گیلانی کے ذہن وفکر کی دور رسی اور مطالعہ ومعلومات کی وسعت......... اور اسی کے ساتھ نتائج اخذ کرنے کی جو مجتہدانہ صلاحیت تھی، آپ کے ہم عصر علماء اور تلامذہ دونوں ہی اس کے قائل ہیں۔

اس کے ساتھ مولانا کا دل اس قدر صاف اور بے غل وغش تھا کہ کبھی اپنی بڑائی اور استعداد پر کبر وغرور کا شائبہ بھی نہیں پایا گیا، بلکہ سراپا تواضع بنے رہتے، اپنے چھوٹوں کو خوب ابھارتے، ان کی حوصلہ افزائی کرتے، حتیٰ کہ کبھی کبھی اگر وہ ناسمجھ ہوتا تو بے جا تعلّی میں مبتلا ہوجاتا۔

مولانا ندوی رحؒ نے لکھا ہے:۔

"ملنے جلنے، خط وکتابت وغیرہ کسی چیز میں اپنی دینی ودنیوی، علمی وذہنی برتری یا دوسروں کو انکی کمتری محسوس نہیں کراتے بلکہ خردوں، شاگردوں کو اتنا بڑھاتے کہ بزرگوں، بڑوں کیلئے

زبان ولغت جواب دے جاتے، حضرت حالؔی کی طرح حضرت گیلانی نے بھی کہنا چاہیے "اپنی خاکساری" کا مستقل کام ہی یہ بنا رکھا تھا کہ ہر حال وقال سے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ بناتے رہیں۔"

خاکساری اپنی کام آئی بہت
ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا۔" (ایضاً)

احساس وشعور | اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ حضرت گیلانی کو اپنے علم وفن اور ذہن و فکر پر اعتماد نہیں تھا، یا وہ اپنے وسعت مطالعہ اور دقتِ نظر پر بھروسہ نہیں کرتے تھے یقیناً کرتے تھے، اور کیوں نہ کرتے کہ ذہین بھی تھے، طبّاع بھی تھے، اور قوی الحافظ بھی تھے، ان کے ساتھ ان کا ذہن وفکر برق رفتاری سے کام کرتا رہتا تھا۔

مولانا ندوی رح لکھتے ہیں :-

"ایسا نہیں کہ مولانا کو اپنے ان بیشمار وہبی وکسبی کمالات کا کوئی احساس وشعور نہیں تھا، اتنے ذہین وذکی اتنے بے حس وبے شعور کیسے ہوتے، ذہنی وعلمی برتری کا بھی شعور تھا، اپنی کتابوں، مضمون وغیرہ پر اعتراض ونکتہ چینی کو بھی محسوس فرماتے، گراں خاطر بھی ہوتے، جواب بھی دیتے، لیکن تمام کمالوں سے بڑھا ہوا کمال ان کا یہی تھا، کہ وقتی وطبعی تاثر کے سوا قلب کی سلامتی میں کوئی فرق نہ آنے پاتا، یعنی کسی کی طرف سے کسی ظلم وزیادتی کے باوجود دل میں کوئی گرہ دو چار دن کے لیے بھی نہ پڑتی، نہ وہ غلی کیفیت پیدا ہوتی، جس سے بچتے رہنے کی قرآن نے خاص طور پر دعا کی تعلیم فرمائی ہے۔ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا"۔ (مقدمہ مکاتیب گیلانی ج ۱ ص ۴۴)

تلامذہ کی تربیت | آخر میں مولانا نے اپنے بہت سے شاگردوں کو مختلف مضامین میں پی، ایچ ڈی کرایا تھا۔ بی۔ اے اور ایم۔ اے کلاسوں میں لکچر دیتے تھے، ان میں بڑے بڑے ذہین، محنتی اور مطالعہ کرنے والے بھی ہوتے تھے، پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ مولانا کو اپنے علم وفضل اور کمالات کا شعور نہ ہوتا، اہلِ علم کی سوسائٹی میں دن رات رہتے تھے، گفتگو کرتے تھے، مضامین لکھنے بیٹھتے تو قلم رکنا جانتا ہی نہ تھا، تین چار صفحات کے مضمون کے لئے کسی ایڈیٹر صاحب کی فرمائش پر قلم اٹھاتے تو وہ سیکڑوں صفحات پر جاکر قلم رکتا۔

نفس پر قابو | مولانا گیلانی کا نفس مسلمان ہوچکا تھا، وہ تابع رہتا، کبھی اپنے اوپر اس کو غلبہ کا قطعاً موقع نہیں دیتے، طبیعت میں نہ ضد تھی اور نہ تعلّی وترفع، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن عثمانی قدس سرّہٗ سے جب شکوک وشبہات کی شکایت کی تھی اور شیخ الہند رح نے فرمادیا تھا، جاؤ اب کوئی اس طرح کی بات نہیں ہوگی، ایسا معلوم ہوتا ہے اسی دن سے مولانا کا قلب اور دماغ مومن کامل ہوگیا تھا، جس کا مولانا نے خود اعتراف بھی کیا ہے، اور جو پہلے نقل بھی کیا جاچکا ہے۔ مولانا عبد الباری ندوی رح جو حکیم الامۃ تھانوی رح کے مسترشد تھے، اور بہت سلجھی ہوئی طبیعت کے مالک اور کتاب وسنت کے باب میں شدّت رکھتے تھے، اور برسہا برس حضرت گیلانی کے ساتھ حیدرآباد میں ان کا رہنا سہنا ہوا، انھوں نے لکھا ہے :-

"سالہا سال روزمرہ ہر طرح کے نجی سے نجی اور قریبی سے قریبی تعلقات ومعاملات کا سابقہ رہا، ایک بات بھی یاد نہیں جس میں بات کی پیچ یا نفس ونفسیات کی ضد اور ہٹ کا کوئی نام ونشان ملا ہو، بلکہ — دوسروں کی سخن پروری وخودرائی کے سامنے خود ہی سپر ڈالدیتے مزاحمت ومقابلہ طبیعت میں تھا ہی نہیں، فنا ہی فنا کا غلبہ رہتا،

اس فنائیت کی قدر پوری طرح جب ہوتی ہے کہ علم و قلم، دین و دنیا کی کوئی بڑائی رکھنے والا خصوصاً ان کے ہمعصروں کے رنگ و روش کا اس پہلو سے مقابلہ پڑتا ہے، اس لحاظ سے مولانا کو اپنے ہم چشموں میں فردِ فرید ہی پایا۔" (ایضاً ص ۴۱/ج ۱)

رذائلِ اخلاق سے پاک وصاف مولانا کی صاف دلی کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا ندوی رح لکھتے ہیں:۔

مولانا میں جو بھی کمزوریاں رہی ہوں اور معصوم کون بشر ہے لیکن جہاں تک دل کا تعلق ہے کہنا چاہیے کہ اس کی تمام بیماریوں سے ان کو پاک ہی پایا، بغض و حسد، انتقام و عداوت، ریا و نفاق نمود و نمائش، حرص و ہوس، طولِ امل وغیرہ کے نفسانی جذبات کا کوئی داغ دھبہ یاد پر زور ڈالنے سے بھی، ان کے آئینۂ دل پر پڑنا خصوصاً ٹھہرنا قطعاً یاد نہیں پڑتا۔" (ایضاً ص ۴۲)

خود سوچیے، جو عالمِ دین اتنا صاف دل، پاک باطن اور علم وعمل سے آراستہ ہو اسکی تعلیم اور درس و تدریس سے اسکے تلامذہ کیسے متاثر نہ ہوتے ہوں گے اور مولانا کی تربیت سے تلامذہ کے علم وعمل میں برکت کیسے نہیں ہوتی ہوگی، ایسے اساتذہ اب کہاں ملتے ہیں، کمیاب ہی نہیں نایاب ہیں جب استاذ باکمال ہوتا ہے، شاگردوں پر اسکا اثر پڑنا ضروری ہے اور شاگردوں میں بھی صرف اُنکے علم ہی میں جلا پیدا نہیں ہوتا ہے بلکہ اپنا تجربہ یہ ہے کہ قلب بھی روشن ہوتا چلا جاتا ہے، اور دماغ بھی محروم نہیں رہتا ——— مولانا گیلانی کے دو چار تلامذہ کی ... تصنیفات نظر سے گذری ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے بڑا کام کیا ہے اور بڑی اچھی نسل تیار کی ہے، انکے علم وفضل سے دنیا سیراب ہو رہی ہے اور ان شاء اللہ ہوتی رہے گی۔

اثر اندازی مولانا گیلانی نے اپنے تلامذہ کو تیار کرنے اور ان میں اسلامیات کا

ذوق پیدا کرنے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کیں، اور بہت کافی محنت کی، اور اس راستہ سے بڑی اہم علمی خدمات انجام پائیں۔

حضرت العلامہ سید سلیمان ندوی رح لکھتے ہیں:۔

اس زمانہ میں اس فرض کو ادا کرنے کے لیے جو دستہ آگے بڑھا، اس کے ہراول دستہ میں ہمارے دوست مناظرِ اسلام متکلمِ ملت، سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن گیلانی مَتَّعَ اللّٰہُ الْمُسْلِمِیْنَ بِطُوْلِ بَقَائِہٖ کا نام نامی ہے، جن کے قلم کی روانی، اسلام کی محافظت میں تیغِ رانی کا کام دیتی ہے، وہ ہر سال اور سال کے مختلف حصوں میں اپنی تحقیقاتِ علمیہ کے بلند نمونے پیش کرتے رہتے ہیں، اور خصوصاً اپنے توسیعی خطبات اپنے تلامذہ کے امتحانی مقالات کے پردے میں علم اور دین کی ایسی خدمتیں انجام دے رہے ہیں، جو سارے مسلمانوں کی تحسین اور شکریہ کے مستحق ہیں۔" (مقدمہ تدوینِ حدیث ص ۸)

جدید تعلیم یافتہ سے شکوک وشبہات کا ازالہ حضرت مولانا عبدالباری ندوی نے لکھا ہے:۔

"حضرت (مولانا مناظر احسن گیلانی) مرحوم کی اس موہوب ندویت کے لئے واہب العطایا جل مجدہ نے عثمانیہ یونیورسٹی کا میدان بھی خوب ہی عطا فرما دیا تھا، اس اسٹیج پر ان کے خصوصی کمالات کا پہلا نظارہ سالہا سال تک "دینیات لازم" کی کرسی سے ہوتا رہا۔ اس میں ایک طرف انٹر سے لیکر بی۔ اے و بی ایس سی آرٹ، سائنس کے سیکڑوں، ہزاروں طالب علموں کے جدید

ذہنی سانچہ اور اس میں ابھرنے والے دینی شکوک وشبہات کے جاننے پہچاننے کا بھرپور موقع ملا، دوسری طرف ان کے ازالہ وامالہ کا جدید تعبیرات واصطلاحات ہی کے ذریعہ اپنی وہبی قابلیتوں سے خوب خوب کام لینے کا۔" (مقدمہ مکاتیب گیلانی ص۵۵)

الحاد کی ظلمت میں ایمان کا نور انگریزی دورِ حکومت میں حکومت کے ہی ایماء سے مسلمانی اذہان وافکار میں شکوک وشبہات کا ایک سیلاب تھا، جو چاہتا تھا کہ مسلمانوں کو دائرۂ اسلام سے دور بہا لے جائے اور الحاد ودہریت کے غار میں ڈال دے، اور اس وقت کے کالج، اسکول اور یونیورسٹیوں کا تو حال مت پوچھیے کہ وہاں پڑھنے والے مسلمان نوجوانوں کا ذہن انگریزی پروپیگنڈے سے کس طرح مسحور تھا اور اپنے یہاں کے دینی احکامات کو وہ کس نظر سے دیکھتے تھے، اور اگر مسلمان نوجوان علی گڈھ مسلم یونیورسٹی یا حیدر آباد عثمانیہ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے تو ان دونوں اشکالات کا ناپنا آسان نہیں ہوتا تھا۔

مولانا عبدالباری ندوی رح نے درست لکھا ہے:۔

"نہ جاننے والے اندازہ ہی نہیں کرسکتے کہ جدید علوم وفنون کے معلمین ان کی تعلیم گاہیں، اور ان میں تعلیم تربیت کا ماحول، سب مل ملاکر دینِ حق کے لئے ایسے سم قاتل کا حکم رکھتے ہیں کہ کوئی بڑا "بطنی سعید"، ہی عمل تو عمل ایمان کو بھی صحیح سلامت لیکر ان سے باہر آپاتا ہوگا، لیکن جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ حضرت گیلانی کے زیرِ درس "دینیاتِ لازم"، کے سیکڑوں طالب علموں میں کوئی بہت بڑا "بطنی شقی"، ہی ہوتا ہوگا، جو ہر روز تازہ بتازہ درسوں سے تازہ بتازہ ایمان لیکر نہ باہر آتا ہو۔" (ایضاً ص۵۰)

جامعہ عثمانیہ میں اہم خدمات یہ واقعہ ہے کہ حضرت گیلانی نے حیدر آباد یونیورسٹی میں درس وتدریس کی خدمت پر مامور رہ کر بڑی اہم دینی خدمات انجام دی ہیں، اس سے علٰحدہ رہ کر یہ خدمات انجام نہیں دے سکتے تھے، جزاہ اللہ خیرالجزاء۔

آجکل کی بات نہیں ہے بلکہ یہ انگریزی دورِ حکومت کے دورِ شباب کی باتیں ہیں۔ جب انگریزی نصاب تعلیم اسکول، کالج اور یونیورسیٹیوں میں اسی مقصد سے پڑھایا جاتا تھا، کہ بقول لارڈ میکالے صورت وشکل کے اعتبار سے تو ہندوستانی معلوم ہوں، لیکن فکر وذہن کے اعتبار سے انگریز بن جائیں، اور اپنے مذہب سے یا تو بیزار ہوں یا پھر اس قدر شکوک وشبہات میں گرفتار ہوجائیں کہ اپنے مذہب کی حمایت معیوب سمجھنے لگیں، اور کوئی شبہ نہیں کہ اس دورِ غلامی میں انگریز اپنے اس مقصد میں پچاس پچھتر فیصدی کامیاب تھے۔

ذہنی وفکری اصلاح حضرت مولانا گیلانی نے ایسے ماحول میں مسلمان نوجوانوں کی "دینیاتِ لازم" کے شعبہ میں میٹرک سے لے کر بی ایس، سی، اور آرٹ و سائنس کے ہزاروں طلبہ کی ذہنی وفکری تربیت کا فریضہ ادا کیا۔ اور اپنے رسوخ فی العلم، صاف باطنی اور اخلاص کے باعث سو فیصدی کامیاب رہے، ایسے افراد تیار کئے جو وہاں سے نکل کر مختلف ممالک اور خود اپنے ملک کے مختلف حصوں میں مسلمان نوجوانوں اور اسلام کی خدمت انجام دینے کا فریضہ ادا کریکیں اور ماشاء اللہ کتنے ہی آج یہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔

چونکہ مولانا پر دارالعلوم دیوبند کے قدیم علماء کی گہری چھاپ تھی، اخلاص وللّٰہیت میں ڈوبے ہوئے تھے، اور مقصد پیٹ کی خدمت سے زیادہ روحانی اور دینی خدمت تھی، اور یہ سب حضرت شیخ الہند رح کی دعاؤں کی برکت تھی مولانا ندوی رح نے اپنے تجربہ کے بعد بجاطور پر تحریر کیا ہے۔

"مغربی و اسلامی فلسفہ کے علاوہ سال دو سال مولانا کی جانشینی میں دینیات لازم لکچروں کا بھی تجربہ ہوا، اس سے اور بھی اندازہ ہوا کہ اسلام کی ایک اس نصرت و خدمت کی بدولت آج وہ اسلام کے خدا و رسول دونوں کے حضور کیسے سرخرو ہو رہے ہیں، اور کیسی رضا اور رحمتوں سے ان شاء اللہ نوازے جا رہے ہوں گے۔

(مقدمہ مکاتیب گیلانی صہ ۵۸)

الحادی ذہن کی یورش انگریزی دورِ حکومت میں الحاد و ارتداد کو ایک نئے لباس میں عوام و خواص کے اندر پھیلانے کی جدوجہد جاری تھی، اور کہا جا سکتا ہے کہ — آزاد ہندوستان میں بھی یہ سلسلہ آج جاری ہے، یہ فلسفہ اور عقلی سازشوں کا لباس ہے جس سے وہ تعلیم یافتہ کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ مذہب خواہ کوئی بھی ہو، معاشی ملکی ترقی میں آہنی دیوار کی حیثیت رکھتا ہے، جب تک اس آہنی دیوار کو گرایا نہیں جاتا، اور تعلیم یافتہ اس کے مسمار کرنے میں تعاون نہیں کرتے، نہ قوم و ملت سربلندی حاصل کر سکتی ہے اور نہ ملک ترقی کی راہ پر گام زن ہو سکتا ہے، یہ فلسفہ اس تیز رفتاری کے ساتھ رواں دواں ہے کہ جدید تعلیم یافتہ بڑی آسانی سے اس فلسفہ کے جال میں پھنس جاتے ہیں اور انھیں احساس تک نہیں ہو پاتا کہ وہ اپنے دین سے کس قدر دور جا پڑے، دوسری قوموں کے افراد کی طرح مسلمان تعلیم یافتہ بھی اس کے شکار ہو جاتے ہیں اور اپنے اسلام سے بدظن اور دور ہوتے چلے جاتے ہیں، اور جس طبقہ میں یہ فلسفہ جاری و ساری ہے عام علماء کرام کی وہاں تک پہونچ نہیں ہو پاتی ہے اور نہ ان کا ان سے کوئی میل ملاپ ہوتا ہے بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ عام علماء کو اس الحادی اور ارتدادی فلسفہ کی خبر تک نہیں ہوتی، جب بیگانگی کا یہ عالم ہو تو خود سوچا جا سکتا ہے کہ عام علماء کس طرح تبلیغ کا وہ فریضہ ادا کر سکتے ہیں جو ان پر عائد ہوتا ہے، انگریزی دورِ حکومت

میں یہ بات اور بھی پائی جاتی تھی کہ مسلمان نوجوانوں کو انکے مذہب سے متنفر کیا جائے۔

اس ماحول میں مولانا گیلانی کی خدمت حضرت گیلانی رح چونکہ اسی ماحول میں رہتے تھے اس فلسفہ کے تانے بانے کی اچھی واقفیت رکھتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ یہ کہاں سے شروع ہوتا ہے، کس رفتار سے چلتا ہے، اور اس کے حملہ آور ہونے کی کیا تدبیریں ہیں۔ مولانا بلا کے ذہین تھے، معقولی ذہن تھا، ٹونک میں سات سال انھوں نے ضائع نہیں کئے تھے، پھر رنگ ان پر شیخ الہند رح، علامہ کشمیری رح اور حضرت عثمانی رح کا تھا، ذہن آفاقی، علم وہبی و کسبی اور زبان و بیان موجودہ حالات کے مطابق، شیریں اور دل نشیں، اس لئے جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں پر کنٹرول کرنے میں نہ انکو زیادہ دیر ہوتی تھی نہ قلبی اذیت۔

جذب و مستی اور اس کا اثر میں نے خود دیکھا ہے کہ جب مولانا آنکھیں بند کر کے بولنے پر آتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کی باتیں کانوں کے راستے سے براہِ راست دلوں میں اتر رہی ہیں، عقل و دماغ دونوں کو اطمینان حاصل ہوتا تھا اور کہنا چاہیے کہ ایک طرح کی فرحت و بشاشت بھی حصہ میں آتی تھی۔

مولانا ندوی رح نے بھی لکھا ہے:۔

"یک گونہ بے خودی اور جذب و مستی کا رنگ، تو ان میں اتنا نمایاں کہ تھوڑا واقف کار بھی اس سے نا واقف نہ رہتا، ہر کسی کو کسی نہ کسی شخص یا شئی سے نفرت بھی ہوتی ہے، اور کسی سے محبت بھی، مولانا (گیلانی) کو کسی شئی سے رہی ہو تو رہی ہو، لیکن کسی شخص کی طرف سے ان کے سینہ میں کبھی کسی نفرت کا سراغ نہ ملا۔"

(ایضاً صہ ۵۳)

نفسانیت سے پاک اپنا تجربہ لکھتے ہیں:۔

"یہ سراپا نفس و نفسانیت سے پاک تھے، راقم اپنے ۳۲۔۳۴ سال کے ہر طرح تعلقات، معاملات پر مبنی ان کے تجربات کو سامنے رکھ کر پوری ذمہ داری و ایمان داری سے شہادت دیتا ہے کہ ایک مرتبہ بھی کبھی.. ان کی کسی بات سے دل کی کسی کھوٹ یا اندر کے کسی دنی یا خسیس جذبہ کا اثر پڑنا نہ خود اپنے اوپر قطعاً یاد ہے، نہ کسی دوسرے پر، زیادہ سے زیادہ یہ کہ بس کچھ وقتی طبعی اثر ہو گیا۔" (ایضاً)

مجموعۂ کمالات حاصل یہ کہ مولانا گیلانی اپنے تلامذہ پر مؤثر اپنی ان بے انتہا خوبیوں کی وجہ سے تھے ــــ جو قدرت کی طرف سے انھیں عطا کی گئی تھیں، بے نفس آدمی کو دیکھا گیا ہے کہ اثر انداز لازماً ہوتا ہے، دوسری طرف علم و معلومات کی بھی کمی نہیں تھی، آپ کے ایک تلمیذ نے لکھا ہے:۔

"مولانا (گیلانی) قدس سرہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، خیرآباد و دیوبند کے اکابر اساتذہ کے فیض یافتہ تھے، پھر جب حیدرآباد آئے تو یہاں علامہ حمید الدین فراہی سے استفادہ فرمایا، جو ایک خاص فکر قرآنی کے مالک تھے، ادھر جامعہ عثمانیہ کے تعلق سے مغربی افکار و مغربی ذہن سے واقفیت ہی نہیں بلکہ اس سے گہرا ربط قائم ہو گیا تھا، ان گوناگوں مؤثرات میں مولانا کی ذہنی تشکیل ہوئی، چنانچہ جامد مولویت کو (جو مسائل حاضرہ سے بے خبر ہو) خود مولانا نے مرحوم ناقص تصور فرماتے تھے، اور لکچر اور گفتگو کے دوران میں جب مسائل حاضرہ پر مجتہدانہ روشنی ڈالتے تو "بے چارے مولوی نے سمجھا نہیں" کا جملہ اکثر مسکراہٹ کے ساتھ ان کی زبان سے نکل جاتا مولانا کا حافظہ مثالی، ذہن بہت اخاذ، فکر دور رس اور بڑی مجتہدانہ تھی"

(مقالات احسانی)

انداز بیان انداز بیان بھی بڑا دل نشیں اور پیارا ہوتا تھا، غلام محمد صاحب جو مولانا کے تلمیذ ہیں انھوں نے لکھا ہے:۔

"بیٹھتے تو آنکھیں بند کئے اور سر جھکائے رکھتے تھے، مگر جب بولتے تو انکی زبان سے پھول جھڑتے تھے اور اس کی شیفتگی اور ذکاوت مخاطب کو مسخر کر لیتی تھی۔" (مقالاتِ احسانی)

مولانا علی میاں کی شہادت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے لکھا ہے کہ جب کبھی مولانا لکھنؤ تشریف لاتے تو ان کی مجلس میں حاضر ہوتا تھا، اس وقت کے دو تاثرات باقی رہ گئے ہیں:۔

"ایک ان کی شیریں گفتاری، شگفتہ بیانی، دوسرے ان کی نورانی صورت، خندہ پیشانی ان دونوں صفتوں نے مل کر ان کی شخصیت میں عجیب دلآویزی اور دلکشی پیدا کر دی تھی، اور کسی طرح انکی موجودگی یا گفتگو طبیعت پر بار نہیں ہوتی تھی ــــ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو اس لطافت سے خوب نوازا تھا، اور اسی وجہ سے وہ اپنے حلقۂ احباب میں بڑے محبوب اور اپنے حلقۂ تلامذہ و مستفیدین میں بڑے مقبول تھے، اور جو ان کی صحبت میں ایک مرتبہ بیٹھ جاتا، وہ یہ کہتا ہوا اٹھتا کہ ۔ ع

بہت لگتا ہے جی صحبت میں انکی"

(پرانے چراغ ص ۶۳ و ص ۶۴)

مولانا کی مجلس کا حال مولانا علی میاں مدظلہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ مولانا گیلانی اپنے کو کبھی بڑا بنا کر نہیں پیش کرتے تھے، بلکہ ملنے والوں سے ایک ساتھی کے انداز میں گفتگو کرتے تھے، اس کا بھی مخاطب پر گہرا اثر پڑتا تھا۔

"مولانا کی مجلس میں بڑا انبساط تھا، علمی و درسی اصطلاح میں تنزل بھی تھا، لطائف بھی تھے، واقعات بھی تھے، اور چیدہ و منتخب اشعار بھی، اور وہ بھی ترنم کیساتھ، دلنوازی اور شفقت بھی تھی اور علمی و تحقیقی شان بھی، اور اس بات کا ثبوت کہ علم انکا ایسا جزو بدن ہوگیا تھا کہ ان کو اس کا احساس باقی نہیں رہا تھا، اس لئے اس کے موقعہ بے موقعہ اظہار کی ضرورت نہ تھی۔" (ایضاً)

تاریخ ہند پر نظر | سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا کے متعلق لکھا ہے:۔

"انھوں نے ازراہِ لطف و کرم معانقہ فرمایا، اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر الگ لے گئے، میرے سامنے اس وقت ایک منور چہرہ تھا، جس پر نرمی، شگفتگی، پاکیزگی اور برگزیدگی برس رہی تھی، ان کا نورانی چہرہ دیکھ کر دل کہتا تھا کہ ان کے قلب میں شاید معصیت کا وسوسہ بھی کبھی پیدا نہ ہوتا ہوگا، داڑھی سفید ہوچکی تھی لیکن چہرے پر اس طرح زیب دیتی تھی جیسے اسی کے لئے بنائی گئی ہو —— ہندوستان کی تاریخ پر ایسی عالمانہ اور دلکش گفتگو شروع کردی کہ مجھ کو ایسا محسوس ہورہا تھا کہ شربت کے گھونٹ میرے حلق میں اتر رہے ہیں، مہابھارت، رامائن، گیتا، البیرونی، ابن بطوطہ —— ضیاءالدین برنی پر ایسی مبصرانہ گفتگو سنی کہ مجھ کو حیرت ہورہی تھی کہ میں کسی عالم دین یا دینیات کے معلم کے سامنے ہوں، یا تاریخ کے کسی ماہر کے پاس بیٹھا ہوں —— جب تک علمی گفتگو کرتے رہے میں ان کے فکر و نظر میں کھویا ہوا محوِ حیرت بنا رہا، اور انکی

نکتہ رسی اور مجتہدانہ طریقۂ فکر کے بوجھ سے دبتا چلا گیا۔"
(معارف، مارچ ۱۹۵۶ء)

اچھے تلامذہ کی ایک جماعت | مختصر یہ کہ مولانا گیلانی جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے ذریعہ انگریزی تعلیم یافتہ نو جوانوں میں دینداروں کی ایک اچھی مضبوط ٹیم تیار کر گئے جن کے دل و دماغ اور ذہن و فکر سب مسلمان ہیں، لکھنے پڑھنے اور تصنیف و تالیف میں یہ مخلص ہیں، اور یہ ٹیم برابر علمی لائن سے دین و ملت کی خدمت میں مشغول ہے اور اس کے خاطر خواہ فوائد برابر سامنے آتے رہتے ہیں۔ اس موقع سے مولانا —— سعید احمد اکبر آبادی رح کی وہ باتیں یاد آرہی ہیں جو انھوں نے مولانا کی وفات پر نظرات میں تحریر فرمائی تھیں۔

مولانا اکبر آبادی کی تصدیق | مولانا نے بہت درست اور بجا لکھا تھا۔

"یوں تو مولانا کیا نہیں تھے، ایک نامور محقق اور مبصر اسلامیات بلند پایہ مصنف، شعلہ بیان خطیب، صاحبِ وجد و حال صوفی، سب کچھ تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا سب سے بڑا کارنامہ جس میں ان کا کوئی حریف نہیں ہوسکتا، یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فیضانِ تعلیم و تربیت سے انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ میں ایک دو نہیں کثرت سے ایسے افراد پیدا کردیئے، جو —— مغربی علوم و فنون کی اعلیٰ اسناد رکھنے کے باوجود.... آج اسلامی علوم و فنون کی بڑی قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اور جن کی اسلامی تحقیقات کی گونج یورپ اور امریکہ تک کے علمی حلقوں میں ہے، جو کام خالص علماء کے کرنے کا تھا، وہ یہ حضرات کر رہے ہیں اور اس خوبی و عمدگی سے کر رہے ہیں کہ خود

علماء کے طبقے میں اس کی مثالیں کم ملیں گی، پھر ان کی زندگیاں بھی اسلامی تعلیمات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں۔"

(نظرات برہان دہلی جولائی ۱۹۵۶ء)

ایک استاذ کا کمال یہی ہے کہ وہ اپنے پیچھے اپنے شاگردوں کی ایسی جماعت چھوڑ جائے جو اس کے مسلک و مشرب کی محافظ اور اشاعت کرنے والی ہو، اور اس کے تعلیمی جذبات کو آئندہ نسل تک پہونچانے والی ہو کوئی شبہ نہیں کہ مولانا گیلانی اس اعتبار سے بڑے خوش قسمت استاذ تھے، اللہ درجات بلند فرمائے۔

مولانا دریابادی کا بیان | مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے۔

دو شاگردوں کا ذکر آگیا ہے، تو یہ بھی سن رکھنے اور خوش ہونے کی بات ہے کہ مولانا گیلانی اپنے ایک نہیں متعدد شاگردوں میں دینی و علمی ذوق کی روح پوری طرح پھونک گئے ہیں، اور — ان لوگوں نے جو اہم دینی خدمات علمی رنگ میں کی ہیں، ان کے اجر کے بھی حقدار خود مولانا ہی ہیں۔"

(وفیات ماجدی ص۲۲)

جو کچھ عرض کیا گیا، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ مولانا گیلانی نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں بڑا اہم کام کیا اور اس خدمت سے سیرت سازی کا فریضہ خوب ادا ہوا، جس کی ہر دور میں کمی رہی ہے، اپنا تجربہ یہ ہے کہ اگر اساتذہ مخلص و دین دار اور خدا ترس ہوں، تو وہ اپنے شاگردوں کے لئے بڑے ہی مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ اساتذہ میں وہ تڑپ باقی نہیں رہی جو آنے والی نسل کے ذہن و فکر اور دل و دماغ میں انقلاب برپا کرتی ہے اور کسی ملت کے نوجوانوں میں

زندگی انگڑائی لینے پر مجبور ہوتی ہے، مولانا گیلانی کی زندگی ہمیں سبق دیتی ہے کہ اخلاص کے ساتھ ہم آنے والی نسل کی تربیت اور سیرت سازی کا فریضہ ادا کریں۔

آزادی کے بعد مولانا کی مخالفت | مولانا گیلانی جب شعبۂ دینیات کے صدر ہوئے تو اس شعبہ کو کافی ترقی ہوئی، مولانا کی خواہش تھی کہ دینیات کی تعلیم تمام مسلمان طلباء کے لئے لازم کردی جائے، اور قدیم علوم کی جگہ جدید علوم کو دی جائے تاکہ یہ شعبہ زیادہ کارآمد ثابت ہو، ملک کی آزادی کے بعد زمین و آسمان بدل چکے تھے، وہ مسلمان جو کل تک اس لڑائی میں مولانا کو شکست نہیں دے سکے تھے وہ انتقام پر اتر آئے اور نہیں چاہتے تھے کہ آزاد ہندوستان میں پہلے کی طرح دینیات ضروری طور پر پڑھائی جائے یا اس کو زیادہ اہمیت دی جائے، اس لئے ایسے لوگ مولانا کی درپردہ مخالفت کرتے اور موقع پاکر نقصان پہونچانے کی سعی کرتے تھے۔

تخصیصی درجے کے قیام کی سعی | ایک خط میں علامہ سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

"شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ کے سینے کا بوجھ بنا ہوا ہوں، حالانکہ اس کے سوا اور میں کیا چاہتا ہوں کہ اسلام کے اساسی علوم (قرآن، حدیث و فقہ) کی تعلیم لازم قرار دے کر قدیم علوم کی جگہ جدید علوم و فنون کو قبول کرلیا جائے، اور اسلامی علوم کے کسی خاص فن میں کمال پیدا کرنے کے لئے تخصیصی درجے قائم کردیئے جائیں ــــــــ"

(مکتوب، ۲ دسمبر ۱۹۴۴ء شائع شدہ معارف ماہ اپریل ۱۹۶۳ء)

آزادی کے بعد مولانا کسی نہ کسی طرح لڑتے رہے اور شعبہ کے مطالبات منواتے رہے، مگر جب ملک آزاد ہوا تو حالات بالکل ہی دگرگوں ہوگئے اور مولانا گیلانی پر مخالفین نے حملے شروع کردیئے تاکہ آپ کی کوئی بات نہ چل سکے۔

شعبۂ دینیات پر حملے ایک دوسرے خط میں سید سلیمان ندوی رح کو تحریر فرماتے ہیں:

"ڈاکٹر ولی محمد نے خاک سارا اور ڈاکٹر حمید اللہ کا نام دائرۃ المعارف کی انتظامی و علمی کمیٹی سے خارج فرما دیا تھا، انہی ولی محمد نے شعبۂ دینیات کے رعایتی وظائف ختم فرما دیئے تھے، پی ایچ ڈی کا درجہ شعبۂ دینیات سے نکال دیا تھا، ان کی سب سے زیادہ عنایت اسی مرحوم شعبہ پر مبذول تھی"

(مکتوب ۲۵ دسمبر ۱۹۴۸ء شائع شدہ معارف جولائی ۱۹۶۳ء)

حالات کی طرف ایمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"آپ سے زیادہ قرآنی آیت "اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَةً" کا راز داں کون ہو سکتا ہے، اسی دشت کی سیاحی میں ساری عمر گذری، فَاِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" (ایضاً)

مدتِ ملازمت میں توسیع ۱۸ فروری ۱۹۴۷ء کے خط میں سید صاحب کو لکھا:۔

"میری مدتِ ملازمت ستمبر میں ختم ہو رہی ہے۔ (معارف مئی ۶۳ء)

پھر سید صاحب کے خط کے جواب میں لکھا:۔

"آپ کا جو خیال ہے کہ حیدرآباد میں مجھے توسیع مل جائے گی جہاں تک میرا خیال ہے صحیح نہیں ہے، اس کا امکان تو ہے کہ کچھ کوشش و پیروی کروں تو سال دو سال اور حیدرآباد میں ٹک جاؤں، لیکن یہ قطعی طے کئے ہوئے ہوں کہ اس معاملہ میں کسی سے کچھ نہ کہوں گا، خود میرا دل حیدرآباد سے اُچاٹ ہو گیا ہے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں"

(ایضاً)

ایک دوسرے خط میں لکھا جو سید صاحب کے ہی نام ہے:۔

"میری مدتِ ملازمت ستمبر کے مہینے میں پوری ہو رہی ہے، اس وقت تک کچھ نہیں معلوم کہ ارباب اقتدار کا کیا ارادہ ہے بھاول پور سے وزیرِ تعلیم کا تار آیا تھا کہ چند ہی دن کے لئے ایک دفعہ بھاول پور آکر دیکھ جاؤ، معذرت لکھ کر بھیج دی ہے۔

(مکتوب ۲۳ رجب ۱۳۶۶ھ شائع شدہ معارف اگست ۶۳ء)

توسیع کی توقع کا اظہار یہ بھی لکھا کہ:۔

"اب میری مدتِ ملازمت ایک ماہ باقی ہے، یہاں کے جیسے حالات تھے اس کو دیکھتے ہوئے تو یہی خیال تھا کہ میرا خیال نہ کیا جائے گا، لیکن تین چار روز سے کچھ خبریں ایسی مل رہی ہیں کہ اربابِ حل وعقد کو چونکہ کوئی دوسرا آدمی نہیں مل رہا ہے اسلئے کچھ دنوں کی توسیع کر دینے کا خیال کیا گیا ہے،" (ایضاً)

مولانا کو اس کی فکر دامن گیر تھی کہ توسیع ہو گی یا نہیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ساتھ رہا اور اکتوبر ۱۹۴۷ء سے مارچ ۱۹۴۹ء تک ڈیڑھ سال کی توسیع منظور ہوئی اور اس طرح ادھر سے ایک گونہ اطمینان ہوا۔

ختم ملازمت کے بعد کی فکر مگر اسی کے ساتھ بہار کے حالات ملک کی تقسیم اور اس کے آزاد ہونے کے بعد دفعۃً نازک ہو گئے، بہت سی مسلمان بستیاں ویران ہو گئیں، اور بہت سے گاؤں مسلمانوں کو حالات کی نزاکت کے پیش نظر خالی کر دینے پڑے، گیلانی کا حال بھی اچھا نہیں تھا، خطوط برابر بہار سے ایسے آرہے تھے جن سے مایوسی بڑھتی جا رہی تھی۔

مولانا گیلانی نے اپنے ایک خط میں جو سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے

نام ہے، لکھا ہے:۔

”میں عجیب کشمکش میں ہوں، سارا خواب پریشان ہو کر رہ گیا ہے، سوچے ہوئے تھا کہ وظیفہ لے کر گیلانی چلا ؤں گا، پھر وہیں سے دوسرے خدمات کا سلسلہ اگر میسر آئے گا، شروع کروں گا، پھر وہیں اپنے آبا ؤ اجداد کے ساتھ سو جاؤں گا۔ لیکن اب کہاں جاؤں؟ —— پھر اچانک حکومت کے اس طرزِ عمل کی خبریں مل رہی ہیں کہ کسی قسم کا حادثہ ہو، حکومت نے طے کر دیا ہے کہ اس میں مسلمانوں کو ہی مجرم بنا کر اُن کی آبرو ریزی کی جائے، واقعات کا علم ہوا ہو گا، بڑے بڑوں کے سر کی پگڑی اُتاری جا رہی ہے، ایسی حالت میں بہار کے تو خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، پھر کہاں قیام کیا جائے، دکن کا حال کیا بیان کروں، بس اللہ ہی اللہ ہے، کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کل کیا ہو گا، پنجاب کے حالات سن کر کلیجہ منہ کو چلا آتا ہے۔“ (ایضاً)

دوسروں کی طرف سے طلبی | توسیع کے بعد مولانا برابر حیدر آباد ہی میں مقیم رہے، خدا خدا کر کے یہ ڈیڑھ سال توسیع کے بھی گذر گئے، جس جس طرح ریٹائرمنٹ کے دن قریب آرہے تھے، مختلف دوسری یونیورسٹیوں سے طلبی آرہی تھی کہ وہاں سے پنشن لیکر یہاں آجائیں، بہاولپور سے جو تار آیا تھا وہ آپ پڑھ چکے۔

علامہ سید سلیمان ندوی رح اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کا رجحان تھا کہ وہاں سے پنشن لیکر مسلم یونیورسٹی علی گڈھ میں آجائیں، توسیع سے پہلے مولانا گیلانی کا خیال تھا کہ گیلانی کے بجائے کسی تعلیمی ادارے میں رہنا مناسب ہو گا، جیسا کہ بعض خط سے معلوم ہوتا ہے مگر اس توسیع کی مدت پوری ہونے کے بعد رائے میں تبدیلی آگئی۔

اپنے ایک خط میں پہلے یہ لکھا تھا:۔

”میری ملازمت مارچ میں ختم ہو جاتی ہے، اس کے بعد بہر حال کہیں جانا پڑے گا، اگر راستہ اس عرصہ میں عالم آخرت کا پیش نہ آگیا۔“

علی گڈھ مسلم یونیورسٹی | علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں تاریخِ اسلام کی کوئی جگہ خالی تھی، اسکے متعلق جب مولانا سید سلیمان ندوی رح نے لکھا تو مولانا نے جواب میں تحریر فرمایا:

”باقی آپ نے یہ عجیب سفارش فرمائی، تاریخِ اسلام کی تدریس کیا فقیر کے بس کی بات ہے، —— بہر حال فقیر کی حد تک تو جناب والا کی یہ سفارش اور کچھ نہ ہو تو ایک سند کی حیثیت رکھتی ہے، میں نے تو آپ کے گرامی نامہ کو محفوظ کر لیا ہے کہ امام المؤرخین فی عصرہ کی طرف سے یہ سرفرازی ہے، یوں بھی امراض کے ہجوم، پیرانہ سالی تشتت بال نے کیا اس کا موقع باقی چھوڑا ہے، کہ کسی نئے تدریسی مضمون کے لئے اپنے کو تیار کروں۔“

(مکتوب ۲۵ر دسمبر ۱۹۴۸ء شائع شدہ معارف جولائی ۱۹۶۳ء)

طبیعت کا حال | ایک گرامی نامہ میں حضرت سید صاحب کو لکھتے ہیں:۔

”آپ نے ارقام فرمایا تھا کہ علی گڈھ پہونچ کر لوگوں سے مل لوں، لیکن دل اس قسم کے امور میں ملنے ملانے پر آمادہ نہیں اور سچی بات یہ ہے کہ نہ عمر ہی ملازمت کی رہ گئی ہے، اور نہ بحمداللہ کچھ ایسی تنگی ہے، اس قسم کے کسی مقام کی طرف تھوڑا بہت میلان اگر باقی ہے، تو صرف مشغلہ اور دل بستگی کے لئے۔“

اخیر میں معذرت فرمادی اور صفائی سے لکھا:۔

”علی گڈھ کے لئے آپ دونوں حضرات فقیر کے لئے کوشش کیوں

کر رہے ہیں، میری صحت اس قابل نہیں کہ ملازمت کی ذمہ داری قبول کروں، اور بحمد اللہ بظاہر معاشی حیثیت سے بھی کوئی ضرورت ملازمت کی معلوم نہیں ہوتی ہے۔"

ریٹائر ہونے کے بعد توسیع کی مدت بتدریج ختم ہو رہی تھی، اور یہ خط وکتابت چل رہی تھی، آدمی جہاں رہتا ہے اس جگہ اور ماحول سے طبعی انس پیدا ہو ہی جاتا ہے، اور بار بار سوچتا ہے جب یہ جگہ چھوڑنا پڑے گی تو پھر کیا صورت اختیار کی جائیگی مولانا گیلانی اسی دور سے گذر رہے تھے۔

ملازمت کا جب اخیر زمانہ آگیا تو سید صاحبؒ کی خدمت میں لکھا:۔

"میری ملازمت کا یہ آخری مہینہ ہے، اس وقت تک تو دل مطمئن نہ تھا، لیکن ایک جگہ پڑا ہوا تھا، اب کہاں جاؤں، سردست اس کے سوا کچھ سمجھ میں نہیں آتا کر گیلانی چلا جاؤں، یہ بھی اپنا خیال ہے، مگر عالم کی باگ جس کے ہاتھ میں ہے اس کی مشیت کیا ہے کچھ نہیں معلوم"۔ (مکتوب یکم مارچ ۱۹۴۹ء)

ریٹائرمنٹ الحمد للہ کر کے مارچ کا مہینہ بھی ختم ہوا، اور مولانا نے یہ اطلاع دی۔

"آخر وہ گھڑی آ ہی گئی، جس کا تیس سال پہلے انتظار شروع ہوا تھا، درمیان میں سبکدوشی یا گلو خلاصی کی کوشش بھی کی گئی تھی، لیکن مصلحتِ الٰہی نے کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیا، ۳۱ مارچ ۱۹۴۹ء بعد ظہر جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات کی صدارت کا جائزہ دے دیا ــــ دو تین دن بعد اسی گاؤں کیطرف واپسی کا ارادہ ہے جس سے تقریباً نصف صدی پہلے روانہ ہوا تھا"

(مکتوب ۱۴ اپریل ۴۹ء)

حیدرآباد سے گیلانی بالآخر حیدرآباد چھوڑنے کا فیصلہ کرنا پڑا، اور ریٹائر ہونیکے بعد مولانا اپنے وطن گیلانی ضلع پٹنہ تشریف لے گئے، اس عرصہ میں بہار کے حالات بھی بڑی حد تک ٹھیک ہو چکے تھے، گھر پہونچ کر مولانا نے سید صاحب کو اطلاع دی:

"یکم اپریل ۱۹۴۹ء کو رقیت کی زنجیر پاؤں سے نکلی، گیلانی، اہل وعیال کے ساتھ بخیر وعافیت پہونچ گیا، بظاہر امن وامان بھی معلوم ہوتا ہے"

اگست ۱۹۴۷ء کے بعد حالات جب خطرناک ہو گئے تھے تو گیلانی کو وہاں کے مسلمانوں نے قطعی طور پر خالی کر دیا تھا، جب امن وامان ہوا، تو پھر لوگ لوٹ لوٹ کر اپنے گھروں میں آباد ہو گئے۔

قیامِ وطن کے زمانہ میں دعوتیں قیامِ وطن کے زمانہ میں مختلف یونیورسٹیوں نے پیشکش کی، اصرار سے بلایا، مگر کہیں جانا پسند نہیں کیا، پنجاب یونیورسٹی نے ڈیڑھ ہزار ماہانہ کی جگہ پیش کی، کراچی یونیورسٹی نے بطور خاص دعوت اور اصرار کے ساتھ بلایا۔

مولانا کا اکلوتا لڑکا محی الدین پاکستان میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھا اس نے چاہا کہ مولانا ان کے پاس آجائیں، مگر مولانا نے گیلانی چھوڑنا پسند نہیں کیا، یہ درست ہے کہ صحت کچھ زیادہ موافق نہیں تھی، لیکن دراصل یہ سب دنیا سے بے نیازی اور بے رغبتی کا نتیجہ[1] تھا۔

مولانا گیلانی ایک کھاتے پیتے اور صاحب جائداد عالم دین تھے، آم کے کئی باغات تھے، کاشت کی زمین بھی کافی تھی جس میں مختلف فصلیں ہوتی تھیں۔ مگر مولانا کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ یہ سب ان کے منجھلے بھائی مولوی مکارم احسن کی تحویل میں تھا۔

مولانا کی زندگی کا نقشہ صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب نے درست لکھا ہے:۔

[1] دیکھئے، معارف اعظم گڈھ اپریل ۱۹۵۷ء

"ان کی سادگی دیکھ کر ان کے علم کی گہرائی کا یقین نہ آسکتا تھا، اور اس گہرائی کو دیکھ کر ان کی سادگی پر تعجب ہوتا تھا، ان کی کل کائنات ایک چارپائی تھی، اسی پر قلم دوات رکھ لیتے اور علم وفن کا خزانہ لٹاتے رہتے، چارپائی کے بغل میں دو تخت تھے، ان پر معمولی فرش اور اس کے اوپر ایک قالین تھا، قالین اور فرش کے درمیان ان کا دفتر تھا، ان کے سارے کاغذات اور خطوط قالین کے نیچے پڑے رہتے تھے، کمرے میں چار بڑی الماریاں تھیں جن میں منتخب کتابیں تھیں، یہی ان کا آفس اور کتب خانہ سب کچھ تھا، لکھتے لکھتے جب تکان محسوس کرتے، تو چارپائی کے نیچے ہاتھ بڑھا کر ٹین کا ایک معمولی سا ڈبہ گھسیٹتے، اس میں مٹی کے تین کلھڑوں میں کتھا، چونا اور ڈلی تھی، اور کپڑے کے ایک ٹکڑے میں کچھ پان لپٹے ہوتے، یہ پاندان ان کی ساری زمین داری کھیتی باغ اور گراں قدر تنخواہ کا حاصل تھا، جس کے وہ بلا شرکت غیرے مالک تھے، بقیہ کسی چیز سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا، اس ڈبہ سے پان کی گلوری بناتے اور اس کو کھا کر تازہ دم ہوجاتے، اور ان کا نہ تھکنے والا قلم پوری تیزی کے ساتھ رواں ہوجاتا۔"

(معارف اپریل ۱۹۵۷ء)

ایک حاضری کے موقع سے مولانا کے پاس جو کاغذات اور کتابیں تھیں ان کو اُلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا، مولانا کے قلم کی لکھی ہوئی چند چیزیں ملیں۔

مختلف یونیورسٹیوں کے اگزامینر | مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ جب تک عثمانیہ یونیورسٹی میں رہے، بہت سی دوسری یونیورسٹیوں کے اگزامینر بھی رہے، سالانہ امتحانات

کے پرچے آپ کے پاس آتے تھے، اور آپ انھیں جانچ کر واپس کرتے تھے، مولانا نے اپنی یادداشت میں اپنے قلم سے لکھ رکھا تھا۔

"سابق پروفیسر وشیخ الحدیث وچیرمین شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن، واگزامینر مسلم یونیورسٹی، ڈھاکہ یونیورسٹی، لکھنؤ یونیورسٹی اورنگل یونیورسٹی لاہور، پنجاب وبہار یونیورسٹی۔"

موجودہ اپنا حال | اس کے بعد یہ بھی لکھ رکھا تھا۔

"وحال مریضے وعلیلے کہ از جائے خویش ہم تلامذہ معالجین افرنگ اجازتِ جنبش نہ دہند، وگویند کہ قضائے حاجت ہم بر بستر علالت خود کنند، والاسیموت ولعل اجلہ المسمیٰ لیس ببعید۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیماری کے ان دنوں میں جب دنیاوی زندگی سے بڑی حد تک مایوس ہوچکے تھے، بے ساختہ یہ سطریں مولانا مرحوم کے قلم سے نکلی ہیں۔

مولانا کی سوانح اپنے قلم سے | اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ چند سطروں میں اپنی زندگی کا خلاصہ بھی لکھ دیا تھا، ——— تحریر فرمایا:

"تعلّم فی المدرسۃ الخلیلیۃ عند رئیس الفلاسفۃ والمناطقۃ مولانا برکات احمد البہاری، التونکی والحدیث عند شیخ الہند والامام الکشمیری، وغیرھما،"

پھر یہ بھی لکھ ڈالا۔

"صنف کتباً وحرّر مسائل فی مقالاتہ العلمیۃ فمن مصنفاتہ النبی الخاتم، احسن کتب

واحلاھا، والدین القیم واسلامی معاشیات
ومسلمانان ہند کی تعلیمی تاریخ وامام ابوحنیفہ کی سیاسی
زندگی وغیرہ ذلک من الکتب والرسائل۔"

آدمی جب تنہائی میں گھبراتا ہے کوئی پاس نہیں ہوتا تو اس طرح کی باتیں یاد آ آ کر زخم لگاتی ہیں اور انسان اپنی بے بسی پر حیرت زدہ ہوتا ہے، کہ کیا تھے کیا ہو گئے"، اور پھر رجوع الی اللہ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اور اپنے کو رب العالمین کے سپرد کر دیتا ہے۔

دیکھ رہے ہیں اس وقت بھی مولانا کی جدت طبع کچھ حالات اردو میں لکھے کچھ فارسی زبان میں اور کچھ عربی زبان میں، مولانا کی اور بہت ساری یادداشتیں نوٹ کر کے لایا تھا، مگر افسوس وہ سارے کے سارے کاغذات ہی ایک حادثہ میں جاتے رہے جس کا غم ساری عمر رہے گا۔

مولانا گیلانی کی عادت تھی کہ کتاب پڑھتے ہوئے جو بات جہاں ذہن میں آتی، اس کتاب کے شروع میں سادے اوراق پر لکھ دیا کرتے تھے، ان کی بہت ساری کتابوں میں اس طرح کے لکھے ہوئے دل چسپ نوٹ ملتے ہیں، اور کوئی شبہ نہیں کہ یہ نوٹ بڑے قیمتی اور کار آمد ہیں اور اہل علم کے لئے نشانِ راہ کے کام دیتے ہیں، اور استخراج واستنباط مسائل میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ستیر سازی

مولانا گیلانی کی ابتدائی اور تعلیمی زندگی مدارس دینیہ میں گذری تھی، دن۔ رات علماء کرام کی ہی صحبت میں رہا کرتے تھے، اسی ماحول میں پرورش اور تعلیم و تربیت ہوئی تھی، ان نوجوانوں اور اساتذہ سے کوئی تعلق نہیں تھا جو اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھتے پڑھاتے ہیں، مگر قدرت نے جب آپ کو دیوبند سے حیدرآباد پہونچایا، اور وہاں عثمانیہ یونیورسٹی میں استاذ مقرر ہوئے، تو دفعتہً آپ کا تعلق دن رات کا قدیم ــــ تعلیم یافتہ (علماء) سے کٹ کر جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے ہو گیا، انگریزی دور حکومت میں جن کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، کیوں کہ انگریز ہی اس وقت ہندوستان کے حکمران تھے۔

قدیم وجدید طبقہ میں بُعد! یہ ظاہر ہے کہ انگریزی ڈپلومیسی کی وجہ سے ان دونوں طبقوں میں کافی بُعد تھا، اور کہنا چاہئے ایک طبقہ دوسرے طبقہ سے کٹا ہوا تھا قدیم طبقہ عام طور پر انگریزی پڑھنے والوں کو راہ راست سے بھٹکا ہوا سمجھتا تھا، بلکہ سخت قسم کے قدامت پسند انھیں گمراہ اور ملحد تک کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے، اسی طرح جدید تعلیم یافتہ طبقہ علماء کو قدامت پسند، نئے تقاضوں سے بیگانہ، ترقی کی راہ میں حائل اور حالات زمانہ سے چشم پوشی کرنے والا سمجھتا تھا۔

یہ درست ہے کہ حیدرآباد ایک آزاد مسلمان ریاست تھی، وہاں کا نواب علم نواز اور علماء پسند تھا، پھر عثمانیہ پہلی یونیورسٹی تھی جو حیدرآباد ریاست میں قائم ہوئی تھی، بہت ساری ایسی چیزیں وہاں نہیں تھیں جو ملک کی دوسری یونیورسٹیوں میں

پائی جاتی تھیں مگر بہرحال تھی انگریزی یونیورسٹی، اس کے اساتذہ جدید تعلیم یافتہ تھے پھر یہ کہ یہ ریاست انگریزی حکومت کے ہی زیر سایہ قائم تھی، اس لئے وہ نئے اثرات سے پاک نہیں کہی جاسکتی ہے۔

مولانا جامعہ کے ماحول میں مولانا گیلانی کے لئے اس جامعہ کا ماحول نیا تھا، اور مدارس اسلامیہ کے اعتبار سے قطعًا بدلا ہوا، اور پھر کچھ عرصہ گذر جانے کے بعد یونیورسٹی کے ماحول میں بھی کافی جدّت آگئی تھی، لیکن مولانا مرحوم نے اس ماحول میں رہ کر اپنے علم وفضل، وسیع مطالعہ اور کشادہ دلی سے ان سب کو متأثر کیا، خود متاثر نہیں ہوئے، اور یونیورسٹی کے حلقہ میں دینی ماحول پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی، گو ابتدا میں آپ کو بہت کافی اس ماحول سے لڑنا پڑا، اور جدوجہد کرنا پڑی۔

جدید تعلیم حاصل کرنے والوں کی فکر یونیورسٹی کے تعلق سے ان نوجوانوں کے ذہن وفکر سے بہت اچھی طرح واقف ہوچکے تھے، جو ملک کے مختلف حصّوں میں سرکاری تعلیم گاہوں میں پڑھ رہے تھے، کہ انکا انداز فکر کیا ہے، یہ مذہبی تعلیم سے علمًا وعملًا کس قدر دور ہیں، اور موجودہ دور کا سیلاب انھیں کس قدر پامال کرسکتا ہے

اقامت خانے کی تجویز اس لئے مولانا گیلانی نے "اقامت خانے" والی تجویز اہلِ علم کے سامنے پیش کی، کہ ہر شہر میں مسلم اقامت خانے قائم کئے جائیں، جہاں اسکول، کالج اور یونیورسٹی میں پڑھنے والوں کے قیام وطعام کا قیمتاً نظم ہو، مگر یہ ارزاں سے ارزاں تر ہو اور ساتھ ہی بہت عمدہ، صاف ستھرا اور آرام دہ ہو، تاکہ یہاں ان کی ذہنی نشو ونما اسلامی طرز سے ہوسکے، دل ودماغ میں دینِ قیّم کا نفوذ، اور علمی وعملی دونوں نہج سے دینی تربیت کا معقول انتظام ہو۔

خلاصۂ تجویز اس کی جو تشریح مولانا عبد الباری ندوی رح نے کی ہے، اس کا ایک مختصر

اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"انفرادی واجتماعی زور، ہر جگہ چھوٹے بڑے اور ممکن حد تک ارزاں سے ارزاں اسلامی اقامت خانوں (ہاسٹل) قائم کرنے کرانے پر لگانا چاہئے ان میں ممکن حد تک بقدر ضرورت دینی تعلیم اور درس سے بڑھکر حتی المقدور بہتر دینی تربیت کی فضا، ماحول کا انتظام کرنا چاہئے خود ہاسٹل میں ان کے نگراں کے علاوہ بھی ان کا ملنا جلنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا جہاں تک ہوسکے کچھ نہ کچھ ایسے افراد اور جماعت کے ساتھ ہوتا رہے، جو ایمان اور عملِ صالح کی زندگی میں خود ذرا اچھے زندہ نمونہ ثابت ہوں، اور بات چیت بھی ان سے ان کے ذہنی میلانات ورجحانات کو جان پہچان کر کر سکتے ہوں، کتابی تعلیم کا بار زیادہ نہ ہو، روزہ اور نماز باجماعت کی پابندی تو لازم ہونا ہی چاہئے، اس کے ساتھ زیادہ زور معاملات اور اخلاق کی اصلاح پر رہے، کتابی تعلیم میں آدھ گھنٹہ نماز فجر کے بعد ہی قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر، اس کے علاوہ حدیث کا ایسا انتخاب جس میں ایمانیات کے ساتھ اعمال صالحہ اور ان میں خصوصًا حقوق عباد، معاملات اخلاق اور معاشرت پر زیادہ توجّہ دلائی گئی ہو، اور روزمرّہ پیش آنے والے ضروری فقہی مسائل کا مجموعہ۔"

(مکاتیبِ گیلانی ص۲۱)

اوصاف نگرانِ اقامت خانہ اس تجویز میں ایک جز، لازم یہ بھی ہے کہ اقامت خانے کے ذمّہ دار نگراں ایسے اساتذہ یا علماءِ روشن ضمیر ہوں جو خود اپنے اخلاق ومعاملات میں مضبوط ہوں، اور حقوق العباد اور حقوق اللہ کی اہمیت سے واقف اور ان پر

عمل پیرا ہوں، تاکہ ان کے اخلاقی اثرات سے اقامت خانے کے مقیمین طلبہ پر خاطر خواہ عمدہ اثرات مرتب ہوں،

اس تجویز کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ اس اقامت خانے میں اچھی دینی، علمی تعلیمی اور منتخب کتابوں کی ایک لائبریری ہو جس میں بیٹھ کر اقامت خانے کے جدید تعلیم پانے والے طلبہ مطالعہ کر سکیں، اور بتدریج ذوق مطالعہ میں اضافہ کی صورت پیدا ہوتی رہے، کتابیں ایسی ہوں جو ذہن و فکر کی نشوونما میں مدد پہونچا سکیں، اور سیرت سازی پر اثر انداز ہوں، اگر کسی مسئلہ میں خواہ اس کا تعلق اعتقادات سے ہو یا معاملات سے کسی پڑھنے والے کو شک و شبہ ہو تو نگراں اس کی تشفی کرا دے اور ذہن کی گرہ کھول دے، طلبہ کو اپنے شکوک و شبہات پیش کر کے تشفی بخش جواب حاصل کرنے کی آزادی ہو۔

مولانا دریا بادی کی رائے | مولانا عبد الماجد دریا بادی مرحوم نے اس تجویز کے سلسلہ میں ایک دفعہ صدق جدید مورخہ ۱۷ر جنوری ۱۹۶۴ء میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا تھا

"اب تو سفر یورپ سے واپسی پر ماشاء اللہ خود ہمارے علی میاں اس کفرستان تک تعلیم پانے والے مسلمان طلبہ کے لئے یہ تاثر اور پیام لے کر آئے ہیں کہ جہاں تک مسلمان طلبہ اور نوجوانوں کا تعلق ہے، جو یہاں لاکھوں کی تعداد میں، انگلستان، فرانس، جرمنی اسپین میں زیر تعلیم ہیں، ان کی اصلاح و تربیت اور ان کی اسلامیت کی حفاظت کے لئے سب سے بہتر نسخہ وہ ہے، جو ہندوستان کے لئے مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے تجویز کیا تھا، اور اب ہمارے مولانا عبد الباری ندوی اس کے علمبردار اور داعی ہیں، یعنی طلبہ کے لئے اقامت خانوں کی تاسیس اور

ان میں اچھے نگراں اور مربی کا انتظام"۔ (مکاتیب گیلانی ص۳۲)

یہ واقعہ ہے کہ حضرت مولانا گیلانی کی تجویز "اقامت خانوں" کا قیام اور ان میں جدید تعلیم پانے والوں کی تربیت اور ذہنی نشوونما کا انتظام بہت دوررس نتائج پر مشتمل تھا، اور ذہن و فکر اور علم و عمل کی آبیاری کے لئے بے انتہا فائدہ بخش مگر جہاں تک میرے علم اور معلومات کا تعلق ہے، ہندوستان میں کہیں اس کا تجربہ نہیں کیا گیا۔

مولانا علی میاں ندوی کی رائے | مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ نے لکھا ہے:

"اس وقت عالم اسلام کا سب سے بڑا فتنہ اسی نوخیز نسل کا غیر اسلامی بلکہ معاند اسلام ذہن اور نفاق ہے۔ جس نے تمام اسلامی ممالک کو الحاد و زندقہ کے دوراہے پر کھڑا کر دیا ہے، اور ایک سخت ذہنی انتشار اور کشمکش بلکہ اسلام کے خلاف بغاوت کا علمبردار بنا دیا ہے، مولانا (سید مناظر احسن گیلانی) کی یہ بڑی دینی بصیرت تھی، کہ انھوں نے اسلامی "اقامت خانوں" کی تجویز پیش کی، جو کم از کم ہندوستان کے موجودہ حالات میں اس مسئلہ کا ایک علمی اور معقول حل ہے"۔

عمل ندارد | بلاشبہ اس تجویز کو سراہا ہر ایک دور اندیش نے، مگر افسوس یہ ہے اسکا تجربہ کسی بھی شہر میں نہیں کیا گیا اور مسلمانوں کا کوئی طبقہ اس تجویز پر عمل کرانے میں آگے نہیں آیا، مسلمان نوجوان یورپ کی تہذیب اور غلط نظریات سے متاثر ہوتے رہے، ان میں گمراہی آتی رہی، اور ہم سب دیکھتے رہے، اور آج بھی دیکھنے پر مجبور ہیں۔

مولانا گیلانی اس میدان کے عملی انسان نہیں تھے، کہ اس کے لئے

دورہ کرتے، عوام میں تقریر کرتے، خواص کو جھنجھوڑتے اور مسلمانوں میں صور پھونکنے کے لئے جدوجہد کرتے، مولانا مرحوم نہ لیڈر تھے، اور نہ سیاسی میدان کے نشیب و فراز سے آشنا، وہ ایک استاذ تھے، اور طلبہ یونیورسٹی کا تجربہ رکھتے تھے، اس تجربہ کی روشنی میں آپ نے اپنی یہ تجویز اخبار کے ذریعہ عوام و خواص کے سامنے پیش کی، بعض بااثر اہل علم کو متوجہ کیا، تاکہ وہ اس اسکیم کو بروئے کار لانے کی تدبیریں عمل میں لائیں۔

اس تجویز پر عمل کی ضرورت مختصر یہ کہ یہ تجویز آگے نہ بڑھ سکی اور مولانا اس کی حسرت لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے، اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے۔ اس کا اجر بہر حال آپ کے اعمال نامہ میں درج ہوا ہوگا — اور بہت ممکن ہے آئندہ خدا کا کوئی وفادار بندہ اس اسکیم کو بروئے کار لانے کی عملی جدوجہد کرے، کیونکہ حالات وہی ہیں۔ جو انگریزوں کے دورِ حکومت میں تھے بلکہ بعض اعتبار سے حالات پہلے سے زیادہ سنگین ہیں اور مسلمان نوجوانوں کو مختلف راستوں سے گمراہ کرنے کی تدبیریں جاری ہیں، بالخصوص مذہب بیزاری یا خدا بیزاری پر بڑی طاقتیں جو کچھ کر رہی ہیں، وہ کسی باخبر سے مخفی نہیں ہے، الحاد کا ایک طوفان ہے، جو مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک انسانی ذہنوں کو متاثر کرنے میں کام کر رہا ہے، بہت سے عرب ممالک اس کی لپیٹ میں آچکے ہیں، ہمارا ملک بھی اس طوفان سے دوچار ہے۔

آزاد ہندوستان کا حال آزاد ہندوستان میں بڑی تیزی کے ساتھ مذہب بیزاری کا صور پھونکا جا رہا ہے، اور اس کے پروپیگنڈے پر بڑی طاقتیں کافی سرمایہ خرچ کر رہی ہیں، نوجوانوں میں ایسا لٹریچر پھیل رہا ہے، جو ان کو مذہب سے دور کر دے، مسلمانوں میں اس سیلاب پر آہنی دیوار دینی مدارس ہیں، اور ۱۸۵۷ء

کے بعد یہی اسلامی قلعے شمار ہو رہے تھے، مگر یہ بھی اس نرغے میں آتے جا رہے ہیں ایسی صورتیں سامنے لائی جا رہی ہیں کہ مدارس اسلامیہ خود مسلمانوں کی نظر میں بے وقعت ہو جائیں، اور اسی کے ساتھ علماء سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھتا چلا جائے۔

بیدار دماغی کی ضرورت کہنا چاہیے اگر ہمارے ذمہ دار علماء نے دور اندیشی سے کام نہیں لیا، تو یہ آہنی دیوار جو ہمارے اسلاف نے قائم کر دی تھی مسمار ہو کر رہ جائے گی، اور خدا بیزاری کا دیو ملک میں دندناتا پھرے گا، اور مذہبی طبقہ کی زبانوں پر قفل چڑھ جائے گا، وہ بولنا چاہیں گے مگر نہیں بول سکیں گے، یا کچھ بولنے کی سعی کریں گے تو کوئی سننے پر آمادہ نہ ہوگا، بلکہ یہ بولنے والے مطعون کئے جائیں گے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آج جن پر زیادہ ذمہ داریاں ہیں، وہی خاموش ہیں، یا ان کو اپنے عمل سے تقویت دے رہے ہیں، مصلحتوں یا نفعِ عاجل یا بے جا خوف سے ان کی زبانیں گنگ ہیں، غیر مذہبی لوگوں کا رویہ حد درجہ خطرناک ہے، خواہ ان کا تعلق حکومتِ وقت سے ہو، یا عوام سے، علامہ اقبالؒ نے سچ کہا ہے ؎

جلالِ بادشاہی ہو یا جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مولانا میدانِ تحریر و تصنیف میں

کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مولانا گیلانی میں بہت ساری خوبیاں جمع کر دی تھیں، جہاں وہ درس و تدریس میں نمایاں مقام رکھتے تھے، اور تقریر میں شہرت کے مالک تھے وہیں مولانا تحریر کے بھی بادشاہ تھے، حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ آپ کو "سلطان القلم" لکھا کرتے تھے، تحریر کا ذوق طالب العلمی کے زمانہ سے تھا، منطق کی اصطلاحات پر ٹونک میں ایک پورا ڈرامہ تیار کر دیا تھا، جس کو دیکھ کر ان کے استاذِ محترم حضرت مولانا سید برکات احمد صاحبؒ نے انہیں "شبلی کا انڈا" کہا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے طالب العلمی سے لکھنے کا اچھا شعور تھا اور اپنے مافی الضمیر کو عمدہ، عام فہم اور سلیس انداز میں بیان کرنے پر قدرت تامہ رکھتے تھے، گو اس کے بعد ٹونک کے دور طالب العلمی میں کوئی مقالہ یا مضمون لکھنے کا پتہ نہیں ملتا، کیوں کہ وہاں اس کا کوئی ماحول بھی نہیں تھا، قدامت ہی قدامت تھی، اور خالص منطق و فلسفہ پڑھایا جاتا تھا، آپ کے استاذِ محترم اُردو کتابوں کے پڑھنے کے سخت مخالف تھے، مولانا چھپ کر کچھ مطالعہ کر لیا کرتے،

دارالعلوم میں ادبی ذوق دارالعلوم دیوبند میں قدم رکھا تو ذہن کھلا اور داخلہ کے پہلے ہی سال یہاں کے طلبہ کو اشتہار کا دلچسپ مضمون لکھ کر دیا، جس میں لحاف ملنے کی تاخیر پر خاموش احتجاج تھا، اور اس اشتہار کا عنوان حافظ شیرازیؒ کے شعر

شب تاریک و بیمِ موج، گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما، سبکسارانِ ساحلہا

میں تصرف کر کے یہ لکھا تھا ؎

شبِ سرما، وبیمِ موت، افلاسے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما، خداوندانِ توشکہا

(دیکھئے دارالعلوم ربیع الاول سنہ ۷۱ھ)

جس اشتہار کی یہاں کے ماحول میں دھوم مچ گئی تھی کہ کس نے اتنا عمدہ دلچسپ مضمون لکھا، جس کو سارے لیڈر طلبہ اپنی طرف منسوب کرتے ہوئے فخر محسوس کر رہے تھے، اور مولانا خاموش تھے۔

شیخ الہندؒ کا حکم برائے مضمون نویسی دارالعلوم دیوبند میں قیام کا پہلا ہی سال تھا اور دورۂ حدیث میں ابھی داخل ہی تھے کہ استاذ العلماء شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن عثمانی قدس سرہٗ نے ایک دن اپنے عزیز شاگرد سے فرمائش کی، کہ جب تم لکھنے پڑھنے کا ذوق رکھتے ہو، تو دارالعلوم کے رسالہ القاسم کے لئے مضمون کیوں نہیں لکھتے؟

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طالب العلمی میں مولانا گیلانی کی تحریر کا شہرہ ہو چکا تھا، اور جب بحیثیت دورۂ حدیث کے ایک طالبُ العلم کے آپ کا پہلا مضمون "خیر الامم کا طغرائے امتیاز" القاسم میں شائع ہوا، تو ایک دنیا آپ کی تحریری استعداد سے واقف ہوئی، اور فراغت کے بعد آپ کو رسالہ القاسم والرشید میں لکھنے کے لئے منتخب کر لیا گیا، اور ڈیڑھ سال دارالعلوم میں دوسرے کاموں کے ساتھ، زیادہ تر تحریری مشغلہ جاری رکھا، اور بہت سارے مضامین و مقالات تحریر فرمائے، جس کی تفصیل گذر چکی۔

القاسم والرشید اور مولانا پہلے لکھا جا چکا ہے کہ آپ کے قلم سے القاسم و الرشید میں کافی مضامین نکلے، کبھی کبھی مضامین کی کمی ہوتی تو پرانی کتابوں کے

کسی قیمتی حصہ کا ترجمہ کر کے اس کو پورا کرتے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ:۔

"ادارت کا فرض فقیر کے سر ڈال دیا گیا، تنہا دو، دو پرچوں کو اوّل سے آخر تک مضامین سے بھرنا یوں بھی مجھ جیسے نومشق طالب العلم کے لئے آسان نہ تھا۔" (رسالہ دار العلوم)

سلطان القلم یہ واقعہ ہے کہ تحریری لائن پر مولانا ئے محترم کو اوّلاً آپ کے استاذ محترم، استاذ العلماء حضرت شیخ الہند رح نے لگایا تھا اور ان کی ہی کرامت اور توجہ سے کچھ دنوں بعد مولانا گیلانی کو سلطان القلم اور رئیس التحریر لکھا جانے لگا شروع میں ان رسالوں میں مقالات و مضامین شائع ہوتے رہے، مگر بعد میں یہی مقالات کتابی صورت میں بھی شائع ہوئے، یہ درست ہے کہ جو کچھ آپ نے لکھا بڑی جانکاہی کے ساتھ لکھا، وہ مضامین اور کتابیں بحمد اللہ آج بھی موجود ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کا اسلوب بیان، طرز نگارش اور جامعیت کی شان اوّل دن سے ہی پسندیدہ اور عمدہ تھی، جو بعد میں نکھرتی چلی گئی، اور لوگوں کے دلوں میں اس کی جگہ بنتی چلی گئی۔

تحریر کا حال مولانا گیلانی دوسرے مصنفین کی طرح کسی خاص عنوان پر پوری تیاری اور مطالعہ کے بعد نہیں لکھا کرتے تھے۔ اس لئے کہ آپ ترتیب و تزئین وغیرہ کے زیادہ قائل نہیں تھے، برجستہ جو قلم پر آتا گیا اور لکھتے چلے گئے، جب نہیں لکھتے تو ہفتوں بلکہ مہینوں قلم نہیں اٹھاتے اور جب لکھنے پر آتے تو دن رات ایک کر ڈالتے، اور جب تک ذہن اور دماغ کا سارا مواد کاغذ پر نہیں آجاتا رُکنے کا نام نہیں لیتے، مولانا عبد الباری ندوی رح جو ۳۵ - ۳۶ سال مولانا کے ساتھ رہے، انکا ذمہ دارانہ بیان ہے:

"لکھنے کا بھی یہی حال کہ نہ لکھتے تو مہینوں سالوں کچھ نہ لکھتے، اور لکھنے پر آجاتے تو دن رات ایک کر دیتے، رات رات بھر پلک نہ جھپکاتے، پہلو میں تکیہ دبائے نیم دراز پلنگ ہی پر لیٹے لیٹے اور اکثر پنسل ہی سے ہفتوں کیا دنوں میں سیکڑوں صفحات کی کتاب پوری کر ڈالتے۔" (مکاتیب گیلانی ص ۴۳)

قلم کی روانی مولانا ندوی رح کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا پر خود فراموشی کا عالم اس طرح مسلط رہتا کہ کھانا، پینا سونا جاگنا، بستر، کپڑا، ہر چیز سے آزاد رہتے، جس نے جو کر کے دیدیا قبول فرمالیا۔

"بس ہر شئی کا وہی حال جو ان کی تصانیف کا کہ تصنیفی موضوع کے قید و بند سے آزاد ہے۔" (ایضاً ص ۴۴)

خود ایک خط میں مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں۔

"ایک دفعہ جھونک میں لکھنے بیٹھا تو لکھتا چلا گیا، اب پھر اس پر نظر ثانی، حک و فک اور اصلاح میرے لئے مشکل ہے۔"

(معارف ۶۳ء)

مگر قلم کی روانی اور ذہن و فکر کی بلند پروازی میں یگانۂ روزگار تھے، جس موضوع اور عنوان پر قلم اٹھاتے، ایسا معلوم ہوتا کہ سمندر ہے، جوش مار رہا ہے، جدید و قدیم دونوں مواد اور معلومات کا بڑا ذخیرہ مولانا کے ذہن و دماغ میں جمع رہتا تھا جو لکھتے وقت صفحات قرطاس پر پھیلتا جاتا تھا۔

مولانا عبد الباری ندوی رحمہ نے لکھا ہے:۔

"تقریر سے آگے تحریر و تصنیف کو دیکھئے تو گیلانی کا اشہب قلم اس میدان میں بھی بڑے بڑے ہم چشموں سے پیچھے نہیں، نہ کتا" نہ

کیفًا، ایک متبحر عالم دین کی میزان پر دیکھئے تو معقول و منقول، تفسیر و حدیث، فقہ و کلام، سیرت و سوانح، تعلیم و تصوف وغیرہ وغیرہ جس شعبہ میں جو کارنامہ چھوڑا ہے، کیا اس کو صفِ اوّل کی ممتاز جگہ سے بھی کم کسی جگہ پر رکھا جا سکتا ہے۔" (مکاتیب ص۳۸)

عصری مطالبات پر تصنیف آگے رقمطراز ہیں:۔

"خالص عصری مطالبات یا نئے چلن کی چیزوں میں اسلامی پہلو سے جو بیسیوں مضامین و مقالات اور کتابیں ان کے قلم کی مرہونِ منت ہیں، ان میں مثلاً ایک اسلامی معاشیات کیا اپنے موضوع کے خاص نقطۂ نظر سے کسی ہم پلہ کتاب کے مقابلہ میں کم وزن ہے، یوں بھی بالعموم ان کے نوشتوں میں جدید معلومات اور مواد پر جتنی اطلاع ملتی ہے، خود جدید تعلیم کے دعویداروں میں بھی کتنے مقابلہ کر سکتے ہیں؟ تحقیق و تنقید کے جدید معیار پر بھی ان کی کتنی چیزیں ایسی ملیں گی، جن کے اخذ و استفادہ کے بل پر یورپ و امریکہ کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی جا سکتی ہے۔ خود اپنے شاگردوں سے آخر خود ہی ریسرچ کا کام لے کر اور کرا کے کتنوں کو ڈاکٹر بنا ہی دیا۔" (مکاتیب ص۳۹)

ربط و ترتیب کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ مولانا کی تحریر میں ترتیب و ربط کی کمی ہے، اور اسے جذب کا اثر بتایا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک خاکسار کے مطالعہ کا تعلق ہے، ربط بھی ہوتا ہے اور ترتیب بھی، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ معمولی ربط کی وجہ سے اگر کوئی دوسری کارآمد چیز ہے، تو مولانا اسے بھی سمیٹ لینے کی سعی کرتے ہیں۔ جیسا کہ پُرانے مصنفین کا طریقہ ہے، پھر یہ کہ مولانا کی تحریر میں آمد ہی آمد ہوتی ہے۔ آورد کا نام و نشان نہیں ملتا، اس لئے پڑھنے

والا ایک خاص قسم کی دلچسپی محسوس کرتا ہے، اور شروع کرنے کے بعد چھوڑنے کا نام نہیں لیتا، اسی کے ساتھ مولانا کی تحریر میں بہت سارے ایسے نایاب مواد یکجا مل جاتے ہیں جو کہیں اور نہیں ملتے، مولانا کی دُور بیں نگاہیں جہاں تک پہونچتی تھیں ہر مصنف کا ذہن وہاں تک نہیں پہونچ پاتا ہے۔

مولانا کا اندازِ تحریر یہ ضرور ہے کہ مولانا اپنے مسودوں کو دوبارہ نہیں پڑھتے تھے اور دوسرے مصنفین کی طرح اس کی کاٹ چھانٹ کرنے کی زحمت سرے سے گوارہ نہیں کرتے تھے اور نہ اس کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ خود مولانا نے لکھا ہے۔

"ایک بہت بڑے ماہر کا مشورہ یہ ہے کہ موجودہ ترتیب کو بدل کر مضامین کی ترتیب کی جو شکل اختیار کی جائے گی، اس میں "آورد" کی بدمزگی کے ساتھ "آمد" کا لطف جاتا رہے گا، ان کا خیال ہے کہ اس قسم کی کتابوں کو جو محض کتاب بنانے کے لئے نہیں لکھی گئی ہیں، بلکہ دوسرے مقاصد کے حصول کا ذریعہ انکو بنایا گیا ہو، ان کے لئے یہ قطعًا غیر مناسب ہے کہ آبپاشی کی رپورٹ یا بنیوں کا مُدَوّار کھاتہ ان کو بنا دیا جائے، ان کی رائے ہے کہ جس حال میں کتاب قلم سے نکل پڑی ہے، اسی حال میں چھوڑ دیا جائے۔" (نظام تعلیم و تربیت ج۲ ص۳)

وسعت ظرفی اسی کے ساتھ حضرت مولانا کی یہ بھی خوبی تھی کہ مسودہ جس کے حوالہ کرتے اس کو پورا اختیار دیدیتے کہ جس طرح چاہے تصرف کرے، یعنی جو چاہے رکھے اور جتنا چاہے حذف کردے، بس شرط یہ ہے کہ تحریر کا جو منشا و مقصد ہے اس میں فرق نہ آنے پائے، الفاظ مولانا ہی کے رہیں، کم کرنے میں یا بعض حصہ کے ادھر سے اُدھر کردینے میں کچھ مضائقہ محسوس نہیں کرتے تھے، مولانا کا ابتدائی

مسودہ ان کے ایک شاگرد مخدوم محی الدین بی۔ اے عثمانیہ صاف کیا کرتے تھے، جن کی زود نویسی اور خوش نویسی بہت مشہور تھی۔

ایسا بھی ہوتا تھا کہ کبھی اپنا پورا مسودہ کسی شاگرد کو دیدیا کرتے جنکی استعدادِ علمی پر اعتماد ہوتا تھا، تاکہ وہ اسے مرتب کردے، مولوی غلام محمد صاحب بی اے جو مولانا کے تلمیذ رشید ہیں لکھتے ہیں:۔

"قلم رو کنے سے پہلے خود ان کو اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے وہ مضمون ہوگا، یا کتاب بن جائے گی اور اس سب کے باوجود اپنے مسوّدات پر دوبارہ نظر کرنے کی زحمت بھی گوارہ نہ فرماتے تھے، ان سب مسوّدوں کی ترتیب و تدوین ان کے معتمد علیہ شاگردوں اور عقیدت مندوں کے سپرد ہوتی تھی۔"

(مقالات احسانی ص۱۲)

قلم برداشتہ لکھنا مولانا کی عادت تھی کہ وہ کسی خاص موضوع پر تیاری کر کے لکھا نہیں کرتے تھے، کسی نے مضمون یا مقالہ کا مطالبہ کیا، اگر جی میں آگیا تو قلم لیکر بیٹھ گئے اور لکھنا شروع کردیا، جب تک آمد رہی لکھتے رہے، خواہ وہ مضمون یا مقالہ کتاب ہی کیوں نہ بن جائے، اور عام طور پر یہی ہوتا، یا کسی شاگرد کے لئے کسی خاص موضوع پر معلومات فراہم کرنے کے لئے بیٹھے تو وہ مضمون اتنا ہوگیا کہ بآسانی کتاب میں تبدیل ہوسکتا ہے، مولانا کے شاگرد ہی کا بیان ہے:۔

"مولانا خود فرماتے تھے کہ ان کی کوئی تصنیف بھی باضابطہ تصنیفی پروگرام کے تحت انجام نہیں پائی، یہی ہوتا رہا کہ کسی نے کسی مضمون کی فرمائش کی، لکھنے بیٹھ گئے، جب لکھ چکے تو وہ مضمون مضمون نہ رہا، کتاب تیار ہوگئی...... دوسری صورت یہ ہوتی رہی کہ

کالج کے لکچرز کی تیاری یا ایم۔ اے اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے طلبہ کے مقالات کی رہبری کے سلسلے میں مختلف موضوعات پر جو معلومات فراہم کرنا پڑتا...... وہ ہر موضوع کی ایک مستقل کتاب خود بخود تیار ہوگئی۔"

(ایضاً)

تحریر میں جاذبیت اگر سب کچھ کے باوجود مولانا کی تحریر میں کوئی ایسا تیز جملہ نہیں ہوتا تھا کہ کوئی مخالف یا آزاد خیال دیکھ کر اسے الگ ڈالدے، تصانیف و مقالات میں تصلّب و تقشّف کو مولانا بالکل پسند نہیں کرتے تھے، کچھ تو طبعاً نرم خو تھے اور کچھ جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں رہنے اور ان سے راہ و رسم کا یہ اثر تھا، کہ ہر ایک طبقہ کے جذبات کی رعایت کرتے تھے۔ بات اپنی ہی کہتے، اور مضبوطی سے کہتے، مگر اس کا لباس بڑا خوشنما اور خوش گوار اور لب ولہجہ بہت شیریں تجویز کرتے تھے۔

تصنیف و تالیف کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ موافق و مخالف، جذباتی اور غیر جذباتی دونوں مطالعہ کریں، اور کتاب مطالعہ کرنے والوں کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہو جائے، بات تو وہی ہوتی جو ہونی چاہئے۔ مگر لب ولہجہ کی خوش گواری اور شیرینی کو جو درجہ حاصل ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، مولانا کا اندازِ بیان پرانے مولویوں اور مناظروں کی طرح خشک اور طنز آمیز ہرگز نہ ہوتا اور یہ واقعہ ہے کہ تصنیف و تحریر کا ان عیوب سے پاک رہنا ہی بہتر ہے، بلکہ لازم ہے۔

خشک نگاری سے پرہیز مولانا ابوالحسن ندوی مدظلہٗ نے لکھا ہے:۔

"کچھ تو مولانا (گیلانی) کی افتادِ طبع اور شاید خاندانی لینت و رفق اور کچھ جامعہ عثمانیہ کے طویل تعلق اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور نئی نسل کے مسلسل سابقہ نے مولانا کی تحریر و تعبیر میں جدید ذہن کی رعایت اور دینی حقائق کے بیان کرنے میں حکمت و تدریج کا پہلو غالب

کردیا تھا ..... اپنے عقائد و خیالات اور علم میں پورے راسخ
اور متصلب تھے، لیکن اپنے طرزِ بحث اور طرزِ تحقیق و استدلال میں
بالکل عصری ؒ" ——— (پرانے چراغ ص۸۵)

خود مولانا گیلانی نے بھی اپنے ایک خط میں عقائد کے سلسلہ میں لکھا ہے :-

"یہی بتانا چاہتا تھا کہ خواہ وہ ہماری جماعت کا ہی آدمی کیوں نہ ہو، لوگوں میں اس کی بڑائی جس حد تک بھی مسلّم ہو، لیکن حق کا قدم جب درمیان میں آئے گا، تو پھر کسی کا کچھ لحاظ نہ کیا جائے گا، خواہ وہ کوئی ہو، "وان فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت یدھا" ہمارے دین کی امتیازی شان ہے " (ایضاً ص۸۷)

تصلّب و تقشّف سے اجتناب | مولانا گیلانی تحریر و تصنیف میں سخت لب ولہجہ کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے، چنانچہ جب میں اپنی پہلی کتاب "نظامِ مساجد" کا مسوّدہ لے کر مولانا کی خدمت میں پہلی مرتبہ گیلانی حاضر ہوا تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ پوری کتاب ایک نشست میں پڑھ گئے، درمیان میں صرف ظہر کی نماز کے لئے اٹھے، پھر آکر مطالعہ شروع کردیا، اور آخر میں ختم کرکے فرمایا "ماشاءاللہ آپ نے محنت کی ہے، اور سب بڑی بات جو نظر آئی وہ یہ ہے کہ آپ کی کتاب میں لب ولہجہ کی مولویوں جیسی درشتی نہیں ہے، آپ کی کتاب ان شاءاللہ ہر ایک شوق سے پڑھ سکے گا ——— پھر فرمایا، تصنیف میں لب ولہجہ کی شدت پسندیدہ نہیں ہے، اس سے کتاب کو محفوظ رکھنا ضروری ہے، بات پرانی کہی جائے مگر لباس نیا ہو، یہ ہرگز پسندیدہ نہیں ہے کہ جو حق ہے اس میں کوئی لچک یا کمزوری آنے پائے، مگر حق پیش کرنے کا انداز بہت ہی خوش گوار اور دل پذیر ہو، اور بہت ہی دل نشیں اور دل چسپ بھی، تاکہ عوام و خواص اس کو ذوق و شوق سے پڑھ سکیں، اور فائدہ حاصل کرسکیں "

عقائد و نصوص میں مضبوطی | مولانا علی میاں نے ایک جگہ یہ بھی لکھا ہے :-

"مولانا گیلانی کا یہ توسع اور ان کی تمام عصریت و حکمت تحریر و تعبیر اور استدلال ہی میں تھی، عقائد و نصوص اور حدودِ دین کے بارے میں وہ اتنے ہی متصلب اور متشدد اور ویسے ہی غیور و حساس واقع ہوئے تھے، جیسے ان کے اساتذہ و شیوخِ کرام اور علماء حق جب کبھی وہ تحریفِ دین کی کوئی کوشش یا دین کی ترجمانی میں کوئی بے اعتدالی یا آزادی یا غلط اجتہاد دیکھتے تو برداشت نہ کرسکتے"

(پرانے چراغ ص۸۶)

وسعتِ معلومات اور رسوخ فی العلم | مولانا کی جس کتاب کو اٹھا کر دیکھئے، معلومات کا ایک بیش بہا خزانہ معلوم ہوگی، کہاں کہاں سے مولانا مواد یکجا کرلیتے تھے، اور انکے حافظہ میں یہ ساری چیزیں کس طرح محفوظ رہتی تھیں، کہ لکھتے وقت خود بخود ساری چیزیں زبانِ قلم پر چلی آتی تھیں، کتاب پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ مولانا میں استدلال و استخراج اور استنباط کی کیسی بے پناہ قوت تھی،

مولانا علی میاں صاحب مدظلہ، کا یہ لکھنا بہت درست اور بجا ہے، کہ :-

"بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ وسعتِ نظر، وسعتِ مطالعہ، رسوخ فی العلم، اور ذکاوت میں ان کی نظیر اس وقت ممالکِ اسلامیہ میں ملنی مشکل ہے، والغیب عنداللہ۔ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے وہ عصرِ حاضر کے عظیم مصنفین میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں انھوں نے اپنی کتابوں میں جو مواد جمع کردیا ہے وہ بیسیوں آدمیوں کو مصنف و محقق بنا سکتا ہے، اس ایک آدمی نے تنِ تنہا وہ کام کیا ہے، جو یورپ میں پورے ادارے اور منظم جماعتیں کرتی

ہیں، ان جیسا آدمی برسوں میں پیدا ہوتا ہے، اور اب اُن جیسا آدمی شاید برسوں میں بھی پیدا نہ ہو۔" (ایضاً ص۹۴)

لکھنے کی شان ایک دفعہ علامہ سید سلیمان ندوی رح نے مولانا گیلانی رح کو لکھا کہ آپ خوب لکھ رہے ہیں، گویا بارش ہو رہی ہے، اس کے جواب میں مولانا گیلانی رحمۃ اللہ نے لکھا:-

"یہ آپ نے خوب لکھا ہے کہ میں مینہ برسا رہا ہوں، سچ عرض کرتا ہوں لکھنے کے لئے فقیر نے اب تک خود کچھ نہیں لکھا ہے، جو کچھ بھی ہو جاتا ہے کوئی سر پر سوار ہو کر لکھوا لیتا ہے، یا اسی قسم کی کچھ مجبوریاں پیش آجاتی ہیں۔"

(مکتوب ۷ر دسمبر ۱۹۴۴ء شائع شدہ معارف اپریل ۶۳ء)

ایک رائے کی تردید مولانا کے شاگرد غلام محمد صاحب کی اس رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے، کہ:-

"مولانا کی تصنیفات جدید طرزِ تصنیف کے معیارِ حسن کو نہیں پہونچتیں"

جدید طرزِ تصنیف سے کیا مقصد ہے کاش وہ اسے کھول کر لکھتے، مولانا کی تمام تصنیفات موجود ہیں، ان کا بغور مطالعہ کر کے فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا کمی ہے جن اہلِ علم نے ان تصانیف کا مطالعہ کیا ہو گا وہ گواہی دیں گے کہ، مولانا کی ہر ایک تصنیف اپنے موضوع پر جامع اور کامل ہے اور اس کی ترتیب اور طرزِ نگارش میں موجودہ معیار کے مطابق بھی کوئی کمی نہیں ہے۔

اپنا خیال ہے ربط و ترتیب کا دامن مولانا سے کہیں چھوٹا ہی نہیں چونکہ مولانا پر معقولات کا اثر تھا، اس لئے اس کی ترتیب منطقی ضرور ہے، اور یہ مسلّم ہے کہ منطقی ترتیب سے اچھی اب تک کوئی دوسری ترتیب نہیں ہے۔

اسی طرح مولانا کے علمی مقالات و مضامین جو سیکڑوں کی تعداد میں مختلف علمی مجلات میں شائع ہوئے، ان کا مطالعہ کر کے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مولانا نے جس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے، کتنا عمدہ مواد جمع کر دیا ہے، جو گوشے اوروں کے ذہن میں نہیں آسکتے تھے، مولانا نے ان پر کیسی روشنی ڈالنے کی سعی فرمائی ہے، اور کس طرح ان تمام گوشوں کو اُجاگر کر کے اپنے مضمون میں سمو لیا ہے۔

وہ لوگ جن کا مطالعہ وسیع ہے وہ گواہی دیں گے کہ عوام و خواص کیساتھ بہت سارے مصنفین نے بھی مولانا کے مہیا کردہ مواد اور معلومات سے براہِ راست فائدہ اٹھایا ہے، گو انھوں نے مولانا کے مقالات یا کتاب کا حوالہ نہیں دیا ہے۔

مولانا علی میاں مدظلہ کی شہادت مولانا گیلانی کے طرزِ نگارش پر موجودہ دور کے مشہور مصنف اور مورخ مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، کی رائے بھی سن لی جائے لکھتے ہیں:-

"دراصل ان (مولانا گیلانی) کا سارا توسع طرزِ تحریر اور طریقہ تفہیم میں تھا، ان کی کتابیں اور مضامین نئے اسلوب میں لکھے گئے ہیں، اور کہیں کہیں تو وہ اپنی کتابوں میں تاریخی مواد اس سلیقہ اور ترتیب سے پیش کرتے ہیں اور اپنے دعویٰ ایسے علمی و تحقیقی انداز میں ثابت کرتے ہیں کہ وہ ایک قدیم مدرسہ کے فاضل اور ایک فقیہ و محدث ظاہر ہونیکے بجائے عصرِ حاضر کے مصنف اور اجتماعیات و علوم عمرانیہ کے فاضل معلوم ہوتے ہیں، مولانا کی اسی جامعیت نے انکو اپنے معاصر علماء میں ایک امتیاز بخشا تھا، اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو ان کی تصنیفات کا گرویدہ بنا دیا تھا ع

برکفِ جامِ شریعت برکفے سندانِ عشق" (پرانے چراغ ص۸۸)

مسلمانوں کی بے حسی کا اثر حضرت مولانا گیلانی کی نظر جہاں قرآن وحدیث، فقہ اور تصوّف پر تھی، ایسی ہی آپ کو تاریخ اسلام سے بھی بڑی مناسبت تھی، عالم اسلام کے متعلق جب کبھی معلوم ہوتا کہ ان میں دینِ قیّم کے احکام ومسائل سے وہ رغبت و تعلق نہیں ہے جو ہونا چاہیئے، تو تڑپ جاتے اور ماہئ بے آب ہو جاتے

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کا مشرقِ وسطیٰ والا سفرنامہ جب شائع ہوا تو اسے آپ نے ازاوّل تا آخر بہت شغف کے ساتھ پڑھا، مگر جہاں ان لوگوں کی دین سے بے توجہی کا ذکر آیا مولانا کا عجب عالم ہوا، ایک لمبا خط مولانا علی میاں کو لکھا، اس کے چند جملے ملاحظہ فرمائیں، تاکہ اندازہ ہو کہ مولانا کو مسلمانوں کے دینی حالات سے کتنا گہرا لگاؤ تھا۔

"بس تڑپ رہا ہوں، کراہ رہا ہوں، کیا ہوگا اور ورطہ سے دین کا سفینہ کیسے نکلے گا؟ بھلا جب اپنے ہاتھوں سے مسجدوں میں مسلمان تصویریں لٹکانے لگے، اور دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دینی مرکز کے علماء نے اِعفاءُ اللحیٰ کا ترجمہ "عفت الدیار محلہا ومقامہا"، کی روشنی میں کر کے اس پر اجماع منعقد کر لیا ہے، تو دین کو اب ..... کہاں ڈھونڈیں؟ کیا عرض کروں مُنہ لپیٹے آپ کی کتاب کو پڑھنے کے بعد پڑا ہوا ہوں۔"

(پُرانے چراغ صـ۴۵)

مولانا کی نظر تاریخ ہند پر ہندوستان کی اسلامی تاریخ پر بھی بڑی وسیع نظر رکھتے تھے، صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب رفیق دارالمصنفین ومدیر رسالہ معارف اعظم گڈھ نے اپنا تأثر لکھا ہے، جن کا موضوع ہی ہندوستان کی تاریخ ہے، اور کئی کتابیں بھی لکھ چکے ہیں:۔

"۱۹۶۳ء میں جب الفرقان کا مجدد الفِ ثانی نمبر شائع ہوا اور اسمیں مولانا کا مضمون "الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ" پڑھا تو ایسا معلوم ہوا ہندوستان کے مغلیہ عہد کی تاریخ کی تمام گرہیں کھُل گئی ہیں، راقم کا خاص موضوع ہندوستان میں اسلامی عہد کی تاریخ رہا ہے اس مضمون کو پڑھنے کے بعد تیموری دور کی تاریخ سمجھنے میں ایک خاص زاویۂ نظر ملا۔ دینِ الہٰی پر مضامین برابر پڑھتا رہا، ملّا عبدالقادر بدایونی کی منتخب التواریخ جلد سوم میں تو اس کی تفصیل ملتی ہے جو چار سو صفحوں میں انتہائی بے ترتیبی کے ساتھ منتشر ہے، مولانا نے پہلی دفعہ ترتیب وتنظیم کے ساتھ اکبر کی اس بدعت سیّئہ کا احاطہ کیا ہے، اس لئے مجھ پر ان کی عالمانہ تحقیق وتنقیح کا بڑا گہرا اثر پڑا..... اس مضمون نے یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ آخر کیا بات تھی کہ اکبر نے دین الہٰی قائم کیا لیکن جہاں گیری عہد سے پہلے یہ آپ اپنی موت مرگیا، اور پھر شاہجہاں کے عہد میں اسلام اور اسلامی روایات کی جو تجدید شروع ہوئی تو عالمگیر کے عہد میں انتہا کو پہونچ گئی۔"

(معارف مارچ ۱۹۵۶ء)

مؤرخانہ ذہن اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ پر مولانا کا مضمون پڑھ کر انھوں نے لکھا ہے:۔

"اس تجزیہ میں بھی مولانا کی غیر معمولی مؤرخانہ ذہانت وذکاوت کا رنگ نمایاں تھا، اور بعض مواقع پر اس لئے بھی حیرت ہوئی کہ ایک ایسے اہلِ قلم کی نگاہ جس کی تعلیم صرف عربی مدارس میں محدود رہی کیسے ان باریک گوشوں تک پہونچی، اس لئے اکثر یہ خیال آیا کہ

ان کی تعلیم اگر خالص انگریزی طرز کی ہوتی، اور وہ اپنا موضوع تاریخ ہند ہی کو بنا لیتے تو شاید ان کے پایہ کا کوئی مؤرخ ہندوستان میں نہ ہوتا۔"

(ایضاً)

تصانیف و تالیفات مولانا گیلانی نے بہت کچھ لکھا، مگر بہت سارے مسودات شائع نہ ہو سکے، اب تک جو کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور میرے سامنے ہیں ان کی فہرست یہ ہے:-

(۱) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ (۲) ایک ہندوستانی صحابیؓ (۳) اسلامی معاشیات (۴) ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت جلد اوّل و دوم (۵) تدوینِ قرآن (۶) تدوین فقہ (۷) تدوین حدیث (۸) مقالات احسانی (۹) الدین القیم (۱۰) النبی الخاتم (۱۱) ہزار سال پہلے (۱۲) مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ (۱۳) تذکرہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ (۱۴) کائناتِ روحانی (۱۵) سوانح قاسمی اول۔ دوم، سوم (۱۶) امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی (۱۷) تذکیر بسورۃ الکہف۔

مولانا کا اندازِ تحریر مولانا کی تحریر و تصنیف کے متعلق ان کے معاصرین، معتقدین اور تلامذہ کی بہم کردہ معلومات آپ کے سامنے آچکی ہیں، کہ مولانا کے لکھنے کا کیا انداز تھا، اور کس تیزی کے ساتھ لکھا کرتے تھے، اور موجودہ دور کے مطابق نہ تو وہ نظر ثانی کرتے، نہ ان کے مسودات میں کاٹ چھانٹ ہوتی، قلم برداشتہ جو ذہن میں ہوتا کاغذ کے سپرد کرتے چلے جاتے، محض آمد ہی آمد ہوتا، آورد کا مولانا کے یہاں نام و نشان نہیں ملتا۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا کی تصنیف و تالیف بے ساختگی، زورِ بیان، مضبوط استدلال اور سوز و گداز سے لبریز ہوتی ہے پڑھنے والا ایک خاص طرح کا لطف

محسوس کرتا ہے، اور مولانا کی باتیں ان کے ذہن و دماغ میں اترتی چلی جاتی ہیں، بلکہ بسا اوقات آنکھیں بیساختہ اشکبار ہو جاتی ہیں پڑھنے والے کو اپنے اوپر قابو باقی نہیں رہتا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علوم و معارف کا ایک اتھاہ سمندر ہے، جس کی موجیں بل کھا رہی ہیں ـــــ مولانا اطناب و ایجاز دونوں پر پورے طور پر قادر تھے، ایجاز دیکھنا ہو تو النبی الخاتم کا مطالعہ کریں، اور اطناب دیکھنا ہو تو سوانح قاسمی دیکھیں، لیکن نہ ایجاز لذت سے خالی اور نہ اطناب دلچسپی سے عاری، ایجاز کا کمال یہ ہے کہ اختصار کے باوجود کوئی جز رہنے نہیں پاتا ساری چیزوں اور تمام پہلوؤں کو مختصر سے مختصر جملوں میں سمیٹ لیتے ہیں، اور اطناب میں ایسی معلومات جمع کر دیتے ہیں، جو کبھی بہت تلاش کے باوجود بھی ہاتھ نہیں آتی ہیں، پھر نکتہ آفرینی ایسی دلآویز و دلچسپ جس سے دماغ کے دریچے کھلتے چلے جاتے ہیں، اور ذہن و فکر کو نشو و نما کا فائدہ پہونچتا ہے۔

چند شہادتیں عہدِ حاضر کے مشہور محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے بجا لکھا ہے کہ:-

"ان تصانیف کو اسلوب نگارش اور ربط تحریر کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیے کہ ان میں علوم و حقائق اور استنباط و استخراجِ مسائل کا کس قدر گراں بہا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔"

(مقالات احسانی ص۱۲)

مولانا کی تحریر کے سلسلہ میں محترم غلام محمد بی۔اے (عثمانیہ) لکھتے ہیں:-

"ہر تحریر میں بے ساختگی، زورِ استدلال اور سوز و گداز کچھ ایسا موجود ہے کہ اس کی وجہ سے ربطِ کلام ٹوٹنے پر بھی کتاب چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔" (ایضاً ص۱۳)

یہ تو ہر منصف کو ماننا پڑے گا کہ مولانا کی تحریر میں زور بھی ہے اور اثر بھی،

اور اسلوبِ نگارش عام لوگوں سے ممتاز اور الگ ہے، مجھے غلام محمد صاحب بی۔اے۔ کی اس رائے سے پورا اتفاق ہے:۔

"مولانا ادب کا ستھرا ذوق رکھتے تھے، اس لئے وہ جدید زبان اور اسلوبِ بیان میں عالمانہ مضامین بخوبی پیش کرتے رہے، بلکہ ادبی حیثیت سے مولانا کی تحریروں پر غائرانہ نظر ڈالی جائے تو بیسیوں عمدہ اور اچھوتی اصطلاحات ملیں گی، جو مولانا کے ہاتھوں زبانِ اردو کو ملی ہے۔" (مقالاتِ احسانی ص۱۶، ص۱۷)

آپ کو آگے معلوم ہو گا کہ مولانا شاعر بھی تھے، اردو، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں بے ساختہ اشعار کہتے تھے، بلکہ کبھی کبھی عربی میں بھی ـــــ ہزاروں اشعار نوکِ زبان پر تھے، ایسے مصنف کا قلم یقیناً ادبی حیثیت سے خوش گوار و دل چسپ ہی ہو گا۔

میں کوشش کروں گا کہ مولانا کی بعض تصانیف کا اجمالی تعارف بھی پیش کر دوں تاکہ ناظرین آسانی کے ساتھ یہ معلوم کر لیں کہ مولانا نے ملک و ملت کو کیا دیا اور افرادِ اُمت فائدہ حاصل کرنا چاہیں تو ان تصانیف سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

نفسِ مواد پر نگاہ مولانا کی نظر ظاہری ٹیپ ٹاپ سے زیادہ نفس مواد پر ہوتی تھی مقالا اور تصانیف میں توجہ اسی پر دینا ضروری سمجھتے تھے۔

خاکسار کے نام مولانا گیلانیؒ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"آپ کے مقالات برہان (دہلی) اور دارالعلوم (دیوبند) والے فقیر کی نظر سے گذرنے، آپ کے ہر مضمون کو غور سے پڑھتا ہوں اگر توجہ کا مسئلہ آپ نے باقی رکھا تو ان شاء اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی خدمت کا تحریری طور پر آپ کو آئندہ اچھا موقع

ملے گا ـــــ زبان کا بھی چنداں خیال نہ کیجئے، اصل چیز مواد ہے صورت، مادہ کی قیمت کے بعد چنداں اہم باقی نہیں رہتی، اگرچہ مضمون کے ساتھ صورت کا خیال کرنا ہی پڑتا ہے،

(مکتوب ۱۲؍جنوری ۱۹۵۲ء)

تاثیری پہلو کا دھیان اسی طرح ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:۔

"واقعات کے ادا کرنے میں ان کے تاثیری پہلوؤں کا بھی مسلسل خیال رکھا جائے۔" (مکتوب ۸؍مئی ۱۹۵۱ء)

اس طرح کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر زیادہ تر مواد اور تاثیری پہلو پر رہا کرتی تھی، اور کوئی شبہ نہیں کہ مولانا کی تحریریں تاثیر کا پہلو غالب ہے۔ جو لکھتے تھے ڈوب کر لکھتے تھے، چالیس سال تک مولانا کا قلم گوہر افشانی کرتا رہا اور اہلِ علم اس سے مستفید ہوتے رہے۔

آپ کے مقالات و مضامین معارف اعظم گڈھ، بُرہان دہلی، الفرقان لکھنؤ صدقِ جدید لکھنؤ اور رسالہ دارالعلوم دیوبند میں بکثرت شائع ہوتے رہے، اور عوام و خواص نے مزہ لے لے کر پڑھا، اور بہت سے مقالات کو اس طرح پڑھا کہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہوتے، اور دل میں ایک آہ ہوا کرتی ہے۔

واقعات سے نتائج کا استخراج آپ کو واقعات سے نئے نتائج نکال کر پیش کرنے کا خاص ملکہ تھا، بہت سارے تاریخی حقائق ہم لوگ پڑھ کر گزر جاتے ہیں اور احساس تک نہیں ہوتا کہ ہمارے لئے، مسلمانوں کے لئے اور موجودہ دور کے انسانوں کے لئے عبرت و بصیرت کے کتنے خزینے پوشیدہ ہیں، مولانا گیلانیؒ ان خزینوں کو خوب ہی اُجاگر کرنا جانتے تھے، اور پڑھنے والے پڑھ کر چونکتے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:۔

"قوتِ تحریر کا جو ملکہ مولانا گیلانی کو حاصل تھا اس سے ناظرین صدق ناآشنا نہیں، ایک خاص طرز انشاء کے مالک تھے، اور اس میں کسی کے مقلد نہیں، خود اس کے موجد تھے، تحریر کا سب سے بڑا وصف بے ساختگی اور برجستگی تھی، جب اور جس موضوع پر قلم اٹھایا، بس لکھتے ہی چلے گئے، جو عنوان دوسروں کو پامال نظر آتے تھے، ان میں بھی وہ نئے نئے نکتوں کے انبار لگا دیتے خشکی ان کا قلم جانتا ہی نہ تھا، تحریر کی سطر سطر جاندار ہوتی۔"

(وفیاتِ ماجدی ص[illegible])

مولانا دریابادی نے یہ بھی لکھا ہے:

"ہر تازہ فتنہ کی گہری جڑوں پر پوری نظر رکھنے والے تھے، حمایت و نصرت اسلام میں ہزار ہا صفحات لکھ ڈالے۔" (ایضاً)

اسفار اربعہ کا ترجمہ حضرت مولانا گیلانی کو معقولات سے بڑی مناسبت تھی۔ حیدرآباد میں جب نظام کی توجہ سے دارالترجمہ قائم ہوا، اور ہر علم و فن کی کتابوں کا اردو ترجمہ کرایا گیا، اس زمانہ میں صدر الدین شیرازی کی مشہور کتاب "اسفار اربعہ" کا ترجمہ مولانا گیلانی کے سپرد ہوا، اور آپ نے یہ خدمت بحسن و خوبی انجام دی، چنانچہ وہ ترجمہ (۱۷۵۰) صفحات پر چھپا ہوا ہے، اردو مترجم کی حیثیت سے اس پر آپکا نام درج ہے۔

خطابت ــــ اور مولانا گیلانی

مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ جہاں سلطان القلم اور رئیس التحریر تھے ــــ وہیں رب العالمین نے آپ میں تقریر و وعظ کا ملکہ بھی بدرجۂ اتم ودیعت فرما دیا تھا، بلکہ آپ کی تقریر اکثر و بیشتر تحریر سے کہیں زیادہ دل نشین، ہلچل پیدا کرنے والی، اور دلوں کو گرما دینے والی ہوتی تھی، پر سوز بھی ہوتی تھی اور جاں گداز بھی، پڑھا لکھا طبقہ بھی متأثر ہوتا تھا، اور عوام کا جاہل طبقہ بھی، عام طور پر مجمع اشک بار ہوتا اور کبھی کبھی چیخ و پکار کی آوازیں بھی بلند ہوتی تھیں مولانا چونکہ سراپا اخلاص تھے، جو کہتے دل کی گہرائی سے کہتے، اور دلی خواہش ہوتی کہ سامعین کے دلوں میں اتر جائے، اس لئے جو سنتا سر دھنتا، ہزاروں ہزار کا مجمع آپ کی تقریر میں ہوتا تھا، اور بصد ذوق و شوق بیٹھا سنتا رہتا تھا

تقریر کا انداز تقریر کا انداز کیا ہوتا، اس سلسلہ میں مولانا کے ایک حیدرآبادی شاگرد لکھتے ہیں:

"ان کی تقریر تو اس سے بھی کہیں زیادہ پرسوز و جاں گداز ہوتی، تقریر کا رنگ واعظانہ نہیں بلکہ خطیبانہ ہوتا تھا، درمیان میں لطائف و ظرائف اور منتخب اشعار اس موزونیت سے آجاتے تھے، کہ عامی تقریر عوام کے لئے نہایت دل چسپ و دل نشین بن جاتی تھی حالانکہ نکتہ آفرینی اور علمی معلومات کا سیلاب تھا، جو امڈتا چلا آتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تقریر میں خود مولانا بے خود ہو جاتے تھے، جس کے اثر سے سامعین پر بھی ایک کیف طاری ہو جاتا تھا۔" (مقالات احسانی ص۹)

جب کبھی اسلامی غیرت وحمیّت کو جگانا چاہتے تو انداز بیان اور زیادہ موثر اور خطیبانہ ہو جاتا، اور ایسا معلوم ہوتا کہ حالات کا نقشہ سامنے کھینچ کر لوگوں کو مشاہدہ کرا رہے ہیں، اور مجمع اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے، مولانا کی آنکھیں سُرخ ہو جاتیں، چہرہ تمتما اٹھتا، آواز بھرا جاتی، اور جوش وخروش سے سینہ پھٹتا ہوا دکھائی دیتا۔

لوگوں کی دل چسپی پورا حیدر آباد شہر مولانا کی تقریر کا عاشق وشیدا تھا، لوگوں سے جان بچانا مشکل ہو جاتا، بلکہ اسی تقریری چکر میں مولانا کی صحت برباد ہو گئی، اور مولانا کے دوستوں کو پابندی عاید کرنی پڑی، اور اعلان کر دیا گیا کہ مولانا اپنی رائے سے کسی جلسہ یا مجمع میں تقریر کرنے کے مجاز نہیں ہیں، فلاں صاحب اس کام کے ذمہ دار ہیں، ان کی اجازت کے بغیر وہ قدم باہر نہیں نکال سکتے۔

تقریر کی ابتدا آپ نے ٹونک کی جامع مسجد سے کی تھی، جس کا اجمالی تذکرہ گذر چکا، پھر مولانا فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں معین المدرسین بنائے گئے، تو ان کے ذمہ وعظ وتقریر کا کام بھی رکھا گیا، کہ باہر سے طلبی آئے تو مولانا کو بھیجا جائے۔ چنانچہ سال ڈیڑھ سال آپ نے دارالعلوم کی زندگی میں یہ خدمت بھی انجام دی۔

تقریر کی تاثیر مولانا کی تقریر کافی موثر ہوتی تھی، نوجوانی کا جوش تھا، مستی وبیخودی شروع سے تھی، پھر کیا تھا، جب بولنے پر آتے، مجمع محوِ حیرت بنا دیکھتا، اور مولانا روانی اور تیزی کے ساتھ بولتے چلے جاتے، بلکہ کبھی پھول برساتے اور کبھی آگ کی بارش ہوتی۔ مجمع کبھی قہقہہ لگاتا اور کبھی دھاڑیں مار کر روتا تھا، یہی وجہ تھی کہ مولانا کی بہت سی تقریروں میں کہرام سا مچ جاتا، آہ وزاری کی آوازیں بلند ہونے لگتیں اور سننے والوں کو خبر نہیں ہوتی کہ کتنے گھنٹے گذر گئے۔

مولانا کی تقریر کا اعتراف حیدر آباد کے مشہور ومقبول مقرر نواب بہادر یار جنگ

کہا کرتے تھے کہ میں نے تقریر کرنا مولانا گیلانی سے سیکھی ہے، ایک صاحب نے مولانا کی تقریر کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے۔

"مولانا مناظر احسن کی تقریر، لب ولہجہ کا مٹھاس، الفاظ کی صحیح نشست برخاست، مضامین کی آمد، معلومات کی وسعت، اسلوب وانداز کی جدّت وندرت کی جامع ہے، جناب ماہر القادری مدیر فاران کراچی نے لکھا تھا کہ نواب بہادر یار جنگ نے (جن کی سیف زبانی اور شعلہ بیانی سے ابتک سینۂ باطل میں ایک تلاطم کی سی کیفیت طاری ہے) کہا تھا کہ میں نے تقریر مولانا مناظر احسن گیلانی سے سیکھی ہے، میلاد النبیؐ کے جلسوں میں جب مولانا حیدر آباد میں تقریر فرماتے تھے تو میں موٹر لئے ان کے پیچھے دوڑتا رہتا تھا۔" (ہزار سال پہلے ص۱۹)

میلادی وعظوں کا سلسلہ مولانا کے احباب نے بتایا کہ حیدر آباد میں کچھ لوگ مولانا کو تقریر کے لئے، لئے پھرتے تھے، اور مولانا بھی اپنی صحت سے بے پروا ہو کر جہاں تہاں جاتے رہتے تھے، ربیع الاوّل کے مہینے میں خصوصیت کے ساتھ سیرۃ النبیؐ کی تقریروں کا بڑا زور رہا کرتا تھا مولانا انکار کرنا جانتے ہی نہ تھے، مولانا عبد الباری ندویؒ کا بیان ہے:۔

"ایک اور بڑا ڈپارٹمنٹ مولانا کی حیدر آبادی زندگی کا عرصہ تک خصوصًا میلادی وعظوں اور تقریروں کا رہا، اور شاید اسی نے دمہ کے اس پرانے مریض کو مرض میں بھی مولانا کو شریک کر کے لفظاً ومعنیً "ہمدم" بنا دیا، ورنہ شدّتِ مرض میں تو ان تقریری بھرماروں کا بھرپور حصہ تھا ہی، یوں تقریر کا سلسلہ سال بھر چلتا رہتا۔ لیکن موسم کے دو تین مہینوں میں اتفاقًا ہی کسی دن دم لینے کا موقع ملتا ہوگا، عمومًا یہ جلسے رات کو ہوتے، اور رات رات بھر چلتے رہتے۔" (مکاتیبِ گیلانی)

جلسہ کرانے والوں کا سلوک جلسہ کرانے والوں کا عام قاعدہ ہے کہ وہ صرف اپنا کام نکالنا جانتے ہیں، نہ انھیں مقرر سے ہمدردی ہوتی ہے، نہ محبت، نہ اس کی صحت کی فکر ہوتی ہے اور نہ اس کی راحت و آرام کا اہتمام ہوتا ہے، جب تک تقریر کے لئے ڈائس تک مقرر نہیں پہونچتا، مقرر کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے، خوشامدیں ہوتی ہیں، سواری کا انتظام ہوتا ہے، اور نہ معلوم کیا کیا سبز باغ دکھائے جاتے ہیں، لیکن جونہی مقرر تقریر کرکے اسٹیج سے نیچے آتا ہے، بلانے والے چھپنے لگتے ہیں، تلاش و جستجو کے باوجود نہیں ملتے، جب تک بے حیا نہ بن جائے، کوئی واپسی کا انتظام بھی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔

مولانا کے ساتھ بھی بسا اوقات ایسے حادثے پیش آتے رہتے تھے، خود حیدرآباد میں ایسا ہوتا کہ واپسی میں سواری نہیں ملتی، پیدل قیام گاہ تک آنے کی زحمت گوارہ کرتے، کبھی کوئی جاننے والا راستہ میں دیکھ لیتا تو اپنی گاڑی روک کر مولانا کو بٹھاتا اور قیام گاہ تک پہونچاتا، کبھی جلسہ میں جوتا غائب ہوجاتا تو ننگے پاؤں واپس ہونیکی بھی نوبت آتی تھی،

تقریر کا اثر صحت پر مولانا عبدالباری ندوی رح جو خود بھی جامعہ عثمانیہ میں پروفیسر تھے انھوں نے لکھا ہے:-

"کالج کے فرائضِ منصبی کے روزانہ کئی کئی لکچروں کے ساتھ، وعظوں اور تقریروں کے اس تسلسل سے مولانا کی صحت پر آخر ایسی بن آئی کہ شب و روز اس نیازمند کے لئے دیکھتے رہنا برداشت سے باہر ہوگیا۔ (ایضاً)

چنانچہ احباب سے مشورہ کے بعد مولانا ندوی رح آپ کی تقریروں کے انچارج قرار دیئے گئے، کہ بغیر ان کے حکم کے مولانا گیلانی کہیں بھی وعظ و تقریر کے لئے نہیں جاسکتے، جس کو تقریر کرانی ہو، وہ پہلے مولانا ندوی سے اجازت حاصل کرے۔

مولانا ندوی انتظام میں کافی مضبوط تھے، تھوڑے دنوں میں کنٹرول کرلیا، اور مولانا گیلانی کی گرتی ہوئی صحت کو سنبھالا ملا۔ اور اس طرح مولانا کو سکون و اطمینان میسر آیا۔

عرض یہ کرنا ہے کہ مولانا گیلانی صرف تحریر کے میدان ہی کے شہسوار نہیں تھے بلکہ آپ کی تقریر و وعظ کا میدان بھی بڑا وسیع تھا، اور اپنی با مروّت اور صلح جو طبیعت سے مجبور ہوکر اپنی صحت تک برباد کرلی تھی، اور اس حد تک کہ ان کے ساتھیوں کو رحم آنے لگا، اور وعظ کہلانے والوں کی خود غرضیوں سے تنگ آگئے۔ جو اپنا کام نکالنا تو جانتے ہیں، واعظ کی صحت و راحتِ جسمانی کی کوئی فکر نہیں کرتے۔

مولانا دریابادی کی شہادت مولانا عبدالماجد دریابادی رح لکھتے ہیں:-

"طلبہ اور یونیورسٹی کے طلبہ کے حق میں بہترین معلم تھے اور ایک بہترین مقرر و خوش بیان خطیب بھی تھے۔ انبالہ کے اجلاس ندوہ ۱۹۳۶ء میں میں نے دیکھا کہ گو بولنے والے اور بھی اچھے اچھے علماء موجود تھے، لیکن پبلک کی طرف سے بار بار مطالبہ جن بزرگ کی تقریر کے لئے ہوتا وہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کے بعد یہی مولانا گیلانی تھے۔" (وفیاتِ ماجدی)

عوام و خواص کا فائدہ اس میں شبہ نہیں کہ اخیر عمر میں اس خطابت کے زور کی وجہ سے صحت متاثر ہوئی، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ کے وعظ و تقریر سے عوام و خواص کے ایک بڑے طبقہ کو ایمان کی لذت ملی، عمل کا جذبہ پیدا ہوا، دل و دماغ کی دنیا بدلی اور ان میں دین اور دینی علوم سے شغف پیدا ہوا۔ مردوں نے بھی آپ کی تقریروں سے اپنا مستقبل سنوارا، اور عورتوں نے بھی، بوڑھوں نے بھی اور جوانوں نے بھی، تاجروں میں بھی خدا کا خوف پیدا ہوا، اور مزدوروں میں بھی۔

حیدرآباد شہر کافی رقبہ میں پھیلا ہوا ہے، مولانا ہر ہر محلہ میں بلائے جاتے اور لوگ بڑے شوق کے ساتھ آپ کے وعظ میں شریک ہوتے تھے۔

نظام حیدرآباد کی شرکت نظام حیدرآباد جو وہاں کے نواب اور سربراہِ مملکت تھے

وہ بھی مولانا کی تقریریں سنا کرتے تھے، اس کی صورت یہ ہوتی تھی، کسی رئیس کے یہاں آپکی تقریر رکھی جاتی۔ مجمع سامنے ہوتا اور نظام حیدر آباد سبھوں کی نظروں سے اوجھل الگ بیٹھا کرتے تھے، اور اس طرح واعظ کو خبر تک نہیں ہوتی تھی، کہ یہاں حضور نظام حیدر آباد بھی تشریف فرما ہیں۔

یقیناً مولانا کے نامۂ اعمال میں اس راستہ سے بھی بہت سارا ثواب لکھا گیا ہوگا اور بہت سے لوگوں کے دلوں سے دعائیں نکلی ہوں گی، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کے درجات بلند فرمائے، اپنی زندگی میں مخلوقِ خدا کی بڑی خدمت کر گئے۔

مولانا گیلانی کی تقریر کے سلسلے میں مولانا دریا بادی کی شہادت ہے:۔

"موضوع کوئی سا بھی دے دیجئے، بس یہ معلوم ہوتا کہ خیالات کا دریا ہے کہ اُبلتا اور امنڈتا چلا آرہا ہے، کہاں کہاں سے مضمون پیدا کر لیتے اور نکتہ سنجی اور دقیقہ آفرینی، قرآنی عنوانات میں اور زیادہ نمایاں ہوتی، اور قرآن کے بعد نمبر حدیث کا رہتا، ایسی نکتہ سنجیوں کو اب کان ترس گئے۔

(معاصرین ص۱۸۳)

مولانا مرحوم کی نکتہ سنجیوں کا اعتراف اپنوں نے بھی کیا ہے اور غیروں نے بھی، تقریر میں جہاں اخلاص ضروری ہے، اور اس کے اثرات ہوتے ہیں، وہاں اہلِ علم تقریر میں نئے نئے نکتے بھی تلاش کرتے ہیں۔ اور اس سے خوش ہوتے ہیں، نئی معلومات جب کتاب و سنت کی روشنی میں ہوتی ہے تو قدرتاً اہلِ علم خصوصاً اور عوام عموماً جھوم جاتے ہیں، اور واعظ و مقرر کے لئے ان کے دلوں سے دعائیں نکلتی ہیں، اور اس کی تقریر سننے کا شوق بڑھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو یہ ساری خوبیاں عطا کر رکھی تھیں۔

فہمِ قرآنی اور حضرت مولانا گیلانیؒ

حضرت مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ ایک طرف جامعہ عثمانیہ حیدر آباد میں درس و تدریس کے ذریعہ نئی نسل، جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور اہلِ علم کو اسلام، اسلامی تعلیمات، اور اسلامی احکام و مسائل سے روشناس کر رہے تھے، اور آئندہ کے لئے ان جیسے لوگوں میں اشاعتِ اسلام کے خدّام پیدا کرنے میں مشغول تھے، دوسری طرف حیدر آباد کے عام مسلمان باشندوں میں دین کا ذوق پیدا کرنے کے لئے "درس قرآن"، اور مواعظ حسنہ کا سلسلہ جاری کر رکھا تھا، شہر کی اس مسجد میں جو قیام گاہ سے قریب ہوتی تھی قرآن کا درس بھی دیا کرتے تھے اور شہر کے جس حصہ میں مواعظِ حسنہ کی ضرورت ہوتی، وہاں پہنچ کر وعظ فرماتے تھے، آپ کے درس اور وعظ میں ہزاروں مسلمان شوق و ذوق کے ساتھ شریک ہوا کرتے تھے۔

درسِ قرآن کا سلسلہ مولانا عبد الباری ندوی رہ استاذ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد نے لکھا ہے

"مختلف قیام گاہوں کے قریبی مساجد میں درس قرآن کا جو سلسلہ وقتاً فوقتاً چلتا رہتا اس سے مستفید ہونے والے تو قریبًا سارے کے سارے نئے تعلیم یافتہ ہی ہوتے، اور ان کے مجمع میں مولانا کی طبیعت و زبان خوب کھُلتی، بخلاف اس کے بقول خود ہم پیشہ مولویوں سے ڈرتے رہتے، اور اپنے خصوصی افکار و خیالات کا عام تقریروں، تحریروں اور مجلسوں میں بہت کم بند بند ہی اظہار ہوتا۔"

(مکاتیب گیلانی ص۱۶)

مولانا گیلانی چونکہ ایک سال تک مولانا حمید الدین فراہی (م ۱۳۴۹ھ) کی مجلس قرآن میں شریک رہ چکے تھے، اور ان کو قرآن سے بڑی خاص مناسبت تھی اس لئے مولانا گیلانی میں بھی قرآنی ذوق گھر کر گیا تھا، اور اس کلام مقدس سے خاصی مناسبت پیدا ہو گئی تھی،

مولانا فراہی کا تذکرہ | مولانا نے اپنی کتاب "نظام تعلیم و تربیت"، میں جہاں ہندوستانی علماء کی خدمت قرآن کا تذکرہ کیا ہے، اور قرآنی آیات اور سورتوں کے باہمی ربط کی خدمت کو بیان کیا ہے، وہاں مولانا فراہی کا ذکر بھی فرمایا ہے لکھتے ہیں:-

میں نے جیسا کہ عرض کیا ولی اللّٰہی تجدید کے بعد ہندوستان نے اپنی نشأۃ ثانیہ میں جو کام اس سلسلہ میں انجام دیا ہے، میرا اشارہ حضرت الاستاذ مولانا حمید الدین الفراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر نظام الفرقان کی طرف ہے، جس میں علاوہ دوسری خوبیوں کے (یعنی قرآن اور بائبل کے تعلقات اور ادبی مباحث) کے سواسب سے بڑی اور مشترک خصوصیت مولانا کی اس تفسیر کے تمام حصوں میں یہی ہے کہ انھوں نے آیاتِ قرآنی میں ربط پیدا کرنے کی ایسی عدیم النظیر کوشش فرمائی ہے کہ بسا اوقات صرف آیات کے یہی روابط اس کی دلیل بن جاتے ہیں کہ یہ کتاب خدا کے سوا اور کسی کی طرف سے نہیں ہو سکتی "

(مسلمانوں کا ہندوستان میں نظامِ تعلیم و تربیت ص ۲۸۰)

قرآن فہمی اور اس کی تفہیم | قرآن سے مولانا کو ایک خاص شغف تھا پہلے خود اس کتابِ مقدس میں غور و فکر کرتے تھے، اور منشاء خداوندی کو پا لینے کی جدوجہد کرتے

تھے، اور بڑی حد تک اس میں کامیاب تھے، حضرت مولانا عبد الباری ندویؒ جو مولانا سے بہت قریب تھے۔ انھوں نے لکھا ہے:-

" البتہ اس سلسلہ میں ایک بڑے خاص کمال کا علم و اندازہ جتنا اور جیسا چاہئے لوگوں کو کم ہے، وہ ان (مولانا گیلانی کی) بہت خاص الخاص قرآن مجید کی فہم و تفہیم تھی، ان کی انفرادی و فکری بڑائیوں نیں مواقع ہذا کی نظر میں یہی سب سے بڑائی تھی "

(مقدمہ مکاتیب گیلانی)

مشاہدات کے ذریعہ تفہیم | مولانا ندوی رح نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ مولانا قرآن کو تفسیری ذخیروں کے بجائے مشاہدات سے ذہن نشیں کرنے کی سعی فرماتے تھے۔

" اس زندہ کتاب (قرآن مجید) کو حضرت (گیلانی) مرحوم تفسیری کتابوں سے زیادہ زندگی کی زندہ کتاب اور زندہ واقعات و مشاہدات سے سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے تھے "

(مکاتیبِ گیلانی)

قرآن سے مناسبت کا ہی ثمرہ تھا، کہ مولانا کا ذہن رسا نکتہ آفرینی، اور قرآن پاک کے صحیح مفہوم و مطلب تک پہونچنے میں بڑی سرعت اختیار کرتا تھا، اور ایسے معانی تک بہت جلد پہونچ جاتا تھا، جہاں تک عام علماء کے ذہن جلد نہیں پہونچ پاتے تھے۔

قرآن فہمی کی ایک مثال | مولانا ندوی ہی نے لکھا ہے کہ سورہ واللیل میں جو یہ آیتیں آئی ہیں:-

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى
وَاَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى

جس کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اپنی اجتماعی و انفرادی ضروریات کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کرتا ہے، لیکن اصولی طور پر اس کے دو ہی رُخ ہوتے ہیں؛ ایک، خدا پرستی کی، دوسری دنیا درستی کی، یا خدا گریزی کی، لہٰذا جو شخص عطا اور بخشش، خوفِ خدا اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے آسانی کی راہ ہموار کر دیتا ہے۔ اور جو اس کے خلاف خدا گریزی کے راستے پر ہوتا ہے، تو اس کے لئے دشوار کو آسان کر دیتا ہے۔

مولانا ندوی رح لکھتے ہیں:۔

"آسان کو آسان کر دینے کا مطلب تو خیر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اسمیں مزید آسانی پیدا کر دی جائے گی، لیکن دشوار کو آسان کر دینا بظاہر خدا و نیکی سے روگردانی کرنے والوں کی سزا کیا، الٹے انعام ہوا تفسیروں میں جی لگتی ہوئی بات نہیں ملتی، مفسر گیلانی کے نزدیک صاف و سیدھا مطلب یہ تھا کہ کسی معاملہ میں سعی و تدبیر کی جو راہ ـــــ فی نفسہٖ آسان ہے، خدا پرستوں اور نیکو کاروں پر خدا وہی آسان کر دیتا ہے، اس کے برعکس جو خدا و نیکی سے بغاوت و روگردانی کرتا ہے، اس کی سزا دنیا ہی میں یہ دی جاتی ہے کہ سعی و تدبیر کا فی الواقع و نفس الامر میں جو راستہ دشوار گذار ہے، انکی کج نگاہی میں وہی آسان نظر آنے لگتا ہے، اور اس پر چل کر کجروی کا خوب مزا چکھایا جاتا ہے۔" (مقدمہ مکاتیب گیلانی صہ ۲۹)

مولانا کی قرآنی یادداشت | مولانا نے قرآن سے متعلق اپنی یادداشتوں کے جمع کرنیکا کام شروع کر دیا تھا تاکہ آنے والی نسل اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔

خاکسار نے ایک مرتبہ قرآن کے درس کے لئے خدمتِ اقدس میں حاضری کی

اجازت طلب کی تھی، تو اس خط کے جواب میں تحریر فرمایا:۔

آپ نے قرآن کے درس کا تذکرہ بھی اپنے مکتوب میں کیا تھا دیہاتوں میں قیام اختیار کرنے پر آج کل کوئی تیار نہیں ہوتا، اسلئے اب انتظام کر رہا ہوں کہ اپنے قرآنی وجدانات کو قلمبند کر لوں۔"

(مکتوب ۲۶ر جون ۱۹۵۱ء)

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے یہ کام کیا تھا، مگر وہ سب مسودات کی صورت میں ہی رہ گئے، کتابت و طباعت کی نوبت نہیں آئی۔ اس لئے کہ گیلانی میں رہ کر لکھ تو سکتے تھے، مگر اسے صاف کرنیوالا کوئی نہ تھا، اس کے موجود ہونے کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سال بھر بعد جب میں نے قرآنی استفادہ کے لئے لکھا تو اسکے جواب میں تحریر فرمایا۔

"زیادہ سے زیادہ آپ میری لکھی ہوئی تفسیری جزوں کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔" (مکتوب ۲۲ر اپریل ۱۹۵۲ء)

قرآن سے لگاؤ کا ثمرہ | کتاب و سنت کے سلسلہ میں مولانا کبھی غلط تعبیر اور من مانی تفسیر کو برداشت نہیں کر پاتے تھے آپکا قلم فوراً جنبش میں آجاتا تھا۔

پروفیسر اجمل خان جو مولانا آزاد کے پرائیویٹ سکریٹری تھے، انھوں نے باضابطہ دینیات کا نصاب نہیں پڑھا تھا، لیکن قرآن پر لکھنے کا شوق تھا، اور کہنا چاہیے وہ قرآن میں تحریف کیا کرتے تھے، ان کی جب کوئی کتاب مولانا کے سامنے آتی تھی مولانا کا خون کھولنے لگتا تھا، پڑھ کر اس کتاب پر ہی جگہ جگہ اس کی تردید میں نوٹ لکھتے چلے جاتے تھے۔

ایک دفعہ اسی پروفیسر اجمل نے ترتیبِ قرآن پر کوئی مضمون لکھا، مولانا اسے پڑھ کر بے چین سے ہو گئے، بہت غصہ آیا کہ اس جاہل نے بے سمجھے گھسیٹ مارا

اور گمراہی کے دروازے کھولنے پر آمادہ ہوگیا ہے۔

مولانا کا خط حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی جو خود بھی قرآن کا عمدہ ذوق رکھتے ہیں اور عرصہ تک دارالعلوم ندوہ میں طلبہ کو مضامینِ قرآن پڑھاتے تھے، مولانا نے ان کے نام تحریر بھیجی۔

"آپ کو شاید میرے جنون کا حال معلوم نہیں، اجمل نامی پروفیسر کے نام سے مدینہ "(اخبار بجنور) میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع ہوا، غصہ آرہا تھا دبا نہ سکا، رات کو قلم لیا، پراگندہ خیالات سمیٹے اور لکھ کر مدینہ اخبار کو بھیجدیا، مسودہ تیار ہی کب تھا، وہی مسودہ وہی مبیضہ تھا۔"

(پرانے چراغ ص۶۶)

مولانا کا مقالہ مولانا کے اس مقالہ سے اجمل خان کے تمام تر غلط خیالات اور باطل رجحانات کی خود قرآن پاک سے مضبوط تردید ہوگئی، اور اس کے مضمون سے جتنے شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے تھے، سب کا قلع قمع ہوگیا، جب اہلِ علم کو اس مضمون کی خبر ہوئی تو بعضوں نے مولانا سے اس کی نقل چاہی، لیکن مولانا کے پاس نقل کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا، وہ تو قلم برداشتہ لکھتے اور اسی کو اٹھا کر کسی اخبار یا رسالے یا ناشر کو بھیجدیا کرتے تھے۔

مولانا علی میاں کا تأثر اس قرآنی مقالہ کے متعلق جو اجمل خان کی تردید میں لکھا گیا تھا حضرت الاستاذ مولانا علی میاں مدظلہٗ، لکھتے ہیں:۔

"اللہ تعالیٰ نے ان (مولانا گیلانیؒ) کو بڑا نکتہ رس ذہن عطا فرمایا تھا قرآن مجید کی وہی آیات اور صحابہ کی وہی احادیث اور تاریخ کے وہی بیانات جو ہم آپ بیسیوں بار پڑھ چکے ہیں، مولانا ان سے ایسے حقائق ثابت کر دیتے۔ اور ان سے ایسے عجیب لیکن صحیح نتائج نکالتے کہ

حیرت ہوتی، اس مضمون میں بھی وہی شان ہے، قرآن مجید کے من جانبِ اللہ محفوظ و مرتب ہونے کو اور عہدِ رسالت ہی میں اس کے مرتب و جمع ہو جانے کو انہوں نے قرآن مجید کے الفاظ و نصوص اور واقعات سے اس طرح ثابت کیا تھا کہ اس خیال کی بالکل بنیاد ہی منہدم ہو جاتی تھی، کہ قرآن مجید بہت تاخیر کے ساتھ جمع و مرتب ہوا، اور اس کی ترتیب حضرت ابوبکرؓ یا حضرت زید بن ثابتؓ کے اجتہاد کا نتیجہ ہے۔" (پرانے چراغ ج۱ ص۶۶)

تدوینِ قرآن پر مولانا کی کتاب مولانا گیلانی نے تدوینِ قرآن پر مستقل کتاب لکھی ہے جو اب تک طبع نہیں ہو سکی ہے۔ مگر اس کا جوہری خلاصہ ان کے شاگرد غلام ربانی نے ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع کرا دیا ہے، اس کے تعارف میں خود مولانا نے لکھا ہے

"اگرچہ فقیر نے خود بھی اس عنوان پر مستقل کتاب لکھی ہے، لیکن جہاں تک میرا خیال ہے، میری کتاب کے اس جوہری خلاصے کے شائع ہو جانے کے بعد اب اصل کتاب کی اشاعت کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔" (تدوینِ قرآن ص۶)

اس کتاب میں قرآن کی اندرونی شہادت سے ثابت فرمایا ہے کہ یہ کلام اللہ کتاب کی صورت میں ہے، یعنی لکھی ہوئی ہے، اور اس کی کتابت کو اہلِ عرب تسلیم کرتے تھے، قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ لکھنے والے اعلیٰ خصوصیات کے حامل تھے ایک خاص طرح کی جھلّی پر یہ کتاب لکھی گئی تھی، جو لکھنے کے ہی کام آتی تھی، اسکو پاک لوگ ہاتھ لگا سکتے تھے، ناپاک کو چھونے کی اجازت نہیں تھی۔

مولانا نے لکھا ہے:۔

"تقریباً تیس چالیس سال کے مسلسل فکر و تأمل، تلاش و جستجو کے بعد

آخری تحقیقی نتائج اس کتاب میں درج ہیں۔" (ایضاً)

قرآن و حدیث اور فقہ کی تدوین یہ واقعہ ہے کہ مولانا نے تدوین قرآن، تدوین حدیث اور تدوین فقہ پر جتنا مواد جمع فرما دیا ہے وہ ان کا ہی حصہ ہے اور آئندہ اعتراض کرنے والے بد باطنوں کی زبان و قلم پر آپ نے مضبوط تالا ڈال دیا ہے، دوسری جانب مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کو جو شکوک و شبہات کے دلدل میں پھنس سکتی تھی، ان سے نکالکر یقین و اعتماد کی شاہ راہ تک پہونچنے کا انتظام فرما دیا ہے۔

مولانا کے قرآنی مسودات اگر کبھی کل کے کل چھپ گئے ــــ تو اس وقت صحیح طور پر اندازہ لگانا آسان ہوگا کہ مولانا امت کے ہاتھ میں کتنا قیمتی خزانہ دیکر گئے۔

یہ واقعہ ہے کہ:۔

"اس تقریباً چالیس سالہ عرصہ میں مولانا نے مختلف علوم و فنون پر متعدد کتابیں اور سیکڑوں مضامین لکھے اور ہر تحریر میں اپنے ذہن کی اپج، فہم و فراست کی بلندی، مطالعہ کی وسعت، نظر کے عمق اور قوتِ اجتہاد کے زور کے پائیدار نقوش چھوڑے۔"

(تذکرہ شاہ ولی اللہ ص۲۸)

مولانا کا قرآن سے شغف یہاں مولانا گیلانی کی اُن سطروں کا نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جو آپ نے "تدوینِ قرآن" کے شروع میں تحریر فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"وقت پڑنے سے پہلے بعض کتابوں کی صحیح قدر و قیمت کا لوگوں کو اندازہ نہیں ہوتا، لیکن ضرورت جب پیش آجاتی ہے تو دنیا بڑی بے کسی کے ساتھ اس وقت ان کتابوں کو ڈھونڈتی ہے تقریباً یہی کچھ حال اس کتابچہ یا مقالہ کا بھی ہے، پیغمبروں کے خاتم

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس حال میں بنی نوعِ انسانی کے لئے آسمانی دستور اور الٰہی قانون کی آخری شکل یعنی قرآن مجید کو دنیا میں چھوڑ کر تشریف لے گئے، من وعن، ہو بہو، سر مو تفاوت کے بغیر یہ خدائی صحیفہ آج بھی دنیا میں موجود ہے ــــ دل تو یہی چاہتا ہے کہ بد اندیشی کا جذبہ کبھی نہ اُبھرے لیکن شیطان نے اگر اس سوال کو چھیڑ دیا، تو ان شاء اللہ تعالیٰ اس وقت آپ کو ان چند اوراق میں وہ سب کچھ مل جائے گا، جو شاید بڑے بڑے ــــ کتب خانوں کے کتابی ذخیروں میں بھی نہیں مل سکتا ــــ اور وقت پر وہ تریاق انہی اوراق سے میسر آئے گا، ــــ اسلام پر نازک ترین وقت کا خطرہ سامنے آگیا ہے، اس نازک ترین گھڑی میں یہ مختصر رسالہ بھی انشاء اللہ کافی کارآمد ثابت ہوگا، کم از کم اسلام کی اساسی کتاب جس پر اس دین کی بنیاد قائم ہے، اس پر تو شک و شبہ کی گرد اچھالنے میں ان شاء اللہ اب کوئی بد اندیش کامیاب نہیں ہو سکتا۔" (تدوین قرآن)

اس سے مولانا کے فکر، دور اندیشی اور قرآنی شغف کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تدوینِ قرآن پھر تدوینِ حدیث و تدوین فقہ[1] پر اس قدر محنت کیوں کی، اور یہ کہ مولانا کو قرآن پاک سے کیسا تعلق تھا۔

---

[1] علامہ سید سلیمان ندوی رح کے نام اپنے خط میں تحریر فرماتے ہیں "آج آپ کی خدمت میں اپنی کتاب تدوین فقہ کا ایک ابتدائی حصہ جو بصورتِ مقالہ ہمارے یہاں ریسرچ جرنل میں چھپا ہے، بھیج رہا ہوں۔" (مکتوب ۱۰ر نومبر ۱۹۴۲ء، شائع شدہ معارف اعظم گڑھ اپریل ۱۹۶۳ء)

بچپن میں مولانا گیلانی کو حافظِ قرآن نہیں بنایا گیا تھا، مگر حیدر آباد کی زندگی میں آپ نے پورا قرآن پاک یاد کر لیا تھا، اور حافظِ قرآن ہو گئے تھے،

مولانا عبدالباری ندوی رح نے لکھا ہے کہ ایک سال رمضان میں مولانا نے نصف قرآن نمازِ تہجد میں سنایا تھا۔

مولانا عبدالماجدؒ کا بیان مولانا عبدالماجد دریا آبادی لکھتے ہیں:۔

"فاضل گرامی حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی رح دورِ حاضر کے طبقۂ علمار کے خواص میں نہیں، اخص الخواص میں تھے۔ بلکہ کہنا چاہئے اپنی دقتِ نظر وتبحرّ رسی کے لحاظ سے فردِ فرید اور اپنی نظیر بس آپ تھے، مولانا بیک وقت مفسّر، محدّث، فقیہ، متکلم — معقولی وصوفی وصافی تھے، تاریخی مطالعہ کی وسعت وکثرت نے انھیں مؤرخ بھی بنا دیا تھا۔" (وفیاتِ ماجدی)

قرارت کی تاثیر نماز میں جب قرآن پاک پڑھتے تھے تو آپ پر ایک خاص کیف ہوتا تھا، اور سننے والا اس کی تاثیر میں کھو جاتا تھا، خاکسار کو بارہا اس کا گیلانی کی حاضری میں تجربہ ہوا ہے، یہاں مسجد میں خود مولانا ہی امامت کا فریضہ ادا کرتے تھے اور نمازِ باجماعت کے پابند تھے، نمازِ فجر میں سب سے زیادہ دل ودماغ متأثر ہوتا تھا، اس لئے کہ اس نماز میں عموماً قرارت لمبی ہوا کرتی تھی۔

ہمارے مولانا دریا آبادی نے ایک جگہ لکھا ہے:۔

"نمازِ عشار کا وقت آیا تو آواز بھی سُریلی اور مترنّم، درد وگداز لئے ہوئے سننے میں آئی، قرارت شاید سورۃ الملک کے دوسرے رکوع کے نصف آخر کی تھی، جونہی انھوں نے اَفَمَن یَّمشِی مُکِبًّا عَلٰی وَجھِہٖ سے شروع کی، معلوم ہوا کہ کسی نے دل مل دیا ہے

حالانکہ میں از سرِ نو اسلام لانے کے بعد بھی ابھی تک پختہ نہیں ہوا تھا تعلقات یگانگت اسی وقت سے بڑھنے شروع ہو گئے۔"

(معاصرین ص۱۸۰)

یہ سب کیا تھے قرآن سے شغف کا نتیجہ تھا، جو قرآن پاک سمجھ کر پڑھتا ہے، اس کا پڑھنا سننے والے پر بے حد اثر انداز ہوتا ہے اور اگر سننے والا عربی زبان سے ذرا بھی تعلق رکھتا ہے، تو وہ ایسی قرارت سن کر دل ہی دل میں کہتا ہے یہ سلسلہ ذرا اور دراز ہوتا تو بہتر تھا۔

جن علمار کو قرآن پاک سے خاص مناسبت ہوتی ہے، ان کے پڑھنے کا انداز کچھ اور ہوتا ہے، وہ قرآنِ پاک کو اس کے خطاب میں ڈوب کر پڑھتے ہیں، پہلے خود پڑھنے والے پر اس کا اثر ہوتا ہے، پھر وہ سامعین کو محظوظ کرتا ہے، ایک طرف عبادت کی تاثیر، دوسری طرف پڑھنے والے کا انہماک اور پھر سننے والے کی یکسوئی، سب مل کر ایک خاص کیف پیدا کرتے ہیں۔

مولانا گیلانی اور شعر و شاعری

مولانا گیلانی جہاں بڑے عالمِ دین، مشہور مصنّف، اور مایۂ ناز مفسّرِ قرآن تھے، وہیں مولانا ایک اچھے شاعر اور نعت گو بھی تھے، اور مولانا میں شاعری کا یہ ذوق فطری تھا مگر دوسرے شاعروں کی طرح آورد کی سعی نہیں کرتے تھے، بلکہ صرف آمد آمد پر ہی برجستہ اشعار کہا کرتے تھے۔

مختلف زبانوں میں شعر گوئی اردو، ہندی، فارسی اور عربی ان چاروں زبانوں میں شعر کہنے پر قدرت رکھتے تھے، مولانا کی آواز میں غضب کا سوز و گداز تھا، اور اشعار ترنم کے ساتھ سنایا کرتے تھے، آواز میں بڑی جاذبیت تھی، بالخصوص جب نعت سناتے تو مولانا پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی، خود بھی اشکبار ہوتے اور سننے والوں کو بھی رُلاتے تھے۔

ابتدائے زندگی میں اشعار لکھتے تھے، مگر مجمع عام میں سناتے نہیں تھے۔ اس کا ماحول بھی نہیں تھا، مدرسہ کی زندگی میں اس وقت وہ آزادی بھی نہیں تھی، جو آج عام طور پر پائی جاتی ہے، طلبہ پر بڑی پابندی ہوا کرتی تھی، اور طلبہ کی ایک ایک حرکت و سکون پر ذمہ دار نظر رکھتے تھے۔ مشاعرہ کرنے اور مشاعرہ میں جانے کی آزادی قطعاً نہیں تھی بلکہ تصور بھی نہیں تھا،

مجمعِ عام میں شعر گوئی مولانا کی شاعری منظرِ عام پر اس وقت آئی، جب ہندوستان میں تحریکِ خلافت کا زور بڑھا، اور جس زمانہ میں مولانا ٹونک میں پڑھتے تھے،

اور حالات کے تقاضے سے مجبور ہو کر یا متأثر ہو کر ٹونک سے اجمیر پہونچے، اور خواجہ اجمیری کے مزار پر حاضری دی، اور فی البدیہہ ایک لمبی نظم کہہ ڈالی، اور وہاں کی جامع مسجد میں ہزاروں نمازیوں کے مجمع میں پڑھ کر اپنے خاص انداز میں سنائی، جسے سن کر سارا مجمع بے خود اور بے تاب ہو گیا، اور ایک ہلچل مچ گئی۔

اردو ادب سے تعلق مولانا گیلانی رحؒ نے اپنے بیتے ہوئے دن میں لکھا ہے

"معقولیت کے ساتھ اردو ادب کا ذوق فقیر پر اسی قدیم ماحول (زمانۂ طالب علمی ٹونک) میں بعض بیرونی مؤثرات کے تحت غالب تو نہ تھا، لیکن گونہ اس سے بھی تعلق ضرور قائم ہو گیا تھا۔"

(رسالہ دارالعلوم دیوبند ذی الحجہ ۱۳۷۰ھ)

مولانا گیلانی رحؒ نے جس زمانہ میں تقریر شروع کی تھی، جس کی تفصیل اپنی جگہ گذر چکی، اور تقریری مواد کے خاطر "احیاء علوم الدین" کا مطالعہ شروع فرمایا تھا، وہیں سے شاعری کی بھی ابتدا ہوئی، خود تحریر فرماتے ہیں:۔

"اس زمانہ میں وہ نظم حضرت خواجہ اجمیری رحؒ کے قبۂ بیضا کے سامنے کھڑے ہو کر سنائی گئی، جو متعدد بار شائع بھی ہوئی، سنا تھا کہ مقامی حکومت کی طرف سے ضبطی کا حکم بھی ہوا تھا اس کا عنوان تھا "شکوۂ خواجہ" اور یہ نظم ۲۲ صفر ۱۳۳۰ھ میں سنائی تھی۔" (ایضاً)

مولانا کی شاعری کے سلسلے میں آپ کے ایک شاگرد نے لکھا ہے:۔

"مولانا کی ذات میں شاعری کے سارے لوازم بھی وہبی ہوں یا کسبی پوری طرح موجود تھے، شگفتگی بلکہ رنگینی ان کی طبیعت پر

غالب تھی، ان کا احساس قوی، مشاہدہ عمیق اور قوت تخیل بلند تھی، عربی، اُردو، فارسی اور ہندی زبان کلاسکی کلام تک ان کی پوری طرح رسائی تھی، ان چاروں زبانوں کے سیکڑوں منتخب اشعار ان کے نوکِ زبان پر تھے، خود بھی اُردو، فارسی، عربی اور ہندی میں معیاری اشعار کہہ لیتے تھے"۔

(مقالات احسانی ص۱۵)

مولانا کی شاعری دراصل واردات قلب کی ترجمان تھی، ارادہ کرکے نظم کہنے کی عادت نہیں تھی، اور نہ اسے اپنے لئے پسند کرتے تھے،

مولانا گیلانی شاعر کی حیثیت سے مشہور نہیں تھے، خاص احباب کے سوا کوئی جانتا بھی نہیں تھا کہ آپ برجستہ اشعار کہتے ہیں، اور جب کہتے ہیں تو خوب کہتے ہیں۔

شکوۂ خواجہ "شکوۂ خواجہ" نامی نظم آپ نے ۱۳۳۰ھ میں کہی تھی جب آپ ٹونک مدرسہ خلیلیہ کے طالب علم تھے، لیکن یہ نظم بتاتی ہے کہ آپ کی یہ پہلی نظم نہیں ہے۔ اس میں جو روانی، سلاست، زور بیان اور برجستگی ہے وہ گواہ ہے کہ شاعر نے اس سے پہلے بھی اشعار کہے ہیں۔

شکوۂ خواجہ کے اشعار یہاں سے شروع ہوتے ہیں ؎

بے طرح درد سے دل آج بھر آتا ہے — خون بن کر جگر آنکھوں میں چلا آتا ہے
حسرت ویاس کا سینے سے بڑا ناتا ہے — شکوے چلے آتے "ہیں" گلا آتا ہے
جسم میں آج مری جان گھٹی جاتی ہے
میرے ارمانوں کی اقلیم لٹی جاتی ہے

یہ مسدس اس طرح کے بارہ بندوں پر مشتمل ہے، اور جوشِ بیان مسلسل بڑھتا چلا

گیا ہے، اس باب کے اخیر میں ان شاء اللہ یہ پوری نظم دے دی جائیگی تاکہ اندازہ ہو کہ پہلی نظم جو عوام وخواص کے سامنے آئی وہ کس انداز کی تھی، اور اس وقت مولانا کے جذبات کیا تھے۔

ایک نعت کا پس منظر جون ۱۹۲۶ء میں مولانا گیلانی تعطیل گرما گذارنے وطن آئے ہوئے تھے، اچانک یہیں گیلانی میں ایک مہلک سخت بیماری کا آپ پر حملہ ہوا، اندرون جسم میں تمام پھوڑے ہوگئے، جسے اطبا کی اصطلاح میں تقیح الدم کہتے ہیں، ایسا معلوم ہوا کہ اندر سے سارا بدن پک گیا، مسلسل یکے بعد دیگرے سات آپریشن ہوئے اور اندر سے ریم نکالی گئی، اور ہر بار کافی مقدار میں ریم نکلی، تیمار داروں کا کہنا ہے کہ ایک ایک آپریشن میں تین تین سیر ریم نکلی تھی، یہ سارے آپریشن پٹنہ ہسپتال میں ہوئے۔

آٹھویں آپریشن کی جس دن تیاری تھی، اس رات میں غالباً سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت حصہ میں آئی۔ مولانا نے خود اس واقعہ کو اس طرح لکھا ہے:۔

"صبح ہوئی، عجیب صبح تھی، ڈاکٹر آئے...... متحیر ہوکر پوچھ رہے تھے پھوڑا کہاں سا تھا، آخر اس فیصلہ پر مجبور ہوئے کہ اب آٹھویں آپریشن کی ضرورت نہیں رہی، کیوں باقی نہیں رہی؟ یہ ایک راز تھا جس سے نہ اس وقت واقف ہوئے، سیہ کار پر نظرِ رحمت پڑ چکی تھی"۔

گھمی زبان کی نعت اس بیماری کے دوران مولانا نے گھمی زبان میں یہ نعت کہی تھی، اس کے چند اشعار یہاں ملاحظہ فرمائیں۔

پیارے محمدؐ جگ کے سجن — تم پر واروں تن من دھن

تمری صورتیا من موہن کبھو کرا ہو تو درشن

جیا کنہرٹے دلواتر سے

کرپا کے بدرا کھیا برسے

تمری دو ریا کیسے چھوڑوں تم سے توڑدں تو کس سے جوڑوں

تمری گلی کی دھول بٹوروں تمری نگر میں دم بھی توڑوں

جی کا اب ارمان یہی ہے

آٹھوں پہر اب دھیان یہی ہے

مولانا اس کے بعد صحت یاب ہونے لگے، اور اللہ تعالیٰ نے بہت جلد صحت بخشدی، پھر اپنی ملازمت پر حیدر آباد تشریف لے گئے، اور یونیورسٹی میں اپنے تعلیمی فرائض انجام دینے لگے۔

زیارت حرمین شریفین | ۱۹۲۸ء میں جب حضرت مولانا گیلانی اپنے — دو رفیقوں مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور مولانا عبدالباری ندوی کے ساتھ زیارت حرمین کے لئے تشریف لے گئے، تو جاتے ہوئے پانی کے جہاز میں مولانا کا بیان ہے کہ رات کے وقت جہاز کی بالائی منزل پر چلا جاتا تھا، اور رات کے اس سناٹے میں بے ساختہ مدینہ منورہ کا دھیان آنکھوں میں پھرنے لگتا تھا

اس سفر میں نعت | اس وقت بھی مولانا نے ایک نعت کہی، جو بہت مقبول ہوئی، اور ہے بھی اس لائق کہ بار بار پڑھی جائے، وہ نعت یہاں سے شروع ہوتی ہے ؎

ہر ایک سے ٹکرا کر، ہر شغل سے گھبرا کر ؎ ہر کام سے پچتا کر، ہر فعل سے شرما کر

آمد بدرت جنگر، اے خاتم پیغمبر ؐ

اے سرورِ ہر سرور، اے رہبرِ ہر رہبر ؎ اے آنکہ توئی افسر، ہر کہتر و ہر مہتر

فی المبدأ والمحشر، اے ہستیِ تو محور ؎ للاکبر والاصغر، اے طلعتِ تو مظہر

للاوّل والآخر، اے رحم جہاں پرور

آقائے کرم گستر، آمد بدرت جنگر

یہ بھی ایک لمبی نعت ہے، اور بہت مؤثر ہے، مولانا گیلانی نے یہ پوری نعت گرمی کی ایک دوپہر میں جب سب محوِ خواب تھے، مجھے بٹھا کر ترنم سے پڑھ کر سنائی تھی،

جوہر مرحوم پر مرثیہ | مشہور سیاسی رہنما مولانا محمد علی جوہر ہندوستان کے مشہور لیڈر گزرے ہیں، خلافت کمیٹی کے زمانہ میں جن کے نام کی دھوم تھی، جب ان کا انتقال ہوا، تو مولانا نے مرثیہ لکھا، اس کے بھی چند اشعار پڑھیں ؎

بدینِ مصطفےٰ دیوانہ بودی ؎ فدائے ملّتِ جانانہ بودی

بہ بزمِ ما رئیسِ عشقبازاں ؎ بہ رزمِ دشمناں فرزانہ بودی

بدل بودے فقیرے بے نوائے ؎ بہ قالب پیکرِ شاہانہ بودی

سیاست را نقاب چہرہ کردی ؎ وگرنہ عاشقِ مستانہ بودی

چہ دانستی کجا سوزم نہ سوزم ؎ تو شمعِ دین را پروانہ بودی

رسیدی از راہِ اغیار تا یار ═══ عجب مستے عجب دیوانہ بودی

گیلانی پر مثنوی | مولانا گیلانی رحؒ نے ایک پوری مثنوی اپنے وطن گیلانی پر لکھی تھی، اور اسے کبھی کبھی خود پڑھ کر سنایا بھی کرتے تھے، اس کے چند اشعار بھی یہاں درج کر دینا مناسب ہے ؎

مسقط الراس وہ وطن پیارا ؎ عہدِ طفلی کا اپنے گہوارہ

منظر اس کا ہے کیسا دیدہ زیب — اُف مینو سواد زہد فریب
وہ درختوں کی اس کے رعنائی — اور باغوں کی حسن وزیبائی
یاد آتی ہے مجھ کو گیلانی — مظہرِ لطف غوثِ سبحانی
مصدرِ رازہائے عرفانی — مطلعِ جلوہ ہائے روحانی

منبعِ علم، مخزنِ حکمت
مرکزِ جاہ وعظمت وشوکت

دوسری نظمیں ایک نظم مولانا گیلانی رح نے حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد پر بھی ان کی وفات کے بعد لکھی تھی، اسی طرح سید الملت علامہ سید سلیمان ندوی رح پر بھی ایک لمبی نظم کہی تھی، جو سوز وگداز میں ڈوبی ہوئی ہے، ان دونوں بزرگوں سے مولانا گیلانی کو بے انتہا محبت تھی، جب کبھی مولانا کا مجموعۂ اشعار شائع ہوگا، — اس وقت آپ کی شاعری کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

مولانا عبدالماجد دریابادی نے لکھا ہے:-

"مولانا کی ذہانت، ذکاوت، حافظے کے کرشمے بار بار دیکھے، نعتیہ نظمیں خوب خوب کہتے اور خوبتر انداز سے پڑھتے، ہر مصرع کے ساتھ دل کشی اور جاذبیت بڑھتی ہی جاتی، بہار کی ہندی (مگھی) زبان پر بھی قدرت انھیں حاصل تھی، اور ایسی ہی قدرت بے تکلف فارسی مصرعوں پر بلکہ عربی مصرعوں پر بھی۔" (معاصرین ص۱۸۲)

مولانا کا تخلص مولانا اشعار میں اپنا تخلص کیا لکھتے تھے، تلاش وجستجو سے معلوم ہوا کہ ابتدا میں ضیا، تخلص استعمال فرماتے تھے، رسالہ القاسم دیوبند میں مولانا کی ایک فارسی نظم "خیر مقدم" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے آپ نے

اس میں اپنا مقطع اس طرح لکھا ہے ؎

باہزاراں شوق، صد امیدہا
بیں ضیا مدح خواں آید ہمیں

رسالہ القاسم کے پرانے پرچوں میں مولانا کی متعدد فارسی اور اُردو نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ بعد میں کہیں کہیں احسن بھی بطورِ تخلص استعمال فرمایا ہے، یوں عام طور پر مولانا نظموں میں تخلص کے استعمال کا اہتمام نہیں فرماتے تھے۔

مولانا گیلانی رح نے ایک نظم "اشک حقیقت" کے عنوان سے ۱۳۳۵ھ میں لکھی تھی ؎

قمرِ غرب کو کل جس نے دی خلوتِ نور — آج اس نیرِ خاور کو ہو کیوں اس سے نیاز
مغربی عقل سے کیا واسطہ تجھکو اے ناداں — ان کے دفتر کو ہٹا، دیکھ تو فرہنگ حجاز
مے بطحا ہے یہ ظالم اسے پی لے پہلے — مستی وکیف کا پھر پوچھنا مجھ سے انداز
مغربی صومعے ہیجانِ دماغی کے سوا — رکھتے کیا ہیں، جو بڑھائیں گے دلی سوز وگداز
ڈھونڈھتا کیا ہے کنیسوں میں بتوں کے اسکو — گھر میں غیروں کے بھلا کیوں ہو وہ جلوہ پرداز

پیکرِ عجز تو بن، شیشۂ حیرت بن کر
دیکھ پھر قوت وقدرت کا تو اپنے آغاز

(القاسم دیوبند ربیع الاول ۱۳۳۵ھ)

سیاسیات اور مولانا گیلانی

زمانۂ خلافت میں جب آپ ٹونک میں پڑھ رہے تھے، ٹونک کی جامع مسجد میں ایک تقریر کی تھی، وہ آپ کی پہلی تقریر تھی، جو دینی ہونے کے ساتھ سیاسی بھی تھی، یہ زمانہ بھی خلافت تحریک کا تھا۔ اور اسی جوش میں اجمیر پہونچ کر بھی آپ نے وہاں کی مسجد میں تقریر کی اور "شکوۂ خواجہ" لکھ کر ہزاروں کے مجمع میں سنایا، یہ نظم جہاں دینی جذبات سے لبریز ہے، وہیں اسکے سیاسی ہونے میں بھی شبہ نہیں، جیسا کہ اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوگا۔

دیوبند آمد کہنا چاہیے کہ پھر وہی جذبہ جو آپ کو ٹونک سے اجمیر لے گیا تھا — وہی بالآخر دیوبند کھینچ لایا، اور کون نہیں جانتا اس زمانہ میں دیوبند آزادی کی جنگ کا مرکز تھا، شیخ الہندؒ بقید حیات تھے اور ریشمی رومال کی تحریک شباب پر تھی۔

اسی جذبہ نے آپ کو شیخ الہندؒ سے قریب کیا، اور اس وقت کے نائب مہتمم حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ نے آپکو اپنا وکیل بنا کر شیخ الہند کی خدمت میں بھیجا:۔ مولانا نے "بیتے ہوئے دن" میں اس واقعہ کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے لکھتے ہیں۔

"ایک دن مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے فقیر کو یاد فرمایا اور کہا کہ تم شیخ الہند سے مل کر دریافت کرو کہ واقعی سیاسیات میں حضرت والا کا صحیح مسلک کیا ہے۔" (رسالہ دار العلوم جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ ص ۴۲)

مولانا یہ سوال لے کر حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے، اور جو کہا گیا تھا، پوچھا، تو شیخ الہندؒ نے جواب میں فرمایا دیوبند کا مدرسہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کے لئے قائم کیا گیا تھا، اور آخر میں فرمایا۔

"تعلیم و تعلّم، درس و تدریس جن کا مقصد اور نصب العین ہے میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن خود اپنے لئے تو اسی راہ کا انتخاب کیا ہے جس کے لئے یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے قائم کیا تھا، فرائض الٰہیہ جس حد تک بن پڑا، ادا کرتا رہا، اب آخری کام رہ گیا ہے جسے آخری حد تک کرگذروں گا۔" (ایضاً)

چنانچہ اسی کے ڈیڑھ دو سال بعد حج کے ارادہ سے حجاز کا سفر کیا اور اسی سفرِ حجاز میں مکہ مکرمہ سے گرفتار کر کے مالٹا پہنچائے گئے، اور وہاں سے ساڑھے تین سال بعد رہائی ملی، واپسی کے بعد صحت جواب دے چکی تھی، بمشکل چھ ماہ بقیدِ حیات رہے۔

مگر اس ایک دو واقعہ کے بعد کہیں سے بھی پتہ نہیں لگتا کہ آپ نے بطور خود سیاست میں کبھی عملاً یا مشورۃً کوئی حصہ لیا ہو، مولانا کے شاگرد نے بھی گواہی دی ہے کہ:۔

"سیاسیات کی خارزار سے انھوں نے اپنا دامن بچائے رکھا۔"
(ایضاً)

خود مولانا نے اپنے ایک مضمون "ارتسامات گیلانیہ" میں لکھا ہے کہ جب جمعیۃ العلماء بہار کا اجلاس بہار شریف میں ۱۹۱۷ء میں ہوا، تو وہاں خانقاہ

رحمانی مونگیر کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے ان کو بھیجا گیا، جب اس اجلاس میں شیخ الہندؒ کی رہائی کی تجویز آئی، تو پہلے صدر جلسہ مولانا سید شاہ سلیمان پھلواروی راضی نہیں ہوئے کہ یہ تجویز آئے، کیونکہ اس کی وجہ سے حکومت کا عتاب آسکتا ہے، مگر حضرت مولانا سجاد صاحب نائب امیر شریعت بہار واڑیسہ اور مولانا گیلانی کی خوشامد اور سمجھانے سے صدر صاحب راضی ہوگئے، یہ وہ وقت تھا کہ بقول مولانا گیلانی۔

"اس وقت تک دلی کی جمعیت کا خواب بھی نہ دیکھا گیا تھا"۔

مولانا گیلانی لکھتے ہیں:۔

"خاک سار کے شباب کا زمانہ تھا، جوش وخروش میں خوب دھواں دھار تقریریں کی گئیں"۔ (حیاتِ سجاد ص۵۲)

اس کے بعد صدر جلسہ حضرت شاہ سلیمان پھلواروی کی حکومت سے خوفزدگی کا واقعہ بیان کر کے لکھتے ہیں:۔

"کیا معلوم تھا کہ آج شاہ (سلیمان پھلواروی) صاحبؒ کے جس فعل کو ہم کمزوری قرار دے رہے ہیں، کل ان ہی کمزوریوں کا ارتکاب کرنا پڑے گا، بلکہ پوری زندگی اسی کمزوری میں بسر ہوگی"۔

(حیات سجاد ص۵۲)

اس کی وجہ بھی لکھی ہے:۔

دوپہر میرے گلے میں ملازمت کا طوق ڈالا گیا، جس کے بعد دیکھنے کے سوا زندگی کی ساری علامتیں مجھ سے مفقود ہو گئیں"۔ (حیاتِ سجاد ص۵۲)

اسی مضمون کے حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے:۔

"میری سیاسی نا آشنائی کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ہندی سیاست کے سب سے بڑے بازیگر مسٹر گاندھی کے دیکھنے کی نوبت اب تک نہیں آئی"۔ (ایضاً)

یہ تحریر مولانا کی ۱۹۴۱ء کی ہے، اس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ مولانا ابتدائے زندگی ۱۹۲۰ء میں سیاست سے کنارہ کش ہوئے تو تا وفات الگ ہی رہے، کبھی اس دائرہ میں قدم نہیں رکھا۔

ایک اور جگہ آپ نے لکھا ہے:۔

"تقریباً بیس سال ہوئے کہ جمعیۃ علماء بہار کے پہلے اجلاس میں شریک ہونے کے بعد سیاست کے میدان سے باہر نکل گیا۔ سیاسیات کے سلسلہ میں جو انقلابی حوادث پیش آتے رہے ان سے نہ صرف عملاً بلکہ علماً بھی اگر سچ پوچھئے تو بے تعلق رہا"۔ (حقیقتِ سجاد ص۲)

شیخ الہند کا حال ابواب جہاد پر

حضرت مولانا گیلانی نے خاکسار سے ایک حاضری کے موقع سے فرمایا کہ حضرت الاستاذ (شیخ الہندؒ) کا عجیب عالم ہوتا تھا، جب کتاب الجہاد کے ابواب سامنے آتے تھے، آنکھیں سرخ ہو جاتیں چہرہ تمتما اٹھتا، آواز میں غضب کی تیزی آجاتی اور فرماتے کتاب المغازی، اور کتاب الجہاد کے اتنے ابواب کتب حدیث میں کیوں آئے؟ ہمارے علماء کبھی نہیں سوچتے اس پوری کتاب کو بے کار سمجھ رکھا ہے، غصہ میں فرماتے جاتے پڑھتے چلو جب ان مقاصد کا پاس ہی نہیں جن کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اقوال نقل کئے گئے ہیں تو تقریریں کر کیا کرو گے؟

مولانا کا کہنا تھا کہ جتنے دنوں کتاب المغازی کی حدیثیں پڑھی جاتی تھیں

حضرت الاستاذ کی کیفیت خاص میں فرق نہیں آتا تھا، ہم سب اس طرزِ انداز کو دیکھ کر سہمے ہوئے رہتے تھے۔

مولانا کے اشعار سیاست سے تعلق کا اظہار نوجوانی کے ان اشعار سے ہوتا ہے، جو آپ نے زمانۂ خلافت میں کہا تھا، اور پڑھ کر سنایا بھی تھا، مثلاً "شکوۂ خواجہ" کے یہ اشعار ؎

ہائے اسلام پہ کفار مظالم توڑیں — ہم ضعیفوں پہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑیں
عورتوں تک کو نہ مردود شیاطیں چھوڑیں — تہمتیں سیکڑوں الٹے ہی وہ ہم پر جوڑیں

آہ دنیا سے مسلمان اٹھے جاتے ہیں
تیغ تثلیث سے مظلوم کٹے جاتے ہیں

نہ یہی، بلکہ وہاں گنبد اقدس ڈھایا — لوٹا غارت کیا جس چیز کو اس نے پایا
اس ستم نے فلکِ پیر کو بھی چکرایا — گویا ایران پہ، پھر چڑھ کے ھلاکو آیا

روضۂ پاک میں اور خون مسلمانوں کا
پھر بھی ٹھنڈا نہ کلیجہ ہوا شیطانوں کا
آہ تریولی کے معصوم وہ ننھے بچے
ذبح ہوں خنجرِ بے داد سے بھوکے پیاسے

تزکیۂ باطن و تصفیۂ قلب

جیسا کہ عرض کیا گیا مولانا کو قدرت کی طرف سے جو دل عطا گیا تھا، وہ بہت پاکیزہ، صاف ستھرا، اور نفس و نفسانیت سے خالی تھا، پھر تربیت پائی مولانا نے مولویانہ ماحول اور عالم خاندان میں، اس نے اور بھی نکھار دیا پھر جس دور میں آپ پیدا ہوئے، وہ آج کے موجودہ دور سے بہت مختلف اور اخلاق و اخلاص سے بھرپور تھا، انسانوں میں عام طور پر خوف و خشیتِ الٰہی طبعًا پائی جاتی تھی، ابتدائی اور انتہائی تعلیم کے زمانہ میں ایسے اساتذہ حصہ میں آئے، جو اخلاص عمل اور للہیت میں بڑا اونچا اور امتیازی مقام رکھتے تھے، ان کی صحبت اور تعلیم و تربیت نے بھی مولانا کے باطن کو جلا بخشنے میں بخل سے کام نہیں لیا، اور بقول خود مولانا مرحوم امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم کے مطالعہ نے بڑا کام کیا اور قلب و دماغ اور ظاہر و باطن کو بدل کر رکھ دیا۔

بیعت کا ارادہ لیکن بایں ہمہ ایک وقت آیا کہ مولانا نے توبہ و انابت کیلئے ایک ایسے عارف باللہ کے دامن سے وابستہ ہونا ضروری سمجھا جس کی نگاہیں مسِ خام کو کندن بنا دیتی تھیں، اور باطل کو کاٹنے میں تلوار کا کام کرتی تھیں پھر مولانا نے محسوس کیا کہ کچھ باطنی روگ لگے ہوئے ہیں، ان کا ازالہ ضروری ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا ایمان جن شکوک و شبہات کا پامردی سے مقابلہ

کررہا ہے، وہ کبھی ہمیں زیر کر دینے میں کامیابی حاصل کرلے، اور ہم مغلوب ہوجانے پر مجبور ہوں۔

اس سلسلہ میں مولانا کی نگاہ انتخاب اپنے بزرگ ترین استاذ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی قدس سرہٗ (م ۱۳۳۹ھ) پر جاکر رُکی، جن کے تصرفِ باطنی کا تجربہ بھی پہلے ہوچکا تھا، خود تحریر فرماتے ہیں:۔

"سیدنا حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ تلمذ وبیعت کی سعادتیں اس کوتاہ بخت، سیاہ کار کے لئے جس حد تک بھی سرمایۂ افتخار وناز ہوں کم ہیں۔" (رسالہ دارالعلوم جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ ص۲۹)

بیعت کی نعمت | آگے لکھتے ہیں:۔

"حضرتِ والا کے حلقۂ درس میں دوسروں کے ساتھ حاضری کا موقع میرے لئے بھی آسان کیا گیا، اور صورتِ حال ایسی پیش آگئی کہ بیعت کے لئے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے دست حق پرست تک پہونچا دیا گیا، ورنہ اپنی سابقہ ولاحقہ زبوں حالیوں کو جب سوچتا ہوں کہ یہ کیسے ہوا؟ حضرت کے تلامذہ میں کہاں امام کشمیریؒ اور شیخ مدنیؒ اور انہی جیسے اجلّہ اکابر شریک ہیں، اسی طرح روحانی تربیت یافتوں میں خدا ہی جانتا ہے کتنے بڑے بڑے مقبولانِ بارگاہِ الٰہی ہوں گے۔" (ایضاً)

وارفتگی کی شان | مولانا گیلانی کے ایک شاگرد نے لکھا ہے، اور بہت درست لکھا ہے:۔

"حضرت گیلانیؒ جذب کی دولت اپنے ساتھ ہی لیتے آئے تھے ان کے لڑکپن اور نوجوانی کے دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اُن پر ابتدا ہی سے وارفتگی کی شان طاری تھی، جو بے ساختہ ہونے کی وجہ سے نہایت دل فریب تھی، علمی اور فکری مقامات میں حضرت جس قدر ہوشیار تھے، عام امور میں اسی قدر بھولے بھالے، مالی نقصانات بھی اُٹھاتے، مگر کھو کر بھی ہمیشہ بے فکر ہی رہتے، کیونکہ آنی فانی چیزیں کبھی ان کی توجہ کا مرکز نہ بن سکی تھیں۔"

(مقدمہ مقالات احسانی ص۱۷)

آگے لکھتے ہیں:۔

"حضرت گیلانی "مجذوب سالک" تھے، یعنی جذبِ الٰہی کی دولت پہلے ملی تھی، پھر مقامات سلوک طے فرمائے تھے، اور اس غرض کے لئے دورانِ طالبِ علمی ہی میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کے دستِ گرفتہ ہوگئے تھے، مگر علمی مشاغل کی وجہ سے اس وقت روحانی استفادہ کا موقع نہ مل سکا، اور حضرت شیخ الہندؒ رحلت فرما گئے۔" (مقدمہ مقالات احسانی ص۱۷)

یہ واقعہ ہے کہ آپ زمانۂ طالب علمی میں ہی بیعت ہوگئے تھے اور آپ کے بیعت ہونے کے ایک سال بعد حضرت شیخ الہندؒ حج کے نام پر ہندوستان سے حجاز تشریف لے گئے، اور ابھی وہیں قیام پذیر تھے کہ شریف مکہ کے ذریعہ انگریزی حکومت نے آپ کو گرفتار کرکے مالٹا بھیجدیا، اور جب وہاں سے بڑی کوششوں کے بعد واپس تشریف لائے تو بیماریوں نے گھیر لیا اور اسی ماحول میں چھ ماہ بھی نہیں گذرے تھے کہ ۱۳۳۹ھ کو آپ کا وصال ہوگیا۔

ذوقِ سلوک | اس لئے مولانا گیلانی کو اپنے مرشدِ اوّل سے استفادہ کا جو موقع ملنا چاہیے تھا نہیں ملا، مگر چوں کہ مولانا کا ذوق تصوف وہبی تھا، اس لئے

کسی آن راہِ طریقت وسلوک سے غیر متعلق نہیں رہے، شیخ اکبر ابنِ عربی اور مولانا جلال الدین رومی اور ان دونوں کی کتابوں "فتوحاتِ مکیہ"، اور مثنوی مولوی معنوی سے گہرا لگاؤ اور تعلق تھا اخیر زندگی میں مجالس الشیخین کے عنوان سے مولانا گیلانی نے مستقل مضمون کا سلسلہ ہی شروع کر رکھا تھا، اور بڑی دلچسپی سے بیان فرماتے تھے کہ آج شیخ اکبر یا مولانا رومی کی مجلس میں حاضر ہوا، وہ یہ فرما رہے تھے، مقالاتِ احسانی میں یہ پورا مقالہ چھپ گیا ہے۔[1]

دوسرے مرشدین مختصر یہ کہ حیدر آباد کے زمانہ قیام میں مولانا نے محسوس کیا کہ کسی ایسے بزرگ سے اب پھر رشتہ قائم کیا جائے جو راہِ سلوک طے کر چکا ہو۔ مولانا نے غور و فکر کے بعد ایک بغدادی الاصل بزرگ کو منتخب کیا، جن کا قیام حیدر آباد میں عرصہ سے تھا، وہ تھے حبیب العیدروس رحمۃ اللہ علیہ، جو شیخ عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ سے نسبی اور باطنی نسبت رکھتے تھے۔[1]

خلافت ان سے اپنا رشتہ سلوک جوڑا، اور سلسلۂ قادریہ میں تربیت حاصل کی اور خلافت بیعت سے نوازے گئے، مگر سلسلۂ قادریہ میں رسوخ حاصل ہو جانے کے باوجود اپنے خاص مزاج کی وجہ سے اطمینانِ کامل محسوس نہیں کیا، اور اس کی وجہ وہی تھی کہ چشتیت کا رنگ مولانا کی طبیعت پر غالب تھا جو عام دیوبندی علماء میں پایا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس کی صورت یہ پیدا کی کہ ایک حیدر آبادی بزرگ مولانا محمد حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ان کو پہونچا دیا گیا، جو حضرت شیخ محی الدین ابنِ عربی رح کے قالاً و حالاً ترجمان تھے، اور جہاں پہونچ کر لوگ ایمان و ایقان کی دولت سے مالا مال ہوا کرتے تھے۔

[1] مقالاتِ احسانی ص۱۳

مولانا گیلانی کو یہاں پہونچکر مناسبتِ تامہ حاصل ہو گئی، اور شیخ کی توجہات خصوصی کے مرکز بن گئے، اور تھوڑے ہی عرصہ بعد یہاں سے بھی خلافت کی دولت سے نوازے گئے۔[1]

جذب اور کشش اس طرح حضرت مولانا گیلانی نے دوہری خلافت پا رکھی تھی۔ اور خود صاحبِ معرفت ہو گئے تھے۔ میں نے بارہا محسوس کیا کہ مولانا مرحوم میں بے پناہ کشش ہے، مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے والا کھلے طور پر محسوس کرتا تھا کہ دل ان کی طرف کھچا چلا جا رہا ہے، بالخصوص جب نمازِ فجر کی امامت میں مولانا قرارت کرتے تھے، تو ایسا معلوم ہوتا تھا، دل کھچکر مولانا کے پاس چلا گیا، دل کا تھامنا مشکل ہوتا تھا، اور جی چاہتا تھا کہ مولانا لمبی سے لمبی قرارت فرماتے رہیں اور ہم مقتدی سنتے رہیں، جو لذت مولانا کے پیچھے فجر کی نمازوں میں ملتی تھی، یاد نہیں پڑتا کہ وہ لذت و کیفیت کہیں اور اس طرح محسوس طور پر حصہ میں آتی ہو۔

مولانا ابو الحسن علی ندوی مدظلہ نے بھی لکھا ہے:۔

"اس اثنار میں اگر نماز کا وقت آجاتا، تو مولانا حاضرین یا صاحبِ خانہ کے اصرار سے مصلے پر تشریف لے جاتے، ان کی قرارت میں بڑا سوز اور حلاوت تھی، قلب پر اس کا اثر پڑتا تھا، اور جی چاہتا کہ قرارت طویل ہو۔" (پرانے چراغ ص۹۴)

مرشد بننے سے گریز گیلانی کی ایک حاضری کے موقع سے ایک دن بیٹھے ہوئے حیدر آباد کے کچھ واقعات سنانے لگے اس موقع سے اور باتوں کے ساتھ یہ بھی سنایا کہ ایک زمانہ میں میری تقریر حیدر آباد میں بڑی مقبول تھی، اور میری تقریر میں بڑا مجمع ہوا کرتا

[1] مقالاتِ احسانی ص۱۸۱ خود مولانا اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "ابھی حیدر آباد سے روانگی کے وقت مولانا محمد حسین صاحب مدظلہ العالی نے جن نوازشوں سے اس عاصی کو سرفراز فرمایا ہے، اپنی حالت دیکھتے ہوئے ہمت نہ پڑی کہ آپ سے اس کا ذکر کروں ... میرے نزدیک ایک ایمانی حسنِ ظن کے سوا اس کے اندر اور کوئی دوسری چیز نہیں۔" (مکاتیب گیلانی ص۲۲۳)

تھا، مسجد میں جمعہ کے دن مجمع کی گرویدگی کا عالم عجیب ہوا کرتا تھا، لوگ عقیدت سے ٹوٹے پڑتے تھے، بہت سارے لوگ آئے، اور خواہش کی بلکہ اصرار کیا کہ میں انہیں بیعت کرلوں، مگر انکار کردیا کرتا تھا، مولانا نے ہنس کر یہ بھی فرمایا کہ کبھی کبھی دل میں آتا تھا کہ لاؤ ان اصرار کرنے والوں کو بیعت کرلوں، اس میں عیب ہی کیا ہے، مگر رات میں جب یکسوئی ہوتی تو سوچتا کہ پتہ نہیں کل قیامت میں اپنا معاملہ ہی کیسے طے پائے گا، اور کیا پیش آئے گا، دوسروں کا بوجھ کیوں اپنی گردن پر ڈالنے کا ارادہ کروں، پھر بیعت کرنے کے خیال کو غلط وسوسہ قرار دے کر علیحدہ ہوجاتا۔ چنانچہ آپ نے کبھی بیعت وارشاد کے رسمی طریقہ کو اختیار نہیں فرمایا، ہمیشہ اس پیری مریدی کے قصوں سے علیحدہ رہے۔

بیعت کرنے سے گریزاں اور جہاں تک علم ہے مولانا کے یہاں بیعت وارشاد کا مروجہ سلسلہ کبھی بھی قائم نہیں ہوسکا، زبانی تبلیغ و تلقین ضرور فرمایا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کے شاگردِ عزیز غلام محمد صاحب کا بیان معتبر ہوگا، وہ لکھتے ہیں۔

"حضرت گیلانی دوہری خلافت رکھنے اور خود صاحبِ معرفت ہونے کے باوجود مسندِ ارشاد کی ذمہ داریوں سے ہمیشہ گریزاں ہی رہے اور جہاں تک میرے علم میں ہے کبھی کسی کو مرید نہیں کیا، ورنہ وہ اگر اس طرف توجہ فرماتے، تو فیوض علمی کی طرح فیضانِ روحانی کا بھی دریا بہہ نکلتا، مگر جو مقدر نہ تھا، وہ ہو کیسے جاتا، حضرت گیلانی نے طالب علمانہ حیثیت ہی اپنے لئے تجویز فرمائی تھی، اسی نقاب میں وہ کمالاتِ باطنی کو چھپائے رہے، اور اسی اخفا کیساتھ اس دنیا سے پردہ فرما گئے۔" (مقدمہ مقالات احسانی ص۱۹)

ایک عجیب واقعہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ جب آخری حج میں تشریف

لے گئے تو آپ نے اپنا چشم دید واقعہ خود مولانا گیلانی کو لکھا کہ:۔

"میں مطاف کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، اچانک میری نظر پڑی کہ تو (یعنی مولانا گیلانی) طواف کررہا ہے خیال آیا کہ وہ آتا تو مجھ سے ضرور ملتا، آخر یہ کیا ماجرا ہے، میں خود تیری طرف ملنے کو لپکا لیکن دیکھا تم غائب ہوگئے، صوفیوں میں جو مشہور ہے کہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہیں، کیا اسی کے ظہور کی یہ شکل تھی۔"

(مکتوب بنام مولانا گیلانی، معارف اعظم گڈھ)

محبت رسول ﷺ ایک دفعہ گیلانی موسم گرما میں خاک سار کا جانا ہوا، مولانا کی بیٹھک دومنزلہ تھی، مولانا کا قاعدہ یہ تھا کہ گرمی کے دنوں میں ظہر کی نماز باجماعت اول وقت میں پڑھ لیا کرتے تھے، پھر آرام کرنے والوں کو آزادی مل جاتی تھی، خود مولانا کو تو دن میں سوتے ہوئے دیکھا نہیں، کتابیں دیکھتے رہتے، سب سو چکے تھے، مجھے استنجا کے لئے نیچے اترنا پڑا، اندر کمرہ سے گذر کر باہر گیا، واپس ہوا تو مولانا نے اپنے پاس بلالیا، فرمانے لگے کہ شعر وشاعری سے بھی تھوڑی بہت مناسبت ہے، ابھی اپنی وہ کاپی یا ڈائری ہاتھ لگی ہے، جس میں میرے اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ پھر اپنی نعتوں کا تذکرہ فرمایا کہ فلاں موقع سے ایک نعت کہی تھی، جو مجھے خود بہت پسند ہے، یہ کہہ کر ترنم کے ساتھ پڑھنا شروع کیا، مولانا کی آواز میں بڑا سوز اور درد تھا، اور کوئی شبہ نہیں کہ ان کی آواز میں بڑی جاذبیت کی شان ہوا کرتی تھی، میری آنکھیں تو اشک آلود تھیں ہی، لیکن میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا کی آنکھوں سے سیلِ رواں جاری ہے۔ پڑھتے جارہے ہیں اور روتے جارہے ہیں، سسکیاں بندھ گئی ہیں، اور ایک وجد کا عالم طاری ہے، آنکھیں سرخ ہورہی تھیں، کوئی آدھ گھنٹہ تک ذرا ذرا ٹھہر کر یہ سلسلہ جاری رہا، اس وقت ہم دو کے سوا کوئی تیسرا نہیں تھا، دوپہر کا وقت تھا

اس کیفیت اور لذت کو میں زندگی بھر بھول نہیں سکتا، میں بہت دیر تک بیٹھا رہا، مجھے کچھ خبر نہیں رہی کہ کہاں ہوں اور کس حال میں ہوں، مولانا کا حال تو اور بھی عجیب و غریب تھا، تھوڑی دیر بعد مولانا نے ہی فرمایا، مولوی صاحب! اب جاؤ اوپر آرام کرو۔

کوئی شبہ نہیں کہ مولانا کی نعتوں میں آج بھی وہی اثر ہے، کوئی بھی مسلمان اسے پڑھ کر اپنے آنسو نہیں روک سکتا ہے، مولانا نے اپنی ایک مجلس میں یہ بھی بیان فرمایا کہ حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد صاحبؒ نائب امیر شریعت بہار و اڑیسہ رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے جب یہ نعت سنائی تو وہ بہت روئے[1]، اس طرح بے تاب ہو کر رونا کسی اور کا یاد نہیں۔ پھر ارشاد فرمایا۔ مولانا سجاد صاحبؒ، صاحبِ نسبت بزرگ تھے۔

صافِ باطنی اور اس کا اثر یہ دراصل، مولانا گیلانی کی صاف باطنی اور اخلاص و للہیت کا اثر تھا، سچ کہا علامہ اقبال مرحوم نے۔ ع

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

مولانا علی میاں مدظلہ، نے بھی لکھا ہے کہ جب مولانا گیلانی ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اس اجلاس میں تشریف لائے جو حضرت سید سلیمان ندویؒ پر مقالات پڑھنے کے لئے دارالعلوم ندوہ میں بلایا گیا تھا، تو اجلاس سے فراغت کے بعد ایک روز اس نعت کے سنانے کی درخواست کی، جو انھوں نے بہار کی گھی زبان میں لکھی ہے، اور جو پہلے بعض اخبارات و رسائل میں چھپ بھی چکی تھی۔ مولانا تیار ہو گئے، مولانا علی میاں مدظلہ کا بیان ہے:۔

"ان نعتوں میں ان کی محبت، سوز، بارگاہ نبویؐ سے عاشقانہ

[1] حیات سجاد میں خود مولانا گیلانی کے جملے ہیں: "مولانا سجاد مرحوم بیقرار ہو گئے، دبے ہوئے آنسو تھم نہ سکے، سیلاب رواں ہوا، اتنا رواں ہوا کہ گھگھیاں بندھ گئیں۔۔۔۔ بے تاب ہو گئے، تڑپ گئے۔ (حیاتِ سجاد ص ۵۵۸) ظفیر الدین۔

تعلق، بغیر کسی تکلف کے ظاہر ہو گیا ہے، ہندی کے میٹھے بول مولانا کا ترنم، اور نعت کا موضوع، ان سب نے مل کر اس میں عجیب دلکشی اور دلآویزی پیدا کر دی ہے، مولانا خود بھی اپنی آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکے، اور سننے والے بھی متاثر اور آبدیدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکے"۔ (پرانے چراغ ص ۸۲)

تاریخ اسلام سے شیفتگی ایسا معلوم ہوتا ہے حضرت مولانا گیلانی سراپا محبت اور عشق رسول میں غرق تھے، جب کبھی عہد نبوی اور خلفائے راشدین کا کوئی واقعہ سامنے آتا، بے چین ہو جاتے، دل میں ایک ہلچل مچ جاتی، اور یادِ نبویؐ سے بے قابو ہو جاتے مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، نے (ایک دفعہ مشرقِ وسطیٰ کے سفر میں تھے)، مولانا مرحوم کے نام ایک خط دمشق کے ایک ہوٹل "یرموک" نامی سے لکھا، پھر کیا تھا یرموک کا نام آتے ہی مولانا پر ایک کیفیت طاری ہو گئی، جیسا کہ مولانا کا خط گواہ ہے، مولانا ندوی مدظلہ، نے جواب میں تحریر فرمایا:۔

"کس نے کہاں اور کن حالات میں اس زار و نزار، بیمار، دور افتادہ دہقانی کو یاد فرمایا، سوچتا ہوں اور گو کھڑا ہونا میرے لئے آسان نہیں ہے، مگر بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ سجدۂ شکر یاد دلانے والے کے قدموں پر ادا کر کے رقص کروں، خدا ہی جانتا ہے کہ الیرموک کی موجوں نے کن دبے دبائے تاریخی محفوظات اور ان سے پیدا ہونے والے جذبات میں طوفانی ہلچل پیدا کر دی ہو گی، جب اپنے آپ کو اس حال میں پا رہا ہوں کہ مکتوبہ شکل میں صرف لفظ الیرموک پر نظر پڑتے ہی تخیل کو آپ کے مشاہدے سے جو تھوڑا بہت سہارا ملا تو گھنٹوں اور جو کچھ اسکے

ساحل پر گذرا اسی میں غرق ہوگیا،، (پرانے چراغ ص۹۱)

النبی الخاتم | مولانا گیلانی کی تصنیفات میں ایک کتاب "النبی الخاتم" بھی ہے جو سیرت نبوی پر آپ نے لکھی ہے، پڑھنے والا جب پڑھتا ہے تو اس پر جذب ومستی کا ایک عالم چھا جاتا ہے، اس قدر مؤثر، دلآویز، اور جامع سیرت شاید دوسری نہیں ہے، اختصار نویسی میں اپنی آپ مثال ہے، مگر اسی کے ساتھ اثر اندازی میں بھی بے مثال، سیرت کا کوئی گوشہ مولانا نے چھوڑا نہیں ہے، اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسالتِ نبوی سے مولانا کو کیسا والہانہ تعلق تھا، مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، نے درست لکھا ہے:

"مولانا کی تصنیفات میں سے غالباً سب سے پہلے "النبیؐ الخاتم" پڑھی، کتاب عجیب البیلے انداز میں لکھی گئی ہے، صحفِ سماوی کا اندازِ بیان، خطیبوں کا جوش وبرجستگی، عُشاق کی مستی ووارفتگی عقل وجذب کی لطیف آمیزش حسبِ عادت معمولی معمولی اور مشہور واقعات سے لطیف نکتے، اور عظیم نتیجے نکالتے چلے جاتے ہیں، اور اس سرعت وکثرت کے ساتھ کہ پڑھنے والا مصنف سے شکایت کرنے لگتا ہے ع: دامانِ نگہ تنگ وگلِ حسن تو بسیار۔ میں نے اپنی ساری عمر میں سیرتِ نبوی میں رحمۃ للعالمین اور النبیؐ الخاتم سے زیادہ مؤثر کتاب نہیں پڑھی، کتاب پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف علم وانشار پردازی کی کرشمہ سازی نہیں ہے، اس کے اندر ان کا سوزِ دروں اور خونِ جگر بھی شامل ہے۔"

(پرانے چراغ ص۶۷)

عشق نبوی | النبیؐ الخاتم کے تعارف میں مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ، نے لکھا ہے:

"مجھ سے ایک ثقہ بزرگ نے بیان کیا تھا، کہ جن دنوں یہ کتاب (النبیؐ الخاتم) تصنیف ہو رہی تھی، ایک صاحبِ دل بزرگ نے ایک رات عالمِ واقعہ میں دیکھا، کہ حضرت خاتم النبیین۔ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جمال کی پوری تابشوں کے ساتھ رونق افروز ہیں اور مولانا گیلانی قدموں میں تڑپ رہے ہیں۔ لیکن ان سے نظر بچائی جا رہی ہے، صاحبِ واقعہ بزرگ نے یہ دیکھ کر حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے جو وہیں موجود تھے، عرض کیا اس بیچارے کو ایک نظر کیوں نہیں دیکھ لیا جاتا؟ حضرت بلالؓ نے فرمایا اسکو اگر دیکھ لیا، تو مر جائے گا۔" (النبیؐ الخاتم ص۲)

سیدؔ صاحب کی نظر میں | رسالہ معارف، اعظم گڈھ میں علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا:

"النبیؐ الخاتم ...... ایک گلدستۂ عقیدت ہے جسے مولانا مناظر احسن کے عقیدت مند قلم نے سجایا ہے اس میں مولانا نے اپنے خاص والہانہ رنگ میں سیرت پاک کے واقعات کو ایک خاص انداز وترتیب کے ساتھ پیش کر کے نہایت لطیف نتائج پیدا کئے ہیں اس حیثیت سے یہ اپنے طرز میں منفرد ہے کہ تاریخی واقعات کو وارفتگیِ بیان کے ساتھ اس طرح نبھایا گیا ہے کہ ناقد مؤرخین اور اربابِ وجد وحال دونوں اپنے اپنے ذوق کے مطابق لطف اٹھا سکتے ہیں، زبان صاف وسادہ لیکن صنائعِ لفظی سے مالا مال ہے۔" (معارف اپریل ۱۹۵۶ء)

سید سلیمان ندویؒ کی خلافت بیعت پر | حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ علامہ شبلی نعمانیؒ کے ممتاز شاگرد اور دار المصنفین اعظم گڈھ کے روحِ رواں تھے، اسی طرح ندوۃ العلماء کے معتمدِ خصوصی، اور اپنی جماعت کے سربراہ، قدیم وجدید دونوں مکتبِ فکر کے اہلِ علم

سید صاحب کے قدردان اور معتقد تھے اور اب بھی ہیں۔

لیکن ایک وقت آیا کہ خانقاہ تھانہ بھون تشریف لائے اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے مسترشدین میں شامل ہو گئے، قلب اور دماغ سیرت نبوی پر کام کرنے سے مجلّٰی مصفّٰی ہو چکا تھا، مصالحہ تیار تھا، صرف ماچس لگانی تھی، حکیم الامّۃ نے توجہ ڈالی اور حضرت سید صاحبؒ کہاں سے کہاں جا پہونچے، مسترشد کو اپنے مرشد پر فخر اور مرشد کو اپنے اس مسترشد پر ناز۔ تھوڑے دنوں کے بعد خلافت سے نواز دیئے گئے۔

جب مولانا گیلانی کو اس کی اطلاع ہوئی، تو بے انتہا خوش ہوئے، مبارکبادی کا ایک لمبا خط لکھا اور اپنے انداز میں اخلاص و جذب میں ڈوبا ہوا، اس کا کچھ حصہ یہاں ملاحظہ فرمایا جائے۔

"الحمد للہ علم کی دولت کے ساتھ معرفت و عمل کی نعمت بھی آخر میں آپ کے لئے مقدر تھی، هَنِيئًا لَكُمْ ثُمَّ هَنِيئًا لَكُمْ الصادقین کی معیت آپ کو مبارک ہو..... عجب راہ ہے، نہ یہاں محاسدہ ہے نہ مباغضہ، نہ منافقۃ، نہ مقابلہ، بلکہ ہر ایک دوسرے کے لئے داعی۔"
(مکتوب ۲۰/اپریل ۱۹۴۲ء)

مولانا کا اپنا حال | پھر اپنا حال اس طرح ذکر میں آیا، جس میں تواضع ہی تواضع اور اخفار حال ہے۔

"گو مدت ہوئی اس راہ سے دور ہو چکا ہوں، لیکن اب تک وہ حلاوتیں دلِ ناکام کو یاد ہیں۔ جو کسی زمانہ میں میسر آئی تھیں، آپ لوگوں کی انقلابی زندگی خیر کی طرف اور میرا انقلاب شر کی طرف باعث عبرت ہے۔" (ایضاً)

آگے لکھا:۔

"یقیناً آپ بہت بلند ہو چکے ہیں، یوں ہی بلندی کیا کم تھی، اور اب تو ماشاء اللہ حکیم الامّۃ مدظلہ العالی کی نیابت و خلافت کی دولت سے سرفراز ہیں۔[۱]" (ایضاً)

میں نے دیکھا کہ مولانا گیلانی کی چارپائی کے سرہانہ جو الماری رہتی تھی، اسمیں سب سے نمایاں کتاب "فتوحات مکیہ" کی ضخیم جلدیں اور مثنوی مولانا روم کی جلدیں ہوتی تھیں، کبھی اس کو سرہانے سے علیحدہ نہیں دیکھا، اسی طرح تصوّف کی دو چار دوسری عربی کتابیں بھی رہتی تھیں، تصوّف سے مولانا کو خاصا شغف تھا۔

مولانا نے ایک جگہ خود لکھا ہے:۔

"مدت سے خاکسار کا دستور ہے کہ علاوہ قرآن مجید کے، دل کبھی پریشان ہوتا ہے تو مثنوی معنوی یا فتوحاتِ مکیہ ابنِ عربی کا مطالعہ بغیر کسی ترتیب کے شروع کر دیتا ہوں۔" (مقالات احسانی ص۲۳)

مولانا گیلانی اپنے باطنی حالات پر خود پردہ ڈالنے کی سعی کرتے، ایک دفعہ سید صاحبؒ کے خط کے جواب میں لکھا:۔

"ہم لوگوں نے دماغ سے اتنا کام لیا کہ دل بالکل مُردہ ہو کر رہ گیا اس عمر میں اگر دوسری راہ پر رہتا، تو کیا کچھ حاصل نہ کر لیتا، لیکن آہ کہ روزگارم بسر شد بہ نادانی۔" (مکتوب ۵/جنوری ۱۹۴۸ء شائع شدہ معارف جولائی ۶۳ء)

اپنے کو مٹانے کا جذبہ | مولانا میں اپنے کو چھپانے کا بڑا جذبہ تھا، لوگ اپنے کو ابھارتے ہیں، مولانا اس کے برعکس اپنے کو مٹانے کی سعی کرتے تھے، اگر کوئی حسنِ عقیدت

[۱] دیکھئے رسالہ معارف اعظم گڈھ ۱۹۵۷ء۔

کا اظہار کرتا، تو اس کو یقین دلاتے کہ میں ایسا نہیں ہوں، جیسا تمھارا حسنِ ظن ہے

میرے ایک خط کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"آپ نے اپنے اُس کارڈ میں جو اس سے پہلے آیا تھا اس فقیر کے ساتھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس کا قطعی استحقاق نہ تھا، اسی قسم کے حسنِ ظن کو بس جہول وظلوم کے ساتھ قائم فرمالیا ہے، اکبرؔ مرحوم کا ایک شعر ہے ؎

اکبر کی حقیقتِ اصلی کو پوچھو اس کے محلّہ والوں سے
ہاں شعر تو اچھا کہتا ہے، دیوان تو ان کا دیکھا ہے

اچھا شعر اور صاحب دیوان ہونا دوسری بات ہے اور محلّہ والوں کے سامنے آدمی کیا سمجھا جاتا ہے، اس کی اصلی حقیقت وہی ہوتی ہے آپ جیسے صادق الایمان والدین کے حُسنِ ظن کو دیکھ کر اس کی امید قائم کرلیتا ہوں کہ شاید معاملہ کرنے والا حسن ظن کی رعایت فرمائے، تجربہ سے زیادہ اسی کی تائید ہوتی رہتی ہے۔"

(مکتوب ۲۵/ اکتوبر ۱۹۵۲ء)

مولانا دریا آبادی کی نظر میں

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے مولانا کے ذوقِ تصوف کے سلسلہ میں لکھا ہے:۔

"تصوف کے بڑے جاننے والوں میں سے تھے، شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رح سے عقیدتِ خصوصی بھی رکھتے تھے، اور مناسبت طبعی وروحانی بھی تھی، باوجود اس کے رسوم خانقاہی اور بدعات مشائخ کے ذرا بھی قائل نہ تھے، اور وہم پرستوں اور ضعیف الاعتقادوں کے نزدیک بھی نہیں گئے تھے، اکبر کی زبان میں ؎

؎ قائل میں تصوف کا ہوں اکبر لیکن
ارواح پرستی کو تصوف نہیں کہتے

(وفیاتِ ماجدی)

قرآن پڑھنے کے سلسلہ میں مولانا دریا آبادی نے لکھا ہے:۔

"نماز میں قرآن مجید اس خوش الحانی اور درد و تاثر سے پڑھتے کہ جی چاہتا گھنٹوں اسے سنتے رہئے، ہمارے ہم سن تھے اور حضرت تھانوی رح اور مولانا محمد علی جوہر کی وفات کے بعد اب ملت کی زندہ ہستیوں میں انھیں کی ذات میرے لئے محبوب ترین تھی۔"

(ایضاً)

دراصل یہ اثرات تزکیۂ باطن کے تھے جو مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتے تھے کبھی تلاوت کی شکل میں، کبھی تصنیف کی صورت میں، کبھی وعظ و تقریر کے انداز میں اور کبھی مجلسی گفتگو کے طرز بیان میں۔ دل مجلّیٰ ہو، اور ذکر اللہ اور محبتِ رسول سے سرشار ہو تو اس میں ایک خاص دلکشی اور مقناطیسی اثر پیدا ہو ہی جاتا ہے، اور "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔"

زیارتِ حرمین شریفین

حضرت مولانا گیلانی خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، پھر جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کے استاذ دینیات ہونے کی حیثیت سے اچھی تنخواہ پاتے تھے، دارالترجمہ حیدرآباد میں بعض اہم کتابوں کا ترجمہ بھی آپ سے متعلق ہوا اور آپ نے ترجمہ کا فریضہ بھی ادا کیا تھا، اس کتاب کی ضخیم جلدوں کے ترجمہ پر بھی کافی معاوضہ ملا ہوگا گھر پر جائداد بھی تھی، اس طرح حج کے فرض ہونے کے لئے جس استطاعت کی شریعت میں شرط ہے، مولانا میں وہ شرط پائی جاتی تھی، مگر ابھی تک حج کے فریضہ کی ادائگی کا موقع میسر نہیں آیا تھا۔

جون ۱۹۲۷ء میں جب حیدرآباد سے گیلانی اپنے وطن تعطیلِ گرما میں تشریف لائے، تو اچانک سخت بیمار ہو گئے، اور اس بیماری نے کافی طول کھینچا، پٹنہ ہاسپٹل میں کئی ماہ زیر علاج رہے، قدرت کو آپ سے ابھی کام لینا منظور تھا، اس لئے صحت حاصل ہوئی۔

حج کا فریضہ اور اس کی ادائگی اس سال کے ختم کے بعد جب دوسرا سال ۱۹۲۸ء شروع ہوا تو آپ نے سنا اور دیکھا کہ آپ کے رفیق مولانا عبدالباری ندوی رح اور مولانا عبدالماجد دریاآبادی رح حج کی تیاری میں مشغول ہیں، اور سارے انتظاماتِ سفر مہیا کر رہے ہیں، دن رات مولانا عبدالباری صاحبؒ سے حج کی باتیں سنتے بھی تھے اور ان کو دیکھتے بھی تھے، کہ وہ اس سلسلہ میں کیا کیا کر رہے ہیں۔

مولانا گیلانی کے دل میں بھی حج کا بار بار خیال آتا، اور سوچتے کہ کیا اچھا ہوتا کہ ان دو ساتھیوں کے ساتھ وہ بھی حج کر آتے، مگر ساتھ ہی خیال آتا کہ ابھی کچھ ماہ پہلے بیماری پر کافی رقم خرچ ہو چکی ہے۔ سفرِ حج کا انتظام کس طرح کیا جائے، دل اندر سے بے چین تھا اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے جو شیفتگی تھی، اس کا شدید تقاضا تھا کہ اس موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے، ورنہ پتہ نہیں کب پھر ایسے ساتھی مل سکیں گے، اور حج کی سعادت نصیب ہو سکے گی۔

زیارتِ حرمین کا عزم ان حضرات کی روانگی میں صرف ڈیڑھ ہفتے باقی رہ گئے تھے کہ ایک رات دل سے مجبور ہو کر حج کا حتمی فیصلہ کر لیا، کہ جس طرح بھی ہو، اسی سال اپنے انہی دوستوں کے ساتھ حج کے لئے رختِ سفر باندھنا ہے، مولانا نے خود لکھا ہے

> "شاید ہفتہ عشرہ سے زیادہ وقفہ نہیں رہ گیا تھا کہ اچانک عزم کی بجلی سی تھی، جو سینے میں چمک اٹھی، شاید رات کی تاریکی میں اس عزمِ مقدس کا نور قلب میں پیدا کیا گیا تھا، دوسرے دن مولانا عبدالباری سے عرض کیا، فرمایئے اپنی ہم رکابی میں اس (بندہ) کو بھی شریک ہونے کی اجازت مل سکتی ہے؟ جس کی شرکت کا بظاہر کوئی ذریعہ سر دست پیش نظر نہیں۔" (الفرقان شعبان و رمضان ۱۳۶۹ھ)

مولانا کے عزم سے خوشی مولانا ہی کا بیان ہے کہ مولانا عبدالباری صاحب میرے اس ارادہ کو سن کر شگفتہ ہو گئے اور فرمایا کہ ضرور آپ تشریف لے چلیں، اس سے بڑھ کر اچھی بات اور کیا ہوگی، پھر اسی ہفتہ میں حج سے متعلق جو قانونی کارروائی تھی وہ سب انجام پا گئی اور اب صرف روانگی باقی رہ گئی، مولانا عبدالباری کے ساتھ ان کے والدین بھی حج کے لئے جانے والے تھے چنانچہ جس دن وہ حیدرآباد سے رخصت حاصل کر کے لکھنؤ کے لئے روانہ ہوئے، تاکہ وہاں پہونچکر والدین محترمین کو ساتھ لیکر

بمبئی کے لئے روانہ ہوں، مولانا گیلانی بھی اپنے وطن روانہ ہوئے کہ اپنے گھر والوں بستی والوں اور رشتہ داروں سے مل ملا کر، معافی تلافی کرا کے وطن سے ہی بمبئی کے لئے روانگی ہو۔

وطن حاضری مولانا اخیر رمضان المبارک میں حیدرآباد سے اپنے وطن گیلانی ضلع پٹنہ، (بہار) پہونچے، سبھوں سے ملے، ظاہر کیا کہ دفعۃً حج کا ارادہ کرلیا ہے، جانے کی قانونی کارروائی بھی عمل میں آچکی ہے، عید کی نماز آپ لوگوں کے ساتھ ادا کر کے ان شاء اللہ روانگی ہوگی، یہ معلوم کر کے تمام خویش واقارب اور اپنے پرائے خوش ہوئے۔

وطن سے بمبئی کے لئے روانگی مولانا گیلانی نے سفر حج کے لئے زیادہ سامان لینا مناسب نہیں جانا، مولانا کا بیان ہے کہ ایک کمبل، دو چادریں اور تین جوڑے کپڑے اور ایک ہلکا سا بستر، گھر والوں کے ساتھ اسٹیشن آئے، اور بمبئی کا ٹکٹ لیکر ٹرین پر بیٹھے اور روانہ ہوگئے۔

ٹرین جب بمبئی اسٹیشن پہونچی اور مولانا، پلیٹ فارم پر اُترے، تو دیکھا مولانا عبدالماجد دریا آبادی آپ کی طرف آرہے ہیں، خوشی ہوئی، مولانا دریا آبادی بمبئی پہلے آگئے تھے، اب مولانا گیلانی کو لینے اسٹیشن تشریف لے آئے تھے، ان کے ہمراہ جائے قیام پر آئے۔

جدّہ کو روانگی بمبئی میں مولانا کا کوئی آٹھ دس دنوں قیام رہا، اور روانگی کے قانونی مرحلے طے ہوتے رہے، تاریخ متعین پر بمبئی سے جدّہ کے لئے پانی کا جہاز روانہ ہوا، اس جہاز پر حجاج کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ ہوگی، جہاز میں دوسرے شناسا لوگ بھی ملے بالخصوص حضرت مونگیری (مولانا سید محمد علی رح) کے صاحبزادے مولانا لطف اللہ، مولانا نوراللہ، مولانا منت اللہ، ان حضرات کی والدہ ماجدہ اور ہمشیرہ صاحبہ اور دوسرے افراد کل ملا کر یہ قافلہ اکیس آدمیوں پر مشتمل تھا، مولانا لُطف اللہ، مولانا گیلانی کے

بہنوئی تھے، گویا یہ پورا خاندان اپنا رشتہ دار تھا، ان میں بہت سے افراد کے ٹکٹ فرسٹ کلاس کے تھے، اور کچھ ڈیک کے۔

مولانا گیلانی کا سفر بڑے اطمینان وسکون سے طے ہوا، مولانا نے لکھا ہے کہ جب ان کا جہاز یلملم کے سامنے پہونچا تو گھنٹی بجی، جہاز پر سوار مسافروں نے حج، عمرہ کا احرام باندھا، مگر مولانا اور آپ کے دو ساتھیوں نے یہاں احرام نہیں باندھا، طے یہ ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں پہونچکر احرام باندھا تھا وہیں پہونچکر احرام باندھا جائے گا۔

جدّہ سے مدینہ منورہ جدّہ پہونچکر مولانا کا قافلہ مدینہ منورہ روانہ ہوگیا، چونکہ ابھی حج میں ایک ماہ باقی تھا، اس لئے وہاں قیام رہا، جدّہ سے مدینہ منورہ روانگی بذریعہ بس ہوئی تھی، اور مختلف منزلوں پر ٹھہرتے ہوئے گئے تھے، مولانا نے لکھا ہے کہ جب رابغ پہونچا تو قلب کے احوال میں ایک انقلاب محسوس کیا، تا آنکہ بس مدینہ منورہ شہر کے حدود میں داخل ہوئی پھر کیا ہوا، مولانا کے قلم سے سنیں، لکھتے ہیں:

"ہم میں سے ہر ایک دوسرے کو شاید بھول گیا، مدینۃ النبی ص سینے کے بعد اندر جذبات کا طوفان تھا، جو اُبل رہا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بلال رض آرہے ہیں، یہ حضرت ابوذر رض جارہے ہیں، یہ فاروق اعظم رض ہیں، ادھر ابوبکر رض صدیق ہیں۔" (الفرقان شعبان ورمضان ۱۳۶۹ھ)

جذب ومستی کا عالم جوش ودیوانگی کا عالم یہ تھا کہ بقول خود مولانا مرحوم:

"جو کچھ پڑھا لکھا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، سب فراموش ہوگئے، اب تو معلّم سے جو ہدایتیں مل رہی تھیں ان پر عمل ہو رہا تھا، چوبیس گھنٹے تک مستی وجذب کا ناقابلِ ذکر عالم رہا، اپنے آپے میں تھا ہی نہیں، اس کے بعد ہوش وحواس نے کچھ انگڑائی لی اور تاریخ میں

جو کچھ پڑھا تھا ذہن میں آنے لگا۔" (ایضاً)

حواس درست ہونے کے بعد مولانا کا حال یہ ہوا، کہ جن مقامات اور احوال کے متعلق کتابوں میں پڑھا تھا، ایک ایک چیز اور ایک ایک مقام کو تلاش کرنے لگے، اور وہاں پہونچکر سنت کے مطابق زیارت کرنے کا جذبہ انگڑائی لیتا رہا تھا مثلاً قبا کی مسجد میں بار بار حاضری دی، اور بار بار دوگانہ ادا کیا، مولانا نے لکھا ہے :-

"ایک ہفتہ کے بعد دل کی کیفیت یہ ہوگئی کہ مدینہ کے سوا کچھ یاد نہ رہا ہندوستان کے اعزہ، اقربا، جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری، ہر چیز دماغ سے نکل گئی، یہ قطعی فیصلہ دل کا ہوا، زبان کا ہوا، ذائقہ کا ہوا، کہ جو پانی یہاں پینے کو مل رہا ہے، نہ پہلے کبھی کسی ملک میں ملا تھا، اور نہ آئندہ ملے گا ——— سرور و نشاط سے دل جتنا لبریز ہوا، کبھی نہیں ہوا۔" (ایضاً)

دیارِ حبیب سے شیفتگی | مولانا مرحوم کی ان تحریروں سے اندازہ لگائیں کہ محبت رسولؐ اور دیارِ حبیبؐ کی محبت کا کیا عالم تھا، وارفتگی اور دیوانگی کیسی تھی، کہ وہاں پہونچکر روضۂ مبارک دیکھ کر ساری دنیا کو بھول گئے، ساری باتیں ذہن سے نکل گئیں، محبوب اور محبوب کے دیارِ پاک کی ایک ایک چیز پر جان نچھاور کرنے کو جی چاہتا تھا واقعہ یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ لذتِ ایمان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے اپنی کتاب "سفرِ حجاز" میں مولانا گیلانی کی شیفتگی کا بڑا ہی اچھا نقشہ کھینچا ہے، اور کوئی شبہ نہیں مولانا مرحوم عشقِ نبویؐ سے سرشار تھے ہی۔

مولانا دریا آبادی لکھتے ہیں :-

"مولانا گیلانی کا سوز و گداز، علم و فضل، ذوق و جوش، ہر موقع پر

ایک نئے رنگ میں نمایاں ہوتا رہا۔ مولانا مناظر فرطِ گریہ سے بیتاب ضبط و احتیاط کے باوجود چیخ نکل جانے پر مجبور ص ۱۱۲ (ایضاً)

سلطانِ حجاز سے ملاقات | مولانا دریا آبادی چونکہ ایک اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے، اس لئے ان کو سلطانِ حجاز سے ملنے اور ان سے انٹرویو لینے کا شوق ہوا ترجمان مولانا گیلانی کو بنایا، اور دربارِ سلطانی میں حاضر ہوئے، سلام اور مصافحہ ہوا، مولانا کے ذریعہ بادشاہ سے عرض کیا بحیثیت اڈیٹر کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں، بادشاہ نے منظور کر لیا مگر فرمایا اس کے لئے دوسرا وقت موزوں ہوگا، ابھی نہیں، وقت اور تاریخ طے کرالی، مگر صحت کی خرابی کی وجہ سے دوبارہ وہاں تک حاضری نہ ہوسکی۔

دعوتیں اور کھانے | مدینہ منورہ میں ان حضرات کی بڑی عمدہ دعوتیں بھی ہوئیں، عرب اپنے عام قاعدہ کی رو سے مسلم دنبوں کے پیٹ چاک کرکے پلاؤ پکاتے ہیں، اور اس میں بھنے ہوئے کاغذی بادام اور تخمِ خیارین وغیرہ ڈالتے ہیں، دعوتوں میں اس طرح کے کھانے بھی سامنے آئے۔

ایک ماہ بلکہ زیادہ مدینہ منورہ میں قیام رہا، مسجد نبوی میں پابندی کے ساتھ باجماعت نمازیں ادا کرتے، راتوں میں زیادہ سے زیادہ وقت شب بیداری، ذکر و شغل اور دعاؤں میں گذارتے تھے، ۴ ذی الحجہ کو مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کے لئے روانگی ہوئی، تھوڑی تاخیر بھی ہوئی جس کی وجہ سے پریشان بھی ہوگئے مگر قدرت نے مدد فرمائی اور وقت سے پہلے مکہ مکرمہ تشریف لے آئے۔

مولانا مرحوم نے لکھا ہے کہ مدینہ منورہ کے قیام میں بڑی برکتیں سامنے آئیں، ایک ماہ تین دن کے کھانے کا صرفہ کل آٹھ روپے حصہ میں آیا، اس میں دونوں وقت کھانا اور عمدہ کھانا، ناشتہ اور چائے شامل تھی۔

مکہ مکرمہ آمد مدینہ منورہ سے آتے ہوئے جب قافلہ ذو الحلیفہ پہونچا، تو وہاں اُتر کر سبھوں نے غسل کیا، کپڑے بدلے، احرام باندھا، اور دوگانہ ادا کر کے اَللّٰھم لبّیک لاشریکَ لکَ لبّیک کی صدا بلند کرنے لگے، مولانا گیلانی نے بھی ایسا ہی کیا۔

مولانا عبد الماجد دریا آبادی اور مولانا عبد الباری ندوی رح نے تمتع کا احرام باندھا اور مولانا گیلانی نے قران کا، مولانا نے اس وقت کا اپنا حال لکھا ہے:۔

"لبّیک اَللّٰھمّ لبّیک کی صدا گونجنے لگی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سینے پھٹ جائیں گے، روحیں قفسِ عنصری کو توڑ کر نکل پڑیں گی۔ محسوس ہوتا تھا کہ گویا ہر احرام باندھنے والے کے ہر بُنِ مُو سے وہی نغمۂ داؤدی اُبل رہا ہے"۔ (الفرقان رمضان وشوال ۱۳۷۰ھ)

مولانا کو اس کی مسرت تھی کہ اس مقام سے احرام وتلبیہ کا انھیں شرف حاصل ہوا، جہاں سے چودہ سو سال پہلے حجۃ الوداع کے احرام وتلبیہ کا تاریخی آغاز اس وقت ہوا تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں مولانا پر ایک وجد وکیف کا عالم طاری تھا، جو دبائے نہیں دبتا تھا، اسی مستی ودیوانگی کے عالم میں احرام باندھے ہوئے مکہ مکرمہ میں داخلہ ہوا، میقات کے حدود سے نکل کر حرمِ پاک کے حدود میں تشریف لائے، سامان رکھ کر سارے حجاج حج کی تیاری میں لگ گئے۔

مولانا لکھتے ہیں کہ یہاں پہونچکر انھوں نے اپنے ہم قافلہ لوگوں سے عرض کیا کہ قافلہ میں حاضری سے ان کو آزاد کر دیا جائے، تاکہ مخلّے بالطبع ہو کر ارکانِ حج ادا کر سکیں اور دعاؤ مناجات میں ہمہ تن مشغول ہو سکیں، ساتھیوں نے مولانا کو اس کی اجازت دیدی، مولانا نے اپنے ساتھ صرف ایک چادر اور ایک ہلکا تکیہ رکھا، اور بس!

حرم شریف میں قیام اور طواف کا اہتمام خود لکھتے ہیں:۔

"سب سے الگ ہو کر بابِ ابراہیم کی سمت میں حرم شریف کے ایک گوشہ میں اپنا بستر ڈال دیا...... رات جب کافی بھیگ جاتی ڈھائی تین بجے رات تک نسبتًا طواف کرنے والوں کی تعداد گھٹ گھٹا کر اس نقطہ تک پہونچ جاتی، کہ مجھ جیسے کمزور جسم وجان والے کے لئے براہِ راست حجرِ اسود تک رسائی آسان ہو جاتی تھی، پہلی دفعہ رات کی پچھلی گھڑیوں میں جب حجرِ اسود کے چومنے کی سعادت سے سرفرازی میسر آئی تو اس وقت کچھ ایسا معلوم ہوا کہ کوندکر کوئی بجلی تھی جو کالے پتھروں سے میرے ظاہر وباطن میں جذب ہو گئی"۔ (ایضًا)

مولانا کا ہی بیان ہے:۔

"دیوارِ حرم کے نیچے کی چند دنوں کی یہ زندگی جو ساری زندگی کے اوقات میں سب سے زیادہ قیمتی تھی........ ہر چیز سے بے پروا ہو کر چند روز مجاورِ حرم بنا ہوا، چوبیس گھنٹے وہیں گذارتا تھا"۔ (ایضًا)

ارکانِ حج کی ادائیگی جب یوم الترویہ قریب آیا تو بستر اُٹھا کر مولانا قیام گاہ "رباط محروق" پہونچے، اور اونٹ پر سوار ہو کر مِنٰی روانہ ہوئے۔ رات مِنٰی میں گذاری۔ صبح کے وقت عرفات کو روانہ ہوئے، اللہ اللہ کر کے عرفات میں حاضری کا وقت آیا، یہاں پہونچکر مولانا پر پھر وارفتگی کا عالم طاری ہوا، ساتھیوں کے ساتھ رہنے، کھانے پینے... اور ملاقات کی قید سے اپنے کو آزاد کرا چکے تھے، عرفات بھی قبولیت دعا کا مقام ہے، اس لئے مولانا نے یہاں کا سارا وقت خدا تعالیٰ سے رو، رو کر اور گڑ گڑا کر دعاؤں ومناجا

میں گذارا، خوب روئے، خوب دعائیں کیں، راز و نیاز کی باتیں کیں، تنہائی کی وجہ سے اور اجنبی جگہ ہونے کی وجہ سے بہت ساری تکلیفوں سے بھی دوچار ہونا پڑا، مگر مستی و جذب کے عالم میں کوئی فرق نہیں آیا، گرمی کا موسم ہونے کی وجہ سے دھوپ کی تمازت اور لُو کی لپٹ سے مقابلہ کرنا پڑا، لیموں ساتھ رکھتے تھے، وہی جان کا محافظ بظاہر تھا، مگر جو کچھ کرنا تھا اس میں ذرہ برابر فرق آنے نہیں دیا۔

یہاں کا حال خود مولانا کی زبانِ قلم سے ہی سُنیں، لکھتے ہیں:-

"اللہ اللہ خیموں کے اندر چیخ و پکار، گریہ و بکا، نالہ و زار، توبہ و استغفار شاید زمین بھی کانپ رہی تھی، آسمان بھی تھر تھرا رہا تھا، آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے بیگانہ ہوتے جارہے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی خلوق کو دوسری مخلوق کی خبر نہیں ہے، سامنے سب کے گویا صرف ان کا ارحم الراحمین، غافر الذنب قابل التوب، الغفور الرحیم خالق کے سوا کوئی دوسرا باقی نہ رہا تھا۔" (ایضاً)

اس جگ بیتی میں مولانا مرحوم اپنی آپ بیتی بھی بیان فرما گئے، کسی کا یہ حال رہا ہوگا یا نہ رہا ہوگا، لیکن مولانا کا یقیناً یہی حال ہوگا جو مولانا کا قلم سنا رہا ہے، سب سے بے خبر ہو کر آج گناہوں کے بخشنے والے آقا کے سامنے رو رہے تھے، چیخ رہے تھے دستِ سوال پھیلائے ہوئے، اور کہہ رہے تھے الٰہ العالمین! تو گناہوں کا بخشنے والا ہے، توبہ کا قبول کرنے والا ہے، رحمت و رافت والا ہے، تیرے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے، ایک ہندی نژاد دور دراز سے چل کر مقبولیت کے اس مقام پر خوش بختی سے حاضر ہوگیا ہے، اس کے ساتھ رحم و کرم اور فضل و احسان کا معاملہ فرما، یہ بھکاری جن جن چیزوں کا سوال کرتا ہے پورا فرما دے۔ بڑی امیدیں لیکر حاضر ہوا ہے۔

میدان عرفات میں حیرانی عرفات میں جب ایک دفعہ راستہ بھول گئے تو اس وقت کا مولانا نے نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا ہے:-

"مسجد ابراہیم سے نکلنے کے بعد خدا ہی جانتا ہے، میلوں کا چکر ریگستان میں، دیتا رہا، اور ہر طرف آدمی ہی آدمی تھے ــــ لُو کی شدت الامان والحفیظ، تیز و تند گرم آتشیں جھونکے آتے، اور ایک نیم جان غریب ہندی انھیں میں جھونک دیا جاتا، کلیجہ تک معلوم ہوتا تھا کہ لُو کی حدت سرایت کر گئی، بسا اوقات زبان نکل پڑتی، چلتے چلتے کبھی کبھی یہ بھی تماشا پیش آتا، کہ لُو کی شدت سے بے جان غریب حاجی دیکھا مر گیا ہے، اس کے رفقاء ریت ہٹا ہٹا کر دفن کر رہے ہیں......... اس نظارے کو دیکھ دیکھ کر یقین ہو گیا کہ اسی وادی میں تڑپ کر اپنی جان تجھے بھی جاں آفریں کے سپرد کرنی پڑے گی۔"

(ایضاً)

حج کے سلسلے میں مولانا کو اس ابتلاء سے بھی گذرنا پڑا، اور رحم و کرم والے مولا نے بالآخر دستگیری فرمائی، اور اس آزمائش سے نکلے، جان بچی، اور ربّ العالمین کا شکر ادا کیا۔

مولانا عبدالباری ندوی ؒ نے ایک جگہ لکھا ہے:-

"عرفات کے میدان میں اپنی مستی و بے خودی کے عالم میں کھو گئے دوسرے دن رمیِ جمار کے کسی مقام پر بھُنے چنے ہی کھاتے ہوئے پائے گئے تھے، کھانے کی دکان یا ہوٹل تک جانے کے اہتمام سے یہی آسان جانا۔" (مکاتیبِ گیلانی)

مولانا عبدالماجد دریا آبادی نے لکھا ہے:-

"مولانا مناظر صاحب ہر موقع کی طرح آج بھی ہمارے قافلہ میں سب سے زیادہ نصیب ور رہے، نماز پڑھنے مسجدِ نمرہ گئے، واپسی میں خیمہ کا راستہ بھول کر کہاں کہاں بھٹک گئے اور ساتھیوں سے گم ہو کر یہاں کی تنہائیوں اور خلوتوں میں خدا معلوم کیا کیا پا لیا، ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ کی تصدیق ایک بار پھر ہو کر رہی، ہدایت شاید ایسے ہی کھوئے ہوؤں کے نصیب میں آتی ہے وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدىٰ"

(سفرِ حجاز ص۳۶۰)

عرفات سے مزدلفہ عرفات میں چونکہ ساتھیوں کا ساتھ چھوڑ دیا تھا، اس لئے کافی پریشان رہے، عرفات سے مزدلفہ پہونچنے کی جب کوئی صورت نظر نہ آئی تو پیادہ پا روانہ ہوئے پھر مشکل سے اونٹ کی سواری ملی، اللہ اللہ کر کے مزدلفہ پہونچے، یہاں پہونچکر سب سے پہلے مغرب وعشار کی نمازیں ادا کیں، رات مزدلفہ میں گذری، صبح کی نماز بھی وہیں مسجد میں ادا کی۔

حج سے فراغت اور واپسی صبح کی نماز ادا کر کے حاجیوں کے ساتھ منیٰ کے لئے پیدل ہی روانہ ہو گئے، تنہا ہونے کی وجہ سے یہاں بھی بہت ساری پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا بہت دیر کے بعد ایک حیدرآبادی نظر آئے اور ان کی مدد سے اپنے ساتھیوں میں آئے، قربانی کی، حلق کرایا، اور پھر مکہ مکرمہ طواف زیارت کے لئے حاضر ہوئے، اور طواف کر کے پھر منیٰ آئے، اور اس طرح حج کے تمام ارکان واحکام پورے ہوئے۔

حج کے بعد قیام کا ارادہ تھا، مگر اتفاق سے واپسی کا انتظام بہت جلد ہو گیا اور دوسرے تیسرے ہی دن ساتھیوں کے ساتھ وطن کے لئے جہاز پر سوار ہو گئے۔ اور خیریت کے ساتھ ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا، تفصیل کے لئے دیکھئے الفرقان لکھنؤ رمضان وشوال ۱۳۶۹ھ

شیخ احمد سنوسی سے ملاقات اس سفرِ حج میں شیخ احمد سنوسی (م ۱۹۳۳ء) سے بھی آپ نے مولانا دریا آبادی کے ساتھ ملاقات کی، شیخ طرابلس کے رہنے والے تھے اور ہزارہا لوگوں کے مرشد تھے، اور فرنگیوں سے جہاد وقتال میں مصروف تھے مولانا دریا آبادی نے لکھا ہے:-

"ملاقات کی گھڑی قریب آگئی، فرش پر تکیہ سے متصل ایک پیکرِ نور جلوہ گر تھا، رنگ سرخ وسفید، گول چہرہ، نورانی ڈاڑھی، عمر کوئی ۶۹-۷۰، کی نظر آئی ــــ میں عربی میں گفتگو پر یوں بھی قادر نہیں ہوں ــــ مولانا مناظر احسن گیلانی ہر ایسے موقع کیطرح یہاں بھی کام آئے، ہم سب کی طرف سے ترجمانی شروع کر دی کتنی دیر رہی؟ وہ اب کہاں یاد۔ بہر حال خاصی دیر تک رہی ــــــ" (معاصرین ص۲۳)

═○◯◯◯○═

اخلاق و شمائل

حضرت مولانا گیلانی ایک علمی خاندان کے چشم وچراغ تھے، عالموں کے گھرانے میں ہی پیدا ہوئے، انہی کی گودوں میں پرورش پائی، اور اسی ماحول میں نشوونما ہوئی جب ذرا ہوش سنبھالا تو از ابتدا تا جوانی مدارس دینیہ اور تعلیمی درس گاہوں میں زندگی گذاری، اور ارباب فضل وکمال اور شیفتگان کتاب وسنّت کی صحبت میں دن رات رہنا ہوا اور بعد فراغت تعلیم، معلّم اخلاق بن کر نوجوانوں کے سامنے آئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخلاق واعمال میں پاکیزگی وبلندی عقائد ومعاملات میں پختگی وصفائی، اور نشست و برخاست میں متانت وسنجیدگی مولانا کے حصہ میں پورے طور پر آئی، ذہن وفکر اور حوصلہ وولولہ کی بلندی قدرت نے پوری فیاضی سے عطا کر رکھی تھی، درشت مزاجی اور تند خوئی سے کوسوں دور تھے، بلکہ اس کی جگہ رفق وملاطفت اور ہمدردی ورواداری فطرت میں داخل تھی

مولانا کے اخلاق خود بھی ہشاش بشاش رہتے تھے اور دوسروں کو بھی ایسا ہی دیکھنا پسند کرتے تھے، مزاج میں ظرافت بھی تھی اور خوش طبعی بھی، جو موقع موقع سے ابھر کر سامنے آتی رہتی تھی۔

مولانا کو کبر وغرور اور نخوت وبڑائی کہیں سے چھو تک ـــــ نہیں گئی تھی۔ چھوٹے بڑے سبھوں سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے، اور ہر ایک سے بلا تصنع و تکلف پیش آتے تھے، اپنے ہمعصروں کا احترام بھی کرتے تھے، اور اُن سے

محبت کا اظہار بھی فرماتے تھے، بڑوں کے ساتھ تعظیم وتکریم اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت ومحبت آپ کا وظیفہ طبعی تھا، گلہ وشکوہ کی عادت قطعاً نہیں تھی، مختصر یہ کہ پاک وصاف دل تھے، مزاج خالص علمی اور دینی تھا، ملکی سیاست سے ذرہ برابر دلچسپی نہیں تھی۔

علماء کا احترام متقدمین ومتأخرین علماء اور ائمۂ اسلام کے مرتبہ شناس اور قدرداں تھے عام طور سے ان میں باہم موازنہ کی بیماری سے پاک تھے، اپنے دور کے اہلِ علم اور علماء ومشائخ کے ساتھ بھی حُسنِ ادب کا معاملہ رکھتے تھے، اپنے معاصرین کی جی بھر کر مدح وستائش کیا کرتے تھے، ان کے فضائل ومناقب کا تذکرہ زبان پر عموماً ہوتا، طبعاً ملن سار اور مرنجان مرنج تھے۔

مولانا کے ایک شاگرد نے لکھا ہے:۔

"اپنے معاصرین کی قدر کرنا، اور ان کے کمال کا اعتراف کرنا وہ وصفِ عالی ہے، جو ہر زمانہ میں نادر رہا ہے۔ مگر مولانا میں یہ نادر وصف بدرجۂ اتم موجود تھا، اس سے بڑھ کر وہ اپنے چھوٹوں کے کمالات کو بھی بڑی فراخ دلی سے تسلیم کرتے اور اعلانیہ اس کا اظہار فرماتے تھے۔" (مقالات احسانی ص۱۵)

ہونہاروں کی حوصلہ افزائی اپنے ہونہار چھوٹوں کی کھُل کر حوصلہ افزائی کرتے، کوئی علمی مشورہ کے لئے خط لکھتا تو ایسی حوصلہ افزائی کرتے، کہ وہ کبھی کبھی دھوکہ میں مبتلا ہو جاتا، ورنہ عام طور پر اس کا شعور تو بہر حال بیدار ہو ہی جاتا، اور وہ اپنے کو علمی طور پر بنانے سنوارنے میں لگ جاتا، اور بسا اوقات ـــــ وہ زندگی کے علمی میدان میں مولانا کی رہبری سے کامیابی وکامرانی کی دولت سے مالا مال بھی ہوتا تھا۔

احباب سے اخلاص دوستوں میں سے کسی کے متعلق معلوم ہوتا کہ اس کو ان کی وجہ

تکلیف پہونچی ہے، تو اس کی شکایت سے پہلے خود ہی معافی کے لئے حاضر ہو جاتے اور اس وقت تک جدا نہیں ہوتے جب تک وہ خوش نہ ہو جاتا اور معاف کر دیتا بلکہ بسا اوقات جس سے معافی کی التجا کرتے اس متواضعانہ انداز میں کرتے کہ شرم سے وہ پانی پانی ہو جاتا۔

مولانا کے تعلقات مولانا بیک وقت عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد کے مقبول ترین استاذ بھی تھے، اور واعظِ شہر بھی، متعدد کتابوں کے مؤلف و مصنف بھی تھے اور بہت سارے اخبار و رسائل کے مقالہ نگار اور مضمون نگار بھی، شعر و شاعری کا ذوق بھی رکھتے تھے اور مجلسی گفتگو کا سلیقہ بھی، جامع مسجد میں جمعہ کی امامت بھی فرماتے تھے اور روزآنہ درسِ قرآن کا مشغلہ بھی تھا، اس لئے مولانا کا ہر طبقہ کے لوگوں سے ملنا جلنا بھی تھا۔ اور ان سے راہ و رسم اور تعلقات بھی تھے،

حسنِ سلوک اور نرم خوئی طبیعت میں غلظت و شدت قطعًا نہیں تھی، ہر ایک آنے والے کی باتیں سننے اور ہر ایک کا کام کرنا اپنی وسعت بھر اپنا اخلاقی فریضہ جانتے، جبہ و دستار والے بھی مولانا کے پاس آتے، اور ایسے سوٹ بوٹ والے بھی جن کے چہروں پر داڑھی تک نہیں ہوتی، کرتے پاجامہ والے بھی خدمت میں حاضری دیتے، اور کوٹ و پتلون والے بھی، مولانا کے یہاں کسی کو حقیر جاننے کا سوال ہی نہیں تھا۔ سبھوں کے ساتھ محبت بلکہ محبت کا سلوک فرماتے تھے۔

لوگوں کی اصلاح کا جذبہ فطری تھا، مگر بڑی شرافت سے، جب تک کوئی مانوس نہیں ہو جاتا، اس وقت تک اس پر کوئی گرفت نہیں کرتے، پہلے مانوس ہونے دیتے، پھر بتدریج اس کے ذہن و فکر کی دھلائی کی سعی فرماتے، یہی وجہ ہے کہ جس کی آمد و رفت آپ کے پاس رہی، وہ آپ کا معتقد ہو کر رہا، اور اس کو آپ کے خلق و مروت کی تحسین کرنی پڑی، ساتھ ہی وہ اسلامی رنگ میں ڈوبا ہوا

نظر آیا۔

ہم عصروں نے بھی سراہا اور شاگردوں نے بھی، آپ کے اساتذہ نے بھی آپکی تعریف فرمائی، اور اہلِ شہر اور ملنے جلنے والوں نے بھی، آپ کے ساتھی اور احباب بھی ہمیشہ خوش رہے اور پڑوسی اور علمی مباحثہ کرنے والے بھی۔

معاصرین کا اعتراف مولانا عبدالباری ندوی ۳۲ - ۳۳ سال تک حیدر آباد میں حضرت مولانا گیلانی کے ساتھ رہے ہیں، اور سبکو معلوم ہے مولانا ندوی معاملات میں بڑے جز رس تھے، اور مزاج میں شدت بھی تھی، انھوں نے مولانا کی بہت ساری خوبیوں کا بر ملا اعتراف کیا ہے اور جی بھر کر مدح و ستائش کی ہے۔ مولانا ندوی رح خود اپنے متعلق لکھتے ہیں: ـــــــــ

"اور سب سے بڑی کرامت اس سلسلہ کی بالکل متضاد فطرت والے دن رات کے ساتھی راقم (عبدالباری) کے ساتھ سالہا سال تک کامیاب ہی نہیں، بڑا خوش گوارا اور دل نواز نباہ رہا"

(مکاتیب گیلانی ص۴۵)

انہوں نے اپنا ذاتی واقعہ لکھا ہے:-

"ایک مرتبہ کسی معاملے میں خود راقم نالائق کو شاید کچھ زیادہ ناخوش محسوس فرما کر تو غضب ہی کر دیا، دھڑ سے پیروں پر گر پڑے، گھبرا کر ان کے سر کو اٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور دونوں لپٹ کر خوب روئے"

(ایضًا)

دائرۂ تعلقات کی وسعت مولانا گیلانی کے عوام و خواص سے تعلقات اور اہلِ شہر کی محبت اور حسنِ سلوک کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا ندوی رح نے تحریر فرمایا ہے:-

"مولانا کا دائرۂ تعلقات صرف یونیورسٹی تک محدود نہ تھا، پورے

حیدرآباد کے عوام وخواص، علماء ومشائخ، امراء و وزراء، افسروں، ماتحتوں، بڑے چھوٹے، تاجروں، دوکانداروں، ہر طبقہ تک پھیلا ہوا تھا، اس کے باوجود شاید ایک مثال بھی کوئی بتا سکے کہ کسی طبقہ کا ایک فرد بھی مولانا (گیلانی) سے ناراض رہا، ناراض کیا سب ہی بڑی عزت ومحبت کرتے تھے۔" (ایضاً)

یہ سب مولانا کے اخلاص وللّٰہیت اور خیر خواہی کا نتیجہ تھا، مولانا کے قلب میں سبھوں کے لئے بڑی گنجائش تھی، سبھوں کا بھلا چاہتے، سبھوں کی سفارش فرماتے، اور کسی سے ٹوٹ کر بات نہیں کرتے تھے، دل دہی ودل نوازی اور اخوت ومحبت مولانا کا خاص شعار تھا۔

مولانا کا طریقۂ اصلاح | مولانا کے ملنے والے کہتے ہیں کہ مولانا اکثر فرماتے تھے کہ جب کوئی داڑھی منڈا کران کی مجلس میں بیٹھتا اور مولانا اس کے ساتھ اخلاق کا برتاؤ کرتے تو مولانا عبدالباری بہت خفا ہوتے اور کہنا چاہیے کہ چڑتے، اس لئے کہ ان کے مزاج میں سختی اور شدت تھی، اور خلاف سُنّت برداشت کرنے پر قدرت نہیں رکھتے تھے۔ مگر مولانا گیلانی فرماتے کہ میں سوچتا تھا کہ جب تک غریب ہم دین داروں سے قریب نہ ہوگا، ہمارے اعمال واخلاق کو نہ دیکھے گا، اس تک دین کا پیغام آخر پہونچانے کی کیا صورت ہوگی، اور وہ ہمارا اثر کیسے قبول کرے گا۔

پھر صرف ظاہری شکل وصورت دیکھ کر کسی کے متعلق حتمی فیصلہ کر لینا کہ یہ دین سے باغی ہے، کچھ زیادہ دانش مندی بھی نہیں، اور فرض کر لیا جائے کہ کوئی گناہ گار ہی ہو تو اس سے اوّل مرحلہ میں اگر نفرت کا برتاؤ کیا جائے گا، تو اسے گناہ کے کاموں سے روکنے کی کیا صورت ہوگی؟

ظاہری شکل وصورت پر حکم نہیں لگاتے | حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ نے بہت درست لکھا ہے کہ:-

"نئے تعلیم یافتہ کے بہت سے افراد کے مشاہدہ وتجربہ نے ان (مولانا گیلانی) کو اس نتیجہ پر پہونچایا تھا کہ صرف ظاہری شکل وصورت پر کسی شخص کے قبح باطن یا اس کے بے دین ہونے کا فیصلہ نہ کیا جائے۔"

آگے مولانا علی میاں زید مجدہٗ نے مولانا گیلانیؒ کے ایک مکتوبِ گرامی کا اقتباس نقل کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"قالب وقلب میں اختلاف کی یہ صورت جب پیش آجاتی ہے تو قلب ہی پر زیادہ نظر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، میرے خیال میں تو قالب وقلب یا ظاہر وباطن کے اختلاف کی یہ شکل اسلامی تاریخ میں نئی نہیں ہے۔ آغاز تو عہدِ صحابہ ہی میں معلوم ہوتا ہے کہ ہو چکا تھا، عمامہ پر عقاب لگا کر مدینہ میں داخل ہونے کا واقعہ کیا آج کا ...... ہے؟" (پرانے چراغ)

غلظت سے اجتناب | مولانا گیلانی اپنے اس خط کے اخیر میں رقمطراز ہیں:-

"ہمارے علماء اگر فظاظت وغلظت ہی سے اس سلسلہ میں کام لینا ضروری قرار دیں گے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نصِ محکم "لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ" کی شکل میں ان کے سامنے نہیں آئیگا۔"

(پرانے چراغ ص۔)

یہ دراصل قرآن پاک کی اس آیت کی طرف اشارہ ہے جس میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت ومحبت اور نرم خوئی کی تعریف کی گئی ہے اور تند خوئی اور درشت مزاجی کے انجام سے آگاہ کیا گیا ہے، ارشاد ربّانی ہے:-

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ؕ

ماحصل یہ تھا کہ نرم خوئی کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے، اور اسکا فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ دوسرے لوگ جو دُور ہوتے ہیں، اس کی وجہ سے وہ قریب آجاتے ہیں اور درشت مزاجی اور سختی کا الٹا اثر ہوتا ہے، آنے والے رُک جاتے ہیں اور ایسے شخص سے آنے جانے والوں کو بُعد پیدا ہو جاتا ہے۔

غیر اقوام اور مولانا | مولانا کا نظریہ تھا کہ ہندوستان کے غیر مسلم کی بڑی تعداد اس لئے اسلام سے قریب نہیں ہوئی کہ ہم نے قریب کرنے کی کوشش نہیں کی، قبل از وقت ان سے دوری اور نفرت کا فیصلہ کر لیا، اور عملاً یہی معاملہ برتا۔

فرماتے تھے کہ اگر قیامت کے دن ہم سے سوال ہوا کہ تم جس ملک اور خطہ میں رہتے تھے، وہاں کروڑوں کی آبادی خدا کے دین سے دور رہی، وہ آگ میں تمھارے سامنے جلتی بھنتی اور گرتی رہی، اور تم نے تماشا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کیا، حالانکہ تمھاری تعداد اچھی خاصی تھی، تم میں دین جاننے والے بھی تھے، اور اللہ کے دین سے محبت کرنے والے بھی، سوچنا چاہیے کہ اس دن ہماری طرف سے کیا جواب ہوگا؟ یہ سب فرما کر مولانا آب دیدہ ہو جاتے" اور کہتے افسوس ہم نے کبھی اس مسئلہ پر غور ہی نہیں کیا، واقعہ یہ ہے کہ اس دن ہم سے کوئی جواب نہیں بن پڑے گا اور پچھتانا ہوگا اور اعتراف کرنا ہوگا کہ ہم نے اپنا فریضہ ادا کرنے میں کوتاہی کی۔

مولانا کا کہنا تھا کہ چند صوفیاء اور اولیاء کے سوا ہندوستان کے دوسرے علماء نے اس مسئلہ کی اہمیت کو سمجھا ہی نہیں، غیر اقوام کے ساتھ نفرت و حقارت کا معاملہ کیا، دنیا کے تمام معاملات میں ہم نے برادرانِ وطن سے نرمی برتی، محبت و حسنِ سلوک کا معاملہ کیا، مگر دین کے بارے میں ہم پر جو فرائض عائد ہوتے تھے، ان کو پورا کرنے

میں کوتاہی کی، اور جس اخلاق و مروّت کا مظاہرہ ہونا چاہیئے، وہ ہم نہ کر سکے۔

باہم اختلاف زیادہ نہیں | مولانا گیلانی یہ بھی فرماتے کہ ان سے ہمارا کوئی لمبا چوڑا جھگڑا بھی نہیں ہے، صرف ہمارے غلط ماحول نے دوری بڑھا دی ہے، ورنہ دنیا جانتی ہے کہ تمام انبیا و رسل کو ہم مانتے ہیں، خواہ کسی بھی ملک اور قوم میں وہ آئے ہوں ساری آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں، خواہ کسی پیغمبر پر نازل ہوئی ہوں۔

ان سے کہنا اور سمجھانا یہ تھا کہ تمام نبیوں کے ساتھ ایک نبی آخر الزماں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم اور مان لو، تمام آسمانی کتابوں کے ساتھ ایک آخری آسمانی کتاب قرآن مجید پر ایمان لے آؤ، یہ خدائی کتاب کا سب سے اکمل و کامل اور آخری ایڈیشن ہے؟ بس ہمارا تمہارا اختلاف ختم ہے۔

مولانا کا ایک خط | میرے نام ایک خط میں مولانا نے کھل کر لکھا ہے، خط ذرا غور سے پڑھا جائے، لکھتے ہیں:۔

"چالیس سال سے زیادہ زمانہ گذرا جب سے یہ سوال دماغ میں گردش کر رہا ہے، کہ اس کفرستان میں قیام کی وجہ ..... وجہ کیا ہو سکتی ہے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غلاموں کی اتنی بڑی آبادی اور اس پر بھی بیس بائیس کروڑ نفوس ایسے رہ گئے، جنھوں نے اپنے پیغمبر کو نہیں پہچانا، نہ انھوں نے پہچانا، اور نہ پہچان کیلئے جو بھیجے گئے تھے، انہوں نے دھیان دیا، وہ حکومت و سیاست کے حقوق میں کچھ دن الجھے رہے، ان سے نجات ملی، تو اب پیٹ اور روٹی کا جھگڑا ہے ——— ہر روز حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کی اتنی بڑی تعداد مسلسل جہنم میں ٹپکتی اور گرتی جا رہی ہے، لیکن ہم اس تماشے کو دیکھ رہے ہیں، دو ہی صورتیں ہے

یا یہ واقعہ جہنم میں گرنے کا دھوکہ ہے، یا دھوکہ نہیں واقعہ ہے، تو پھر ؎

اگر بینی کہ نابینا وچاہ است
اگر خاموش بنشینی گناہ است

خدا کرے یہ گرہ کھل جائے، اور جس کے لئے ہم بہار آئے تھے وہ یاد آجائے۔"
(مکتوب گیلانی بنام محمد ظفیر الدین ۱۹ مئی ۱۹۵۲ء)

مولانا فرماتے تھے میری نوجوانی کی تقریر سے ایک غیر مسلم دربھنگہ میں مسلمان ہوا تھا، قیامت میں شاید وہی میری بخشائش کا بڑا ذریعہ بن جائے۔

علامہ سید سلیمان ندوی کے نام اسی مضمون کا ایک خط حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کے نام معارف اعظم گڈھ میں نظر سے گذرا، اس میں مولانا گیلانی رح نے لکھا ہے۔

"آپ سے دل کی بات عرض کرتا ہوں، دینی خدمت کا شعور دماغ میں جب سے پیدا ہوا ہے، ذہنی طور پر میرا دماغ ہمیشہ اس پہلو کو سوچتا رہا ہے کہ ہندوستان کے غیر مسلم اقوام تک اسلام کو آگے بڑھانیکی کوئی صورت نکالی جائے، میرا خیال ہے کہ موجودہ مسلمانوں کو زندہ کرنے کی کوشش لاحاصل سی کوشش ہے، ہاں یہ ممکن ہے کہ کوئی تازہ خون اسلام کی رگوں میں کسی راہ سے اگر آجائے، تو ممکن ہے کہ یہ اس کی حرارت سے ان پرانے تھکے ہوئے، اگھائے ہوئے مسلمانوں میں زندگی پیدا ہو، مگر براہِ راست ان کے جگانے اور جھنجھوڑنے کے کام کو قریب قریب مُردوں کو جگانے اور جھنجوڑنے کے ہم معنی سمجھ رہا ہوں، جب حکیم الامت (حضرت تھانوی) کی اسّی سال کی حکومت میں یہ سوتے ہوئے رہے، اور کچھ ان کی سمجھ میں نہیں آیا، کہ ان میں کون آیا، اور کون ان کو چھوڑ کر چلا گیا، تو

اب دوسروں سے متأثر ہوں گے؟ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی بہار ہی ممکن تھا کہ معیار ہو جاتا، لیکن اس کا ماحول قطعًا بدل گیا، اور اب تو اسلام سے یہ صوبہ بہت دور ہو گیا۔" (مکتوب ۱۸ فروری ۱۹۴۷ء شائع شدہ معارف اعظم گڈھ مئی ۱۹۶۳ء)

مولانا کا درد سوچئے کہ مولانا کے یہ خطوط کن جذبات کی شہادت دے رہے ہیں، اور ان خطوط میں کتنا درد اور سوز وگداز ہے، مولانا چونکہ ایک سرکاری ملازم تھے، عمل کے میدان میں اترنا ان کے لئے مشکل تھا، اس لئے دوسروں کو جہاں تک ہو سکا متوجہ کرتے رہے اور یونیورسٹی میں بیٹھ کر اپنے شاگردوں کی ذہن سازی اور تعمیر سازی میں ہمہ تن مشغول رہے، چنانچہ مولانا کے بہت سے شاگرد غیر ممالک میں اشاعتِ اسلام کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

یہ سب جانتے ہیں کہ اسلام اخلاق وصداقت سے پھیلا، اگر عام مسلمان اسلامی اخلاق سے مزین ہو جاتے تو دوسری قوموں پر خود بخود ان کے اثرات پڑتے اور وہ اپنے مذہب کے سلسلہ میں سوچنے پر مجبور ہوتے، کسی معاشرہ کی خوبیاں بھی دوسروں پر اثر انداز ہوا کرتی ہیں اور ان کے ذہن وفکر میں انقلاب برپا کرتی ہیں۔

ملنساری ومہمان نوازی حضرت گیلانی رح میں ملنساری بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی، اہلِ علم اور عوام دونوں سے بڑی محبت وشفقت سے ملتے، ان سے گفتگو کرتے اور پھر دین کا پیغام پہونچانے کی سعی کرتے۔

مہمان نوازی اور دلدہی بھی مولانا کا وصفِ خاص تھا، مولانا کی اخیر زندگی میں ان کے دولت کدہ پر خاکسار بارہا حاضر ہوا، اور علمی استفادہ کیا، میں نے برابر دیکھا کہ مولانا اجنبی سے اجنبی اہلِ علم سے کشادہ جبینی سے ملا کرتے تھے، اور مہمان نوازی کر کے خوش ہوا کرتے تھے، اور تھوڑی ہی دیر میں ایسے مل جاتے

اور بے تکلف ہو جاتے کہ معلوم ہوتا بہت پرانی جان پہچان ہے۔

بندہ کی پہلی ملاقات شعبان ۱۳۶۸ھ میں مولانا کے مکان پر ہوئی، چوں کہ یہ میری نوجوانی کا زمانہ تھا، مولانا نے سمجھا کہ کوئی طالب علم ہے، پوچھا کہاں پڑھتے ہیں، کیا پڑھتے ہیں، جب میرے ساتھی مولانا محمد یحییٰ ندوی سلمہٗ نے بتایا کہ یہ ہمارے دار العلوم معینیہ سانحہ ضلع مونگیر کے صدر مدرس ہیں، پھر مولانا نے علمی گفتگو شروع کر دی، اور جب تھوڑی دیر بعد عرض کیا گیا کہ ایک کتاب کا مسودہ ساتھ لایا ہوں میری خواہش ہے کہ اس پر آپ نظرِ ثانی فرما دیں، کہ اس میدان میں یہ میرا پہلا قدم ہے تو بڑی خوشی سے فرمایا، لائیے مسودہ دیکھوں، میں نے "نظامِ مساجد" کا مسودہ نکال کر مولانا کے ہاتھوں میں دے دیا، مولانا نے اسی آن پڑھنا شروع کر دیا، ہم لوگ سامنے بیٹھے رہے، وہ اس طرح مشغول ہوئے کہ آٹھ بجے صبح سے لے کر ساڑھے چار بجے سہ پہر تک پڑھتے رہے، درمیان میں صرف ظہر کی نماز پڑھنے کے لئے مسجد گئے اور واپس آئے، دورانِ مطالعہ فرماتے رہے کہ اس مسئلہ کو فلاں مصنف نے اس طرح لکھا ہے، اور کتابیں کھول کھول کر دکھاتے بھی رہے، مشورہ بھی دیتے رہے، جب عصر کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپسی ہوئی، تو فرمایا، الحمد للہ! آپ نے محنت کی ہے، پڑھ کر طبیعت خوش ہوئی، پسند کریں تو اپنی رائے لکھ دوں، میں نے عرض کیا، یہ تو میری دلی خواہش ہے، مولانا گیلانی نے قلم اٹھایا اور دو صفحے کا گرانقدر مقدمہ تحریر فرما دیا۔ (دیکھئے رسالہ دار العلوم دیوبند ستمبر ۱۹۵۶ء)

یہ واقعہ ہے کہ مولانا گیلانی ہر ہونہار نوجوان عالم دین سے مل کر خوش ہوتے، اس کی حوصلہ افزائی فرماتے، اور بعد میں خط و کتابت کے ذریعہ علمی رہنمائی فرماتے۔

چھوٹوں کی حوصلہ افزائی "نشانِ منزل"، قلمی جو اُن اکابر کے خطوط کا مجموعہ ہے جنھوں نے خاکسار کے خطوط کے جواب میں اپنے گرامی ناموں کے ذریعہ ہمت افزائی

علمی رہنمائی اور کرنے کے کاموں کی نشان دہی فرمائی ہے، اس میں ایک حصہ مولانا گیلانی کے خطوط کا بھی ہے، اور وہ سارے خطوط مولانا گیلانی رح کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا اپنے چھوٹوں کے لئے نعمتِ عُظمٰی کی حیثیت رکھتے تھے۔

میرا پہلا خط جب پہونچا تو مولانا نے اس کے جواب میں تحریر فرمایا:-

"ملنے کے بعد دل آپ سے مل گیا تھا اس لئے کبھی کبھی خیال آپ کا آتا رہا، بُرہان میں آپ کے مضمون کی متعدد قسطیں نظر سے گذریں، ماشاء اللہ آپ نے بڑی محنت کی ہے، ان شاء اللہ آئندہ آپ سے توقع ہے کہ زیادہ بہتر کام قدرت لے گی۔" (مکتوب ۱۸ محرم ۱۳۶۹ھ)

پتہ اس طرح لکھا:-

"اِلیٰ بحر الصالح البار الراشد السعید مولانا......"[1]

علمی رہنمائی مولانا گیلانی رح کے ہی مشورہ سے میں نے تاریخ مساجد پر کام شروع کیا، اس سلسلہ میں رہنمائی فرماتے ہوئے لکھا:-

"تاریخ المساجد کا کام آپ نے شروع کر دیا اس سے خوشی ہوئی خصوصاً مسلمان جغرافیہ نویسوں کی کتابیں یعنی ابن حوقل، خردادبہ، مقدسی، ابن رستہ وغیرہ کی کتابیں اور سیاحوں کی سیاحت ناموں میں آپ کو بہت مواد ملے گا، خطط مصر و شام میں بھی، مسجد کی خصوصیتوں سے زیادہ اس پر توجہ رکھیے کہ مسلمان اپنی مسجدوں سے کیا کیا کام لیتے تھے، خصوصاً درس و تدریس کا کام، گویا آپکی کتاب "المساجد"

---

[1] اس حوصلہ افزائی کا اس دور میں کسی فاضل سے تصور بھی کیا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت گیلانی کے ان قلمی القاب کی لاج رکھ لے اور مجھے کسی لائق بنا دے۔ ظفیر۔

کے ساتھ "المدارس" کی بھی تاریخ ہو جائے گی، بلکہ ممکن ہے القضاء کی بھی، کام بڑا دل چسپ ہے ـــــ مدارس کے ساتھ خانقاہوں یعنی تصفیہ باطنی کا کام بھی بعض مساجد سے لیا گیا ہے[1] (ایضاً)

یہ خط کافی لمبا ہے اور علمی معلومات سے لبریز ہے، ایک دوسرے خط میں رہنمائی فرمائی۔

"تاریخ المساجد" کے سلسلہ میں عرض کرنا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ اس کے پیچھے پڑ کر دوسری چیزوں کو چھوڑ بیٹھیں، مطلب یہ ہے کہ آپ کی تحریری وانشائی صلاحیتوں کو دیکھ کر میں توقع کرتا ہوں کہ جیسے جیسے مشق وتجربہ آپ کا بڑھتا جائے گا، آپ ان شاء اللہ ایک پختہ کار مصنف بن کر اسلام کی خدمت کریں گے، پس مناسب یہ ہے کہ تاریخ المساجد کے ساتھ اور بھی جن عنوانوں پر لکھنے لکھانے کا ارادہ ہو، اس کو بھی مسلسل جاری رکھئے۔"

(مکتوب گرامی ۲۴ / مارچ ۱۹۵۰ء)

ایک خط میں ان عنوانات کا تذکرہ ہے، جن پر کتابیں اب تک نہیں لکھی گئی ہیں، اور لکھنے کی ضرورت ہے، مولانا گیلانی رح کے ان خطوط کو پڑھنے کے بعد یقین کرنا پڑتا ہے کہ مولانا میں چھوٹوں کو بنانے اور اُبھارنے کی خاص صلاحیت تھی۔ اور اس میں وہ پورے طور پر کامیاب تھے، یہ تو معاملہ اس شخص سے تھا، جس سے نہ استاذی شاگردی کا تعلق تھا، اور نہ نسبی وخاندانی، صرف علم دوستی کا تقاضا تھا، اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ مولانا سے کیسے کیسے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہوگا، اور ان سب کے ساتھ مولانا نے اسی طرح کس علمی فیاضی کا سلوک کیا ہوگا۔

[1] تاریخ مساجد خاکسار نے مرتب کرلی تھی، اسمیں سیکڑوں تاریخی مساجد کے حالات آگئے تھے، مگر صد افسوس یہ مسودہ بھی ایک حادثہ کا شکار ہوگیا، جہاں دوسرے قیمتی مسودے گئے یہ بھی گیا۔ (ظفیر)

دنیا سے بے رغبتی اس فنا فی العلم شخصیت کا حال دنیا سے تقریباً بے تعلقی کا تھا، روپے پیسے سے کوئی خاص رغبت نہیں تھی، یہ شعبہ مولانا کے چھوٹے بھائی مکارم احسن سے متعلق تھا، مولانا کو کھانا، کپڑا اور پان وغیرہ کے اخراجات ملنے چاہیے، پھر جو بچے بچائے اس کے مالک مولانا کے بھائی ہی ہوتے تھے، اور جو چاہتے تھے، کرتے تھے۔

حضرت مولانا عبد الباری ندوی رح نے لکھا ہے:۔

"خدا بھلا کرے ان (مولانا گیلانی) کے چھوٹے بھائی، اور بڑے منتظم وکارگزار میاں سید مکارم احسن سلمہٗ کا، کہ وہ گیلانی شریف میں کاشت کاری یا باغبانی وغیرہ کے سلسلے میں منصوبے پر منصوبے برابر پیش ہی کرتے رہتے، اور مولانا کے معمولی مصارف سے جو کچھ بچتا اور اچھا خاصا بچتا جمع نہ رہنے دیتے، بلکہ بارہا قرض تک کی نوبت آجاتی، ان منصوبوں میں کچھ اس طرح کے جملے ہوتے ہیں کہ ہماری فلاں زمین کے پاس فلاں زمین بک رہی ہے ـــــ یا مل سکتی ہے، یا بڑے موقع کی ہے، مولانا نے غالباً ان کا ایسا ہی کوئی خط دکھایا اور سنا کر فرمایا: "اس سے تو پورا کرۂ ارض ہی ہماری زمین کے پاس آتے آتے گیلانی میں سما جائے گا"۔

(مکاتیب گیلانی ص ۴۸)

یہ نقل کرنے کے بعد مولانا ندوی رح لکھتے ہیں:۔

"پھر بھی ساری دنیا کو خوش رکھنے والے مولانا خود اپنے بھائی کو کیسے ناخوش فرماتے"۔ (ایضاً)

دوسروں کی مالی مدد مولانا گیلانی کی ایک عمدہ عادت یہ تھی کہ ضرورت مند جب کچھ مانگتا تو حتی الوسع اسے مایوس نہیں کرتے، جو کچھ ہوتا ضرور دیتے، لیکن دینے کے بعد جو

واپس نہیں کرتا اس سے مُنہ کھول کر طلب بھی نہیں کرتے، کہ تم نے اتنی رقم قرض لی تھی اب تک واپس نہیں کی۔

حد یہ ہے کہ جب خود اپنے پاس رقم نہیں ہوتی، اور ضرورت مند کہتا کہ فلاں سے لے کر دے دیجیے، تو مولانا ایسا بھی کرتے، کہ خود قرض لے کر دوسروں کو قرض کے نام پر دیتے، اور لینے والے سے طلب کرتے ہوئے شرم محسوس کرتے، اگر خود کوئی دے گیا تب تو بہتر، ورنہ خود برداشت کرتے۔

مولانا عبدالباری ندوی نے لکھا ہے:-

میرے علم میں ہے کہ مولانا نے کسی کو ہزار پانچسو کی رقم اپنی ضمانت پر کسی سے دلا دی، مگر لینے والے نے ادا نہیں کیا، بالآخر مولانا کو اپنی جیبِ خاص سے ادا کرنا پڑا"۔ (مکاتیب ص۴۹)

باوقار سادہ زندگی | حیدرآباد کے قیام کے دوران مولانا گیلانی نے احباب کے مشورہ سے مجبور ہو کر ایک دفعہ کار (موٹر) خرید لی تھی، کچھ دنوں اس سے کام لیتے رہے مگر اس زحمت کو نباہ نہیں سکے اور کار فروخت کر دی، اور وہی مولویانہ طریقہ رکھا جو پہلے تھا۔

مولانا ندوی رح نے لکھا ہے:-

"یاد رہے کہ دینی جاہ و جلال اور مال میں ان کا سر اللہ تعالیٰ نے اونچے اونچے ہمسروں سے نیچا نہیں رکھا تھا۔ لیکن نمونہ دنیا کی زندگی میں اَللّٰھُمَّ اَحْیِنَا مِسْکِیْنًا وَاَمِتْنَا مُسْلِمًا کا ہی بنے رہے طالب علمی سے جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ دینیات کی صدارت تک اس مسکنت میں ذرہ برابر فرق کسی دیکھنے والے نے نہ دیکھا ہو گا۔ بنگلہ میں رہ کر اور موٹر میں چل کر بھی وہ دیوبند کے حجرہ میں رہنے والے اور اس کی گلیوں میں چلنے والے مسکین طالبعلم ہی معلوم ہوتے رہے"۔ (مکاتیب گیلانی ص۱۵)

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ خستہ حال لوگوں کی طرح رہن سہن تھا، بلکہ مختار یہ ہے کہ دل میں کبر و نخوت کا کبھی شائبہ تک نہیں آیا، ورنہ لباس، وضع قطع اور رہن سہن کے اعتبار سے ایک بارعب وجیہ و شکیل پروفیسر اور علم و عمل کے لحاظ سے ایک عالمِ ربانی نظر آتے تھے۔

مکارمِ اخلاق | مولانا کے ایک شاگرد رشید نے لکھا ہے:-

"مولانا کے فضائل اخلاق میں بے نفسی کو سب سے نمایاں مقام حاصل تھا دوسرے کی غلطی پر خود معافی خواہ ہو جانا کوئی کھینچنا چاہے تو خود بڑھ کر اس سے قریب ہو جانا، اپنے تسامح کے علم ہو جانے پر علی الاعلان سراپا معذرت بن جانا، اپنے دامن کو ہمیشہ طبقاتی ادارتی تعصب سے پاک و صاف رکھنا، اور راہِ حق میں تحسین و ملامت کی قطعًا پرواہ نہ کرنا مولانا کا شعار تھا"۔ (مقالات احسانی)

مجموعی طور پر مولانا کے مکارمِ اخلاق بہت بلند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے طبیعت بہت ہی مرنجان مرنج عطا کر رکھی تھی، نام و نمود، شہرت، دنیا طلبی اور دوسرے دنیاوی رذائل سے پاک و صاف تھے، نرم خوئی، ملنساری، دوسرے کے درد اور دکھ میں غم گُساری مولانا کے خاص اوصاف تھے۔

جب تک دوسرے آگے نہیں کرتے، اس وقت تک خود آگے نہیں ہوتے تھے۔ دوسرے معاصرین کی مدح و ستائش جی بھر کر کرتے تھے۔ ہر اہلِ علم کے قدرداں تھے، غلو اور اظہارِ برتری مزاج میں قطعًا نہیں تھا، اپنے پرایوں کا دھیان بہت تھا اہلِ خاندان اور رشتہ داروں کا بڑا لحاظ و پاس تھا، اور سبھوں کو اچھے حال میں دیکھنا پسند کرتے تھے۔

ظرافت و بذلہ سنجی | مولانا گیلانی رح میں تمام علمی کمالات کے ساتھ طبیعت میں ظرافت اور

بذلہ سنجی بھی تھی، ایسے موقع پر چوکتے نہیں تھے، حیدرآباد اور وطن دونوں جگہ ایک نہ ایک شخص ایسا رہتا تھا جس سے مولانا خوش طبعی کی باتیں کرتے تھے، اور ان کی مالی خدمت بھی کرتے تھے اور آرام وراحت بھی پہونچاتے تھے، وطن میں ایک بڑے میاں تھے جو مسجد میں اذان کی خدمت انجام دیتے تھے، اور بقیہ وقتوں میں مولانا کی خدمت میں حاضر رہتے، تقریباً یہی حال حیدرآباد میں مسجد کے امام کا تھا مولانا عبدالباری ندوی رح نے لکھا ہے:-

مولانا کی زندگی کا ایک اور گوشہ خوش طبعی اور مزاح پسندی کا تھا جو کبھی کبھی مزاح کے حدود سے بہت آگے بڑھ جاتی، بلکہ اگر کوئی اس ڈھب کا بُزِ اخفش ہاتھ لگ جاتا تو اس کو کھلا پلا کر مستقلاً تفریح طبع کا مشق بنائے رکھتے، حیدرآباد کے اخیر زمانہ میں "بُزِ اخفش" کا یہ منصب سالہا سال تک خود اپنی مسجد الحی کے امام کو عطا رہا۔"

(مکاتیب گیلانی)

پھر مولانا ندوی رح نے تفریحی مبارک بادی کا ایک گوشہ بھی نقل کیا ہے، جو مولانا نے اپنے ایک دوست کی نئی شادی پر نظم لکھ کر بھیجی تھی اس کے کچھ اشعار وہاں بھی نقل کئے گئے ہیں۔

اپنا خیال ہے کہ دماغی کام کرنے والے کے لئے ایک گھنٹہ تفریح کا بہت ضروری ہے بھی، تاکہ ذہنی تکان دور ہو، اور آدمی پھر لکھنے پڑھنے کے لئے تازہ دم ہو جائے۔ مولانا اسی تکان کے دفع کرنے کے لئے ایک گھنٹہ دماغی تفریح کا رکھتے تھے۔

غیر علمی کاموں سے بُعد | لکھنے، پڑھنے، تحریر وتقریر، اور درس وتدریس کے علاوہ دوسرے غیر علمی کاموں میں مولانا بہت پیچھے تھے کھانے پینے میں جیسا کہ عرض ہوا دوسروں کے

رحم وکرم پر رہتے تھے، چنا کھا لینا برداشت تھا، بازار جانا اور ہوٹل میں گھسنا ان کے بس سے باہر کی بات تھی، سفر بھی کبھی تنہا نہیں کرتے تھے۔

مولانا ندوی رح نے لکھا ہے:-

" باقی مولانا (گیلانی) کا حال تو یہ تھا کہ اگر کھانے پینے کا بھی پورا بندوبست باورچی سے لے کر دسترخوان تک کوئی دوسرا نہ کر کرا دیتا تو فاقہ ہی فرماتے، یا مضطر ہوتے، تو بازار کے چنوں ونوں تک قناعت فرما لیتے، سفر حج میں یہی سامنے آیا،...... کھانے کی کسی دوکان یا ہوٹل تک جانے کے اہتمام سے یہی آسان جانتے تھے۔ سفر تنہا بمشکل اور شاید ہی کبھی فرماتے، سامان تو سامان خود اپنے وجود کی دیکھ بھال دشوار تھی۔" (مکاتیب ص۵۶)

سادگی کا ایک واقعہ | صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے مولانا گیلانی کا ایک واقعہ اپنے مضمون میں درج کیا ہے، لکھتے ہیں:-

" مولانا دارالمصنفین اعظمگڈھ کی مجلس انتظامیہ کے رکن تو عرصہ سے تھے پنشن پانے کے بعد مجلس عاملہ کے بھی رکن بنائے گئے مارچ سنہ ۱۹۵۰ء میں دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا ایک اہم جلسہ تھا، اس میں شرکت کے لئے وہ گیلانی سے اعظم گڈھ تشریف لائے، میری مسرت کی انتہا نہ رہی، جب انھوں نے میری قیامگاہ میں قیام فرمایا، اس جلسہ میں مولانا کے علاوہ ڈاکٹر سید محمود، مولانا دریاآبادی اور مولانا عمران خان بھی تشریف لائے تھے، جب ہم لوگ ان حضرات کی پیشوائی کے لئے اسٹیشن گئے تو مولانا کی سادگی دیکھ کر دنگ رہ گئے، ان کے ساتھ صرف ایک دری، ایک

چادر، ایک تکیہ، الونیم کا ایک لوٹا اور ایک کپڑے میں لپٹے ہوئے ایک دو جوڑے تھے۔ (معارف اپریل ۱۹۵۶ء)

جب مولانا گیلانی کو دار المصنفین کی رکنیت کی اطلاع پہونچی تو آپ نے سید صاحب کو لکھا:۔

"یہ دار المصنفین کی رکنیت کا کیا قصہ ہے، سمجھ میں نہیں آیا کہ کس خصوصیت کو میرے اس انتخاب میں دخل ہے، نظرِ عنایت نگاہِ کرم کے سوا اور کس چیز کا تصور کروں"۔

(مکتوب ۳ مارچ ۱۹۴۲ء شائع شدہ معارف مارچ)

محبت وشفقت مولانا جس طرح افراد واشخاص کے لئے اپنے دل میں بے پناہ محبت رکھتے تھے اور بوقت ضرورت نوازتے تھے۔ کچھ یہی حال امتِ مسلمہ کے ساتھ بھی تھا، مولانا کے شاگرد غلام محمد صاحب نے لکھا ہے اور بجا لکھا ہے:

مولانا کے قلبِ اطہر میں اُمتِ محمدیہ کی محبت اور اس پر شفقت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، وہ مسلمانوں کے فلاح سے ایسے مسرور ہوتے تھے کہ جیسے خود ان کو کوئی ذاتی فائدہ پہونچ گیا ہو، وہ مشرباً پکے حنفی تھے، مگر یہ ان کے جذبۂ شفقت کا اثر تھا کہ وہ زبانی بھی اور تحریراً بھی اس بات پر بہت زور دیتے تھے کہ موجودہ حالات میں علماء کرام کو عام مسلمانوں کے لئے سہولت کا ہی پہلو اختیار کرنا چاہیے، خواہ اس میں مسلکِ حنفیہ کو چھوڑ کر کسی اور مسلک کی اقتدا کیوں نہ کرنی پڑے، کیونکہ فقہاء کے اجتہاد کو بہر حال منصوصات کا درجہ حاصل نہیں ہے"۔

(مقدمہ مقالاتِ احسانی)

مولانا کی نظر مولانا نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:۔

"مسلمانوں کے لئے وہ اُندلس زیادہ پائیدار ہوتا، جس میں خواہ الزہرۃ اور قرطبہ وغرناطہ نہ ہوتے، مگر مسلمانوں پر وفرض آخرالامم ہونے کی حیثیت سے عطا کیا گیا ہے اگر اس کو وہاں کا حکمراں طبقہ پیش نظر رکھتا تو وہ سیاسی مصائب و آفات کے جن گردابوں میں تہ وبالا ہو کر رہ گئے، شاید یہ صورت پیش نہ آتی"۔

(معارف اپریل ۱۹۵۶ء)

مسلمانوں کے حالات سے مولانا کو خاص دلچسپی تھی، تقسیم ہند کے بعد جب یہاں مظالم کا وہ آتش نشاں پھٹ پڑا تھا، ____ اور لوگوں پر مایوسی طاری تھی، صباح الدین صاحبؒ نے لکھا ہے کہ جب ان کا ذکر آیا تو مولانا نے بڑے اذعان ویقین کے ساتھ فرمایا:۔

"میں ہندوستان کے مسلمانوں کا مستقبل روشن پاتا ہوں،..... پاکستان کے مسلمان اپنے نئے ماحول میں کیا ہو جائیں گے اللہ ہی بہتر جانتا ہے، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں پر نئے ماحول کا جو ردِ عمل ہوگا وہ نظر میں امید افزا ہے، ان میں مذہبی احساسات اور ملّی جذبات کی بنا پر غیر شعوری طور سے پوری قوتِ مدافعت موجود ہے، جو ہر زمانہ میں برقرار رہے گی، مسلمانوں نے اپنی انفرادیت باقی رکھی ان کی مذہبی غیرت وحمیت میں بڑا استحکام ہے، جو کمزور تو ہو سکتا ہے ختم نہیں ہو سکتا"۔ (ایضاً)

خودداری حیدر آباد میں مولانا عرصہ تک ملازم رہے وہاں کے واعظ شہر بھی تھے، حضور نظام آپ کی تقریر بہت شوق سے چھپ کر سنتے تھے، مولانا کے علم میں یہ

بات تھی، مگر خصوصی ملاقات کی کبھی سعی نہیں کی، خود اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:۔

"حضور نظام سے ملازمت کی تیس ۳۰ سالہ مدت میں خصوصی ملاقات کا موقع کبھی نہیں پیدا کیا گیا، البتہ سالگرہ وغیرہ بعض خاص جشن کے دنوں میں دوسرے نوکروں کے ساتھ پیش کشی نذر کے لئے حاضری ہو جاتی تھی۔" (الفرقان شعبان و رمضان ۱۳۶۹ھ)

یہ بھی مولانا کی خودداری اور عزتِ نفس کی پاسداری، اللہ تعالیٰ نے اس جذبہ کو پوری زندگی نباہ دیا، عالمانہ وقار میں کبھی فرق نہیں آنے پایا۔

اساتذہ کی اطاعت مولانا گیلانی اپنے اساتذہ کا بڑا احترام فرماتے تھے، اور سخت سے سخت وقت پر بھی ان کے حکم سے سرتابی کی جرأت نہیں کرتے، اور نہ بہانے تلاش کرتے تھے بلکہ فوراً تعمیلِ حکم کے لئے حاضر ہو جاتے۔

۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا، اور اس کے صدقہ میں ایک نئی مسلم مملکت وجود میں آئی، جو پاکستان کے نام سے موسوم ہوئی، شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے چاہا کہ یہاں اسلامی دستور نافذ ہو،

اس اسلامی دستور کے مرتب کرنے کے لئے بہت سے علماء کو مولانا عثمانی نے کراچی میں جمع کرنے کی سعی فرمائی، ان میں حضرت مولانا گیلانی رح کا بھی نام تھا، اس وقت حالات سازگار نہ تھے، مگر استاذ محترم کے حکم کے خلاف کسی بہانہ کی جرأت نہیں فرمائی بلکہ فوراً تشریف لے گئے۔

دستور اسلامی کی ترتیب میں شرکت مولانا نے خود اپنے ایک خط میں جو علامہ سید سلیمان ندوی رح کے نام ہے ——— لکھتے ہیں:۔

"آپ کے ارادہ عدم شرکت سے مطلع ہونے کے بعد خاکسار نے بھی قطعی فیصلہ کراچی نہ جانے کا کر لیا تھا، لیکن مولانا عثمانی کی

طرف سے تار اور خطوط کے تسلسل نے فسخ عزم کو اب خیال کیا ان سے تلمذ کی نسبت رکھتے ہوئے دل نے آگے بڑھنے کی اجازت نہ دی، ڈاکٹر حمید اللہ کو ساتھ لیکر حیدر آباد سے اُڑے پانچ ساڑھے پانچ گھنٹے میں کراچی کے مطار پر اُتار دیا گیا، سوا دن قیام رہا، باہر سے ان دو دکنی فقیروں کے سوا صرف مفتی شفیع صاحب تشریف لا سکے، ——— بحث و مباحثہ کے بعد آخری شکل میں اس کو قلم بند کر کے مجلس کے حوالہ کر کے ہم لوگ چلے آئے۔"

(مکتوب بنام سید سلیمان ندوی ۲۳ رجون ۱۹۴۸ء معارف ماہ جون ۶۳ء)

اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ پاکستان کے دستورِ اسلامی میں مولانا گیلانی کا خاصہ حصہ ہے، اور دوسری بات یہ بھی معلوم ہوئی کہ مولانا عثمانی رح کو مولانا گیلانی کے علم و فضل پر اس باب میں بڑا اعتماد تھا، اور اس میں تو شبہ نہیں کہ مولانا میں مختلف صلاحیتیں تھیں، اور قرآن و حدیث اور فقہ پر کافی وسیع نظر رکھتے تھے، اور ذہانت و ذکاوت کی دولت سے مالا مال تھے۔

بیماری اور وفات

عرض کیا جاچکا ہے کہ ریٹائر ہونے کے بعد مولانا گیلانی حیدرآباد سے اپنے وطن گیلانی ضلع پٹنہ تشریف لے آئے اور مستقل طور پر یہیں قیام پذیر ہوگئے یہاں اپنی بیٹھک میں لکھنے پڑھنے کا سامان فراہم کرلیا، بقدر ضرورت کتابیں یہاں الماریوں میں رکھوالیں، صبح سے عشار کی نماز تک بیٹھک ہی میں قیام رہتا، دن کا ناشتہ اور رات کا کھانا یہیں تناول فرماتے، عشار کی نماز باجماعت مسجد میں ادا کر کے اندر گھر میں تشریف لیجاتے، ورنہ اکثر تنہا لکھنے پڑھنے میں منہمک رہتے۔

اس قیام میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہٗ کے اصرار پر سوانح قاسمی کی تالیف کی ذمہ داری قبول فرمالی تھی، دوسرے علمی کاموں کے ساتھ جب طبیعت میں نشاط ہوتا، سوانح قاسمی کے لکھنے میں مشغول ہوجاتے۔

فرماتے تھے کہ درس سے فراغت کے بعد میری عملی زندگی رسالہ القاسم دیوبند سے شروع ہوئی تھی، خاتمہ "سوانح قاسمی" کی خدمت پر ہوگا۔

سوانح قاسمی کی تالیف | خاکسار کے نام اپنے ایک گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی فرمائش اور اصرار سے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی سیرتِ طیبہ کی تدوین میں آج کل مشغول ہوں، طبیعت جب اچھی رہتی ہے، تھوڑا تھوڑا کر کے لکھ لیتا ہوں، کئی دن ہوئے مولانا موصوف

تشریف لائے تھے، عزت افزائی فرمائی۔"

(۲۸ دسمبر ۱۹۴۹ء بنام محمد ظفیر الدین)

مولانا کی صحت بہت پہلے سے کمزور چل رہی تھی، اور پھر پیری نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی، لیکن ہمت ہارنا نہیں جانتے تھے۔ آپ کو علمی زندگی محبوب تھی دل اُسی سے بہلتا تھا، خود لکھتے ہیں:۔

"فقیر اپنا حال کیا لکھے "صورت بہ بیں حالت مپرس" پیرانہ سری خود ایک مستقل مرض ہے، تاہم تھوڑا بہت کام جو ہو سکتا ہے، کرتا رہتا ہوں، سیدنا الامام الکبیر مولانا، النانوتوی قدس سرہٗ کی تدوینِ حیات آج کل فقیر کا اہم مشغلہ ہے۔"

(۲۴ مارچ ۱۹۵۰ء بنام ظفیر الدین)

مختلف رسائل کیلئے مضامین بھی برابر لکھتے رہتے تھے، تدوینِ حدیث کا سلسلہ بھی جاری تھا، اور مجالس الشیخین کا بھی، مگر انہماک "سوانحِ قاسمی" کے ساتھ تھا۔ اور اسے اپنے لئے ایک بڑی سعادت یقین فرماتے تھے، ایک مکتوبِ گرامی میں لکھا ہے:۔

"دعا فرمائیے کہ یہ آخری کام (سوانحِ قاسمی) کا اس بندۂ ضعیف جہول وظلوم سے بن آئے، اور اسی کو لے کر مغفرت کی سند کے ساتھ اصل وطن کے طرف واپسی بخیر و عافیت میسر آئے، زیادہ خیال اب اپنے اسی مرجع کا ہے، جہاں سے کچھ دنوں پہلے اس خاک دانِ ارض پر ٹپکایا گیا تھا۔"

(مکتوبِ گرامی بنام ظفیر ۱۱ ستمبر ۱۹۵۱ء)

دمہ کا حملہ | اپنی صحت کے متعلق تحریر فرمایا۔

"یکے بعد دیگرے صحت پر مختلف قسم کے حملے ہوتے رہے، کبھی سینے کا درد کبھی معدے کی خرابی، تا آنکہ اب اِدھر پندرہ بیس دنوں سے تنفس کا بھی قدیم مرض جس کے متعلق خیال تھا کہ ختم ہو چکا، اچانک حملہ ہو گیا۔"

(۲۹ر دسمبر ۱۹۵۲ء بنام ظفیر الدین)

بڑھاپے کی کمزوری کیا کم تھی کہ اس پر تنفس کے مرض نے اپنے حملہ سے آپ کی رہی سہی قوت کھو دی، اور نشاط و انبساط جاتا رہا اور پوری سردی کے لئے صاحبِ فراش بنا دیا، اپنے دوسرے مکتوبِ گرامی میں تفصیل لکھی۔

"موسم سرما کی شدت نے میرے قدیم مرض تنفس اور دمہ کو پندرہ سولہ سال بعد زندہ کر دیا، ایک ماہ علاج و معالجہ، انجکشن وغیرہ کے بعد کچھ افاقہ کی صورت ہوئی، لیکن یہ افاقہ بھی دیرپا ثابت نہ ہوا، پندرہ سولہ روز کے بعد پھر حملہ ہوا، اور شدید حملہ ہوا، حملہ کے دنوں میں ایک قدم چلنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے، دو ڈھائی مہینے سے مسجد کی حاضری سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔" (۲۸ر مارچ ۱۹۵۲ء بنام محمد ظفیر الدین)

وجع الفواد اس مرض نے نڈھال کر دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی دنوں بعد دل کا دورہ پڑ گیا، کافی علاج کے بعد کچھ سنبھلے، اس کا تذکرہ بھی آپ نے اپنے ایک خط میں کیا ہے، لکھتے ہیں:۔

"رمضان المبارک سے پہلے درد سینہ کہیے یا وجع الفواد کا ایک شدید حملہ پھر ہو گیا تھا، لیکن "الموجّلۃ للموت" وقت سے پہلے آنے سے رہی۔" (۱۳ر جون ۱۹۵۳ء بنام محمد ظفیر الدین)

اس طرح مولانا اخیر کے دو تین سالوں میں برابر بیمار ہی رہے، مگر خطوط کے جواب لکھدیا کرتے تھے، ممانعت کے باوجود جی بہلانے کے لئے نئی کتابیں بھی پڑھ

لیتے تھے، اور اپنی رائے بھی لکھدیا کرتے تھے، اصلاح و تصحیح کی خدمت سے بھی حتی الوسع گریز نہیں فرماتے تھے۔

مشاغل ان حالات میں اگر کوئی اہل علم پہونچ جاتا، تو پھر باغ و بہار بن جاتے، اور علمی گفتگو چھیڑ دیا کرتے تھے، مولانا زندہ دل مولوی تھے خشک نہیں تھے تلاوتِ قرآن اور اذکار و اشغال کے پابند تھے، علمی رسائل کے ذمہ دار عام طور پر اصرار کرتے کہ کوئی مضمون بھیجدیا جائے تو انکی یہ فرمائش بھی پوری کرتے۔

البتہ جب مرض بالکل صاحبِ فراش کر دیتا اور ڈاکٹروں کی طرف سے پہرا بٹھا دیا جاتا تو یقیناً مجبور ہو جاتے اور بدرجۂ مجبوری لکھنا پڑھنا بند فرما دیتے تھے۔

اسی زمانہ میں "سوانحِ قاسمی" کی تین جلد آپ نے کئی سو صفحات میں لکھیں۔ تدوینِ حدیث کی تکمیل کی، اور پھر اسے مرتب کر کے طباعت کے لئے دیا "مقالاتِ احسانی" کے کئی مقالات اسی دورِ بیماری میں مختلف رسالوں میں لکھ کر شائع کرایا، جسے بعد میں آپ کے شاگرد غلام محمد صاحب نے مرتب کر کے پاکستان سے شائع کیا۔

اس بیماری میں مختلف اہل علم کے خطوط کے جواب میں سیکڑوں خطوط لکھے اور اپنے خطوط سے ان کی علمی، دینی، رہنمائی کا فریضہ ادا کیا، خطوط عام طور پر مفصل اور لمبے لکھا کرتے تھے، اور بہت ہی معلومات افزا، جو دوسروں کے لئے نشانِ راہ کا کام کر دیا کرتے تھے۔

بغرض علاج پٹنہ نومبر ۵۳ء میں حضرت گیلانیؒ پر دل کا حملہ ہوا، اور پھر اس نے مستقل مرض کی شکل اختیار کر لی مارچ ۱۹۵۶ء میں دل کا دوبارہ سخت دورہ پڑا، جس سے جینے کی امید جاتی رہی، لیکن گھر والوں نے پوری جاں فشانی سے علاج کیا کرایا، گیلانی سے اٹھا کر پٹنہ ہسپتال میں لے گئے اور علاج میں بڑی جدوجہد کی گئی، پٹنہ میں مولانا کے

معالج دل کے مشہور ڈاکٹر، ڈاکٹر احمد عبدالحی صاحب مرحوم تھے۔

جب ذرا اطمینان ہوا تو پٹنہ سے پھر گیلانی تشریف لے آئے، لکھنے پڑھنے پر ڈاکٹروں کے مشورہ سے پابندی عائد ہو چکی تھی، اس کی قطعاً ممانعت تھی، کمرہ میں حسرت کے ساتھ کتابوں پر نظر ڈالتے، جو سامنے الماریوں میں لگی ہوئی تھیں البتہ خطوط کبھی کبھی لکھ لیا کرتے تھے، اس زمانہ میں صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مدیر معارف دارالمصنفین اعظم گڑھ کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"آپ کا یہ مریض المسمّٰی بہ مناظر احسن گیلانی نہ اب تک مرا ہے اور نہ اچھے ہونے کی بشارت سنا سکتا ہے، اسی حال میں مگن ہے جس حال میں رکھا گیا ہے۔" (مکتوب مئی ۱۹۵۶ء)

موت کی تیاری محترم صباح الدین عبدالرحمان صاحب نے لکھا ہے کہ جب وہ مئی ۱۹۵۶ء میں مولانا گیلانی کی خدمت میں گیلانی حاضر ہوئے تو دیکھا کہ مولانا کافی نحیف و کمزور ہو چکے ہیں۔ دونوں پاؤں پر سوجن کے آثار ہیں، پہلی ہی ملاقات میں مولانا نے فرمایا خوب آ گئے، "اب چل چلاؤ ہے"، یہ بھی فرمایا، "گیلانی بہت عزیز ہے، اس لئے یہیں پڑا ہوا ہوں۔"

صباح الدین صاحب لکھتے ہیں جب میں رخصت ہونے لگا تو میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر فرمایا کہ اب یہ پڑھتا رہتا ہوں ؎

دل نہیں لگتا تو کیوں گھبراؤ شاد ٭ جی چکے بس تا بکے مرجاؤ شاد
مُنہ نہ پھیرو اس نگاہِ مست سے ٭ برچھیاں سینے پہ تن کر کھاؤ شاد
میں نے مانا بخشوا لوگے گناہ ٭ اور نہ جو اس کی بھی مہلت پاؤ شاد
خطِ شوق اپنا لفافہ میں رکھو ٭ آرزوؤں کو کفن پہناؤ شاد
دے چکی اک عمر تک دنیا فریب ٭ اب نہ اس کے دھوکے کے اندر آؤ شاد

یہ اشعار مولانا نے بڑی مسرت اور شادمانی کے انداز میں سنایا۔

اتفاق سے ایسا ہوا کہ خاکسار (ظفیر) سانحہ سے (جہاں ان دنوں دارالعلوم معینیہ ضلع مونگیر میں صدر مدرس تھا) حضرت مولانا گیلانی کا حال سن کر مونگیر آیا اور پھر ۵ جون ۱۹۵۶ء کو بعجلت وہاں سے ٹرین پکڑ کر شیخپورہ پہونچا، اور وہاں سے بس کے ذریعہ بربیگھہ کوئی بارہ بجے دن میں آ گیا۔ مگر ایک صاحب جان پہچان کے مل گئے، کہنے لگے، بڑی تیز دھوپ ہے، یہیں آرام کرو، عصر کے وقت ٹہلتے ہوئے گیلانی چلے جانا، تھکا ہوا تھا ہی، کھانا کھا کر لیٹ گیا، عصر کی نماز کے لئے جب مسجد میں داخل ہونے لگا تو ایک نمازی نے سنایا کہ آج صبح مولانا گیلانی کی وفات ہو گئی، یہ سننا تھا کہ آبدیدہ ہو گیا، اور نماز پڑھ کر گیلانی بھاگا، دیکھا لوگ قبرستان سے .... واپس ہو رہے ہیں، اپنی محرومی پر بہت پچھتایا، اگر دوپہر میں وہاں نہیں ٹھیرا ہوتا تو کم از کم زیارت تو ہو ہی جاتی، اور جنازے میں بھی شریک رہتا، مگر قسمت میں یہ نعمت لکھی نہیں تھی۔

سب سے پہلے قبر پر حاضر ہو کر سلام بجا لایا، دیدۂ نم کے ساتھ فاتحہ پڑھی، دیر تک غمزدہ وہاں کھڑا رہا، پرانی یادیں اور مولانا کی باتیں ذہن میں گونجنے لگیں وہاں سے مولانا کی بیٹھک میں آیا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ساری فضا سوگوار ہے، گاؤں میں سناٹا چھایا ہوا ہے، مولانا جس حمائل شریف میں تلاوت کرتے تھے، صبح اٹھا کر دیکھا تو اس میں بہت ساری نصیحتیں مولانا نے لکھ رکھی تھیں، جستہ جستہ اپنے حالات بھی لکھ رکھے تھے، اسے نقل کیا، جو کسی صاحب نے پڑھنے کیلئے لیا تو پھر واپس نہیں کیا۔

پھر مولانا کے گھر والوں نے وہ ساری کیفیت سنائی جو گذشتہ رات مولانا پر گزری تھی، جس کی تھوڑی تفصیل صباح الدین صاحب نے اپنے مضمون میں دی ہے۔ اور کچھ صدق جدید لکھنؤ میں شائع ہوئی ہے۔

صباح الدین صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ مولانا کے منجھلے بھائی مکارم میاں رو رو کر بیان کرنے لگے:۔

"بھائی صاحب مرحوم ادھر کئی دن سے بہت اچھے تھے، گذشتہ رات اور بھی زیادہ خوش تھے، رات کے گیارہ بجے تک قوالی کی دُھن میں کچھ غزلیں پڑھوا کر سُنتے اور ہر شخص سے لطف و محبت کی باتیں کرتے رہے، بارہ بجے ان کو آرام کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا، انکو دیر تک نیند نہیں آئی، مگر پھر سو گئے، صبح سویرے اٹھے وضو کیا کھڑے ہوکر فجر کی نماز ادا کی، وظیفہ پڑھا، پھر پلنگ پر آکر لیٹ گئے، ملازم سے کہا رات نیند کم آئی تھی اس لئے چادر اُڑھا دو، سوؤنگا، سوئے تو ابدی نیند سو گئے، اور جب ہم لوگوں نے سانس رُکتے ہوئے دیکھا تو ان کا چہرہ جوانوں کی طرح شگفتہ اور شاداب تھا۔"

(معارف اپریل ۵۷ء)

۵ر جون ۱۹۵۶ء مطابق ۲۵ر شوال ۱۳۷۵ھ بوقت سات بجے صبح داعیِ اجل کو لبیک کہا اور رفیقِ اعلیٰ سے جا ملے، بعد نمازِ ظہر نمازِ جنازہ ادا کی گئی جس میں آس پاس کے تمام مسلمانوں نے شرکت کی، نمازِ جنازہ اس علاقہ کے مُمتاز عالم دین حضرت مولانا سید فصیح احمد استھانوی رح نے پڑھائی، اور اپنے آبائی قبرستان میں سپردِ خاک کر دیئے گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

صباح الدین صاحب نے اپنے مضمون میں مولانا کی تحریر نقل کی ہے، جو آپ نے ۱۰ر اپریل ۱۹۵۲ء کو مناجاتِ مقبول پر لکھ رکھی تھی، وہ تحریر یہ ہے:۔

یکایک سونے کے وقت رات کو قرآنی آیت اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِہَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِہَا فَیُمْسِکُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْہَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ

الْاُخْرٰی اِلٰی اَجَلٍ مُّسَمًّی۔" کا خیال آیا، عجب بات ہے کہ آخر فرما ہی دیا گیا اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ، مگر سمجھ میں نہیں آیا، کہ مسلمان میں سکرات موت کے متعلق طرح طرح کی روایتیں کیوں مشہور ہو گئی ہیں، حالانکہ اس نصِ قطعی میں صاف طور پر اعلان کر دیا گیا ہے، کہ نیند جیسے آتی ہے موت بھی اسی طرح آتی ہے، نیند آنے میں سونے والوں کو تکلیف کب ہوتی ہے، پھر موت میں تکلیف کا تصور عجیب ہے، ہمارے استاذ مولانا فراہی سکرۃ الموت کے لفظ سے نتیجہ نکالا کرتے تھے عند الموت مرنے والے پر نشہ کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، حضرت تھانوی رح نے امام غزالی رح کی ان روایتوں کی تنقید کرائی تھی جس سے موت کے شدائد پر امام نے احیاء العلوم میں استدال کیا ہے۔"

(معارف اپریل ۵۷ء)

مولانا کے شاگرد غلام محمد صاحب نے صدقِ جدید لکھنؤ مؤرخہ ۲۱ر ستمبر ۱۹۵۶ء کے حوالہ سے لکھا ہے:۔

"حضرت گیلانی کی حسیّ کرامات زندگی میں خواہ نہ دیکھی گئی ہو، مگر اس عالمِ ناسوت سے جاتے ہوئے انہوں نے عقلیت کے مارون اور روحانیت کے بے خبروں کے لئے عجیب کرشمہ دکھایا، —— مکارم احسن (مولانا کے چھوٹے بھائی) کا بیان ہے کہ — مرض الموت میں اکثر یہ فرماتے تھے کہ جنت میں کوئی بوڑھا نہ جائے گا۔ ہر شخص جوان ہو کر جائے گا، چنانچہ جیسے جیسے وہ اپنے وقتِ موعود سے قریب ہوتے جا رہے تھے، ان میں جوش و مسرت

بڑھتا جارہا تھا، یہاں تک کہ جس رات سفرِ آخرت طے تھا اس میں تو فرطِ انبساط سے بے قابو ہوتے جارہے تھے، اور اسی عالمِ فرحت میں بظاہر سو بھی گئے، جب صبح ان کی روح پرواز کرچکی تھی، تو چہرہ پُر گوشت تروتازہ تھا۔ سفید ڈاڑھی بالکل سیاہ تھی، اور لاغر و نزار جسم بالکل گداز تھا، اس منظر کو مکارم احسن صاحب ہی نے نہیں دیکھا بلکہ ہر شریکِ جنازہ نے حیرت کی آنکھ سے دیکھا اور انہیں لذتِ روحانی محسوس کی، مولانا کے جنتی ہونے کی اس سے زیادہ واضح نشانی اور کیا ہوسکتی ہے ؎

مرگِ مجنوں پر عقل گُم ہے میر
کیا دِوانے نے موت پائی ہے

(مقالاتِ احسانی) ـــ

مولانا گیلانی کی وفات پر دنیائے علم میں کہرام مچ گیا، تمام اہلِ قلم نے تعزیتی نوٹ لکھے، اور آپکی خدمتِ دین کا بھرپور اعتراف کیا، مولانا اکبر آبادی نے نے رسالہ بُرہان دہلی کے نظرات میں لکھا۔

”دادریغا! جو خامۂ گوہر فشاں چالیس برس تک اسلامی علوم و فنون کے انمول موتی صفحہ قرطاس پر بکھیرتا لٹاتا رہا، گذشتہ ماہ جون کی ایک صبح کو یک بیک خاموش ہوگیا، وہ مسیحا نفس جو اپنے نفوسِ قُدسیہ سے اسلامی احساس وفکر کے تن بے جان کے عروقِ مُردہ میں زندگی کا نیا اور تازہ خون دوڑاتا رہا، ابنِ قیم کا وہ پیکِ خجستہ گو جولبِ اعجاز سے قال اللہ قال الرسول کا پیامِ حق القیام ایک عرصہ تک جھوم جھوم کر سناتا رہا، علم وفضل، عمل و کردار اور اخلاق

وشمائل کا پیکر، حسین جو اس عہد میں اسلام کی چہاردہ صد سالہ تاریخ کی آبرو تھا، اور جس کا نفس نفس گلبنِ محمدی کی عطر آفرینیوں کا امین و رازداں تھا، اچانک خاکِ لحد کی امانت ہوگیا، ملتِ بیضا، کی ایک متاعِ گراں مایہ لٹ گئی، بزمِ انس وقدس کا چراغِ فروزاں بجھ گیا، یعنی حبر اُمت مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے اس عالمِ آب وگل کو خیرباد کہہ کر عالمِ آخرت کی راہ لی، اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا الیہ راجعون“

(برہان دہلی جنوری ۱۹۵۷ء)

بُرہان دہلی کا یہ نظرات لمبا اور جامع ہے، یہاں اس کا صرف ایک حصہ نقل کیا گیا ہے ـــــــ سدا رہے نام اللہ کا۔

مولانا گیلانی کی رحلت پر ہندو پاک کے تقریبًا تمام ہی اخبارات ورسائل نے تعزیتی نوٹ لکھے، اور سبھوں نے آپ کی جلالتِ علمی کا اعتراف کیا۔ اور خراجِ عقیدت ومحبت پیش کیا۔

مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے اپنے اخبار صدقِ جدید میں لکھا ہے:۔

”جو کل تک کے ہر غم زدہ کے لئے مجسم تسکین وتشفی تھا، خود اسکے غم میں کون اور کس کو تسلی دے؟ جو کل تک ہمہ تازگی وزندگی، ہمہ جودت وذہانت تھا، کس طرح یقین آئے کہ آج اس کا جسم خاکی زیرِ زمین پہونچ چکا ہے۔

فاضلِ گرامی حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی آہ کہ ان کے نام کے ساتھ بجائے مدظلہ العالی کے آج کسطرح مرحوم یا نوراللہ مرقدہ یا رحمۃ اللہ علیہ لکھا جائے۔ گو زبان وقلم کچھ روز بعد اسی کے عادی ہوجائیں گے، دورِ حاضر کے طبقۂ علماء کے خواص میں نہیں۔

اخص الخواص میں تھے، ———— عقائد اہل سنت میں پختگی دیوبندی تعلیم و تربیت کی کھلی ہوئی برکت تھی، پھر جامعہ عثمانیہ میں بحیثیت استاذ کے برسوں جو انگریزی خواں طلبہ اور اعلیٰ ڈگریاں رکھنے والے استاذوں سے یکجائی رہی، اس نے علوم جدیدہ اور مسائل حاضرہ سے بھی انھیں پوری طرح باخبر کر دیا تھا، اور خیالات میں وسعت اور رواداری اس کا قدرتی نتیجہ تھی، خوش عقیدگی اور روشن خیالی و رسوخ فی الدین اور رواداری کی ایسی جامعیت کی نظیر کہیں اور شاید ہی مل سکے۔"

(وفیات ماجدی ص۷۶)

حلیہ و لباس اور اولاد

مولانا گیلانی وجیہ و شکیل اور نورانی شکل و صورت کے مالک تھے، نہ زیادہ لمبے تھے نہ بہت چھوٹے قد کے، نہ موٹے تھے اور نہ بالکل دُبلے پتلے، قد درمیانہ تھا رنگ سپید و سرخ تھا، چہرہ گول ماہتابی، رخساروں پر ہلکی خوبصورت سپید ڈاڑھی نہ زیادہ گنجان تھی اور نہ بالکل چھدری، پیشانی کشادہ، آنکھیں روشن، نہ زیادہ بڑی اور نہ چھوٹی، رہن سہن سادہ، لیکن سادگی میں ایک دلفریب جاذبیت۔

مولانا عبدالماجد دریا آبادیؒ نے لکھا ہے:-

"بڑے ہنس مکھ، وجیہ، شکیل، نرم مزاج، نرم رو، اور چہرے پر داڑھی تو خاص طور پر ملائم و خوشنما، بال ریشم کی طرح نرم اور چہرے پر خشونت و کرختگی کہیں نام کو نہیں (معاصرین ص۱۸۲)

رفتار و گفتار بیٹھتے وقت عام طور پر آنکھیں بند رکھتے اور سر کو جھکائے رہتے تھے، مگر جب بولنے پر آتے تو بے تحاشا بولتے جاتے، اور ایسا معلوم ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں، گفتگو میں شگفتگی اور روانی ہوتی تھی، ہر ہر جملہ سے ذکاوت و ذہانت ٹپکتی معلوم ہوتی، مخاطب بہت جلد مولانا سے مرعوب ہوجاتا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر ان کی باتوں سے لطف اندوز ہوتا، چلنے میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے، مگر تیز چلتے، سست رفتاری کبھی دیکھی نہ گئی، ایسے قدم اٹھتے تھے کہ ایڑی برائے نام ٹکنے پاتی، سارا زور پنجوں پر پڑتا تھا، چلتے ہوئے نظریں نیچی ہوتی تھیں، مگر بڑے پُر وقار طور پر چلتے تھے، چہرہ مہرہ سے عالمانہ شان جھلکتی تھی۔

مولانا کا لباس لباس مولانا کا عام طور پر سفید اور سادہ ہوا کرتا تھا، بدن پر کرتا، پائجامہ اور شیروانی ہوتی اور سر پر پنج گوشہ ٹوپی، کبھی ترکی ٹوپی اوڑھ لیا کرتے تھے، کبھی کبھی عمامہ بھی باندھتے تھے، سیاہ عمامہ مولانا کو بہت زیب دیتا تھا، پائجامہ ہمیشہ تنگ مہری کا پہنا کرتے تھے، جو علانیہ ٹخنوں سے اُونچا ہوتا تھا، پاؤں میں عام طور پر سلیم شاہی جوتا استعمال کیا کرتے تھے، کبھی کبھی پمپ شو بھی پہن لیا کرتے تھے، شانہ پر عربی رومال بھی کبھی کبھی ڈال لیا کرتے تھے۔

لباس نہ زیادہ قیمتی ہوا کرتا تھا، اور نہ گھٹیا۔ بلکہ درمیانہ قیمت کا ہوتا تھا، صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھا کرتے تھے، کرتا عام طور پر موٹے ململ یا اچھے پاپلین کا، مگر عمدہ بناوٹ کا ہوتا تھا، اور پائجامہ لٹھے کا۔

انداز گفت گو و تخاطب بناؤ سنگھار کا کبھی شوق نہ ہوا، طبیعت فطری طور پر سادہ پائی تھی، غصہ تقریباً نہیں آتا تھا، خندہ جبیں رہا کرتے تھے اور بات کرتے ہوئے ہنستے ہنساتے رہتے، چٹکلے بڑے دل چسپ ہوتے تھے، اظہارِ حق میں تحسین و ملامت کی قطعاً پروا نہیں کرتے تھے، بلکہ اس معاملہ میں بے نیازی کی شان رکھتے تھے، واقعہ بیان کرنے کا انداز بڑا دل چسپ اور شگفتہ ہوا کرتا تھا، زبان میں مٹھاس تھی، زبان پر کبھی کبر و غرور کے جملے بھولے سے بھی نہیں آتے تھے، سبھوں کا احترام کرتے، تنقید و تبصرہ کی عادت نہیں تھی، ادب و احترام اور شفقت و محبت کا بڑا پاس و لحاظ تھا،

چھوٹوں کے ساتھ بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے۔ معاصرین کا تذکرہ بڑی محبت سے کرتے اور ان کو ان کا حق دینے میں کبھی بخل نہیں کرتے تھے۔ طبیعت کینہ، بغض، حسد اور اس طرح کے دوسرے رذائل سے قطعاً پاک تھی، ایک دفعہ ملاقات کے بعد کوئی آپکو فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

دوسروں کو علمی فائدہ پہونچانے میں عام مولویوں کی طرح بخیل نہیں تھے، بلکہ

کہنا چاہیے ضرورت سے زیادہ سخی تھے، اور تکلف و تصنع سے کوسوں دور تھے، اگر کسی میں ذرا بھی صلاحیت پاتے اسکی خوب حوصلہ افزائی فرماتے کوئی کسی عنوان پر رہنمائی چاہتا، تو بہت ساری کتابوں کے نام لکھ کر بھیجتے اور نشاندہی فرماتے کہ یہ مضمون فلاں فلاں کتابوں میں دیکھیں۔

مولانا گیلانی کی اولاد مولانا گیلانی نے جب تعلیمی سلسلہ (درسیات) کی تکمیل کر لی، تو گھر والوں کو آپ کی شادی کی فکر ہوئی، جیسا کہ ہر شریف خاندان کا رواج ہے، آپ کا رشتہ اپنے گاؤں میں داروغہ نظیر کی صاحب زادی سے طے پایا اور سادہ طریقہ پر آپ کی شادی انجام پا گئی، کب ہوئی، کس سن میں ہوئی اب تک معلوم نہیں ہو سکا ہے۔

مولانا کی کل دو اولاد زندہ رہی، ایک لڑکا جن کا نام سید محی الدین آپ نے تجویز کیا تھا، اور ایک صاحب زادی جس کی شادی اپنے بھتیجے سید صلاح الدین سلمہٗ سے کی۔ صلاح الدین صاحب کے کئی بچے اور بچیاں ہیں، اسی طرح محی الدین کی بھی کئی اولاد ہیں۔

محی الدین یہاں سے ایم اے کر کے پاکستان چلے گئے تھے، وہاں کسی بڑے عہدہ پر فائز ہوئے، یہ بھی صاحبِ اولاد ہوئے، مولانا کی زندگی میں اُن کے بچے گیلانی آئے تھے، مولانا کو اپنے پوتوں سے بڑا قلبی لگاؤ تھا۔

مولانا کے انتقال کے کئی سال بعد مولانا کے صاحب زادے کا بھی پاکستان میں ہی انتقال ہو گیا، البتہ مولانا کے پوتے پاکستان میں رہ رہے ہیں۔ اور آپ کی صاحب زادی صاحبہ اپنے بچوں سمیت اپنے وطن گیلانی میں ہی قیام پذیر ہیں۔

ے حضرت سید سلیمان ندوی رح کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں: "میرا لڑکا محی الدین سلمہٗ بھی یہاں تحصیل علم کے جوار میں ہے، یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ کہیں ملازمت مل گئی ہے، ایم، اے میں اسی سال کامیاب ہوا ہے، یونیورسٹی میں پانچواں یا چھٹا نمبر ہے۔"

(مکتوب ۲۵ ر دسمبر ۴۹ء شائع شدہ معارف اعظم گڈھ جولائی ۶۳ء)

بعض مسائل میں
مولانا کے مخصوص رُجحانات

حضرت مولانا گیلانی رح اپنے ذہن وفکر اور ذکاوت و فطانت میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے، احکام ومسائل میں نظر وسیع بھی تھی اور عمیق بھی، معقول ومنقول دونوں علوم میں امتیاز رکھتے تھے، اور قدیم وجدید دونوں مکتب فکر سے آپ کا تعلق تھا۔ اس لئے مولانا کتاب وسنت سے جو نتائج اخذ کرتے تھے اور مسائل پر جس وسعتِ نظری سے غور فرماتے تھے، وہ ان کا علمی حق تھا۔

دُوسری بات یہ تھی کہ مولانا کا ذہن جامد، ضرورت سے زیادہ مقلد اور قانع نہیں تھا، نہ مولانا نے اپنے ذہن پر کوئی آہنی دیوار کھینچ رکھی تھی، کہ فلاں سرحد سے آگے سوچنے کا حق نہیں، علم وفہم کا بھی تقاضا تھا کہ اگر کسی باب میں ان کی رائے اپنے زمانہ کے علمار سے مختلف ہو تو وہ اُسے سنجیدہ پیرایہ میں علمار کی خدمت میں پیش کردیں تاکہ دوسروں کو بھی غور کرنے کا موقع ملے۔

چنانچہ مولانا نے چند مسائل میں اپنے ان رجحانات کو برملا ظاہر فرمایا، جو عام مسلمانوں کے ذوق کے خلاف تھا گو انکو اپنی رائے پر اصرار بھی نہ تھا، مخالف آرار کو بہت غور سے سنتے اور پڑھتے تھے اور جو اشکال پیدا ہوتا، اسے دوبارہ حل کرنیکی سعی کرتے تھے۔

ان مسائل کی فہرست کچھ زیادہ لمبی نہیں ہے، گنے چنے چند مسائل ہیں، جن کے متعلق کہا جائے گا کہ یہ ان کے تفردات ہیں۔

(۱) مسلمان کو جہنم کا عذاب نہیں ہوگا (۲) خطبہ جمعہ میں غیر عربی زبان کی گنجائش ہے (۳) دار الحرب میں بقول امام ابوحنیفہ رح غیر مسلم سے ربٰو کے حکم میں ربٰو کا معاملہ نہیں ہے

پہلا مسئلہ مومن ومسلم کو جہنم کا عذاب ہوگا یا نہیں، اسکی تمہید میں مولانا لکھتے ہیں:

اس مضمونچہ کی حیثیت جواب کی نہیں بلکہ لکھنے والا کچھ پوچھنا چاہتا ہے دین اور علم دین سے دلچسپی رکھنے والے میرے صحیح مخاطب ہیں۔"

اسی سلسلہ میں سب سے پہلے مولانا سورۃ النسار کی یہ آیتیں پیش کرتے ہیں

نہ تمھاری آرزوؤں اور نہ کتاب والوں کی آرزوؤں کا تابع بلکہ قدرت کا فیصلہ ہے کہ جو بھی کریگا برائی، بدلہ اس کا اسے دیا جائے گا۔	لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَھْلِ الْکِتَابِ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءً یُّجْزَ بِہٖ۔ (النسار - ۱۸)

استدلال قرآن سے اس کے مقابل قرآن ہی میں ہے:۔

اور جو کرے کوئی برائی، یا اپنے آپ پر کوئی ظلم کرے، پھر بھی بخشش و مغفرت چاہے اللہ سے، تو ہے اللہ بڑا بخشنے والا مہربان۔	وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءً اَوْ یَظْلِمْ نَفْسَہٗ ثُمَّ یَسْتَغْفِرِ اللّٰہَ یَجِدِ اللّٰہَ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (النسار - ۱۶)

تیسری آیت یہ نقل کی ہے

قطعًا اللہ نہ بخشے گا اس بات کو کہ اس کے ساتھ شریک اور ساجھی ٹھہرایا جائے اور بخش دے گا اسکے سوا جس کے لئے چاہے۔	اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النسار ۱۸)

چوتھی آیت یہ ہے

میں نے دھمکایا تم کو آگ سے جو بھڑک رہی ہے نہ گھسے گا اس آگ میں مگر جو سب سے زیادہ بدبخت ہے وہی جس نے جھٹلایا اور پیٹھ پھیری۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى (سورۃ اللیل)

دلیل حدیث سے | اس کے بعد بخاری کی حدیث نقل فرمائی ہے، جس کے راوی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں کہ :۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نہیں ہے ایسا کوئی آدمی جو گواہی دے اس بات کی کہ نہیں ہے الٰہ (معبود) مگر اللہ ہی، اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً اللہ کے رسول ہیں۔ دل کی سچائی کے ساتھ جس نے ان دونوں باتوں کی گواہی دی اور اقرار کیا تو نہیں ہے اسکے لئے بجز اس کے کہ حرام کردے اللہ اسپر آگ کو یعنی جہنم کو۔

مامن احد یشھد ان لا الٰہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ صدقا من قلبہ الاحرمہ اللہ علی النار متفق علیہ (مشکوٰۃ کتاب الایمان صـ۱۴)

دوسری روایت عتبان بن مالک رضی اللہ عنہ کی ہے کہ :۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قطعاً اللہ نے آگ یعنی جہنم پر حرام کردیا ہے اس کو جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا اللہ کی خوشنودی کو اس کے ذریعہ

قال رسول اللہ علیہ وسلم ان اللہ حرم علی النار من قال لا الٰہ الا اللہ یبتغی بذالک وجہ اللہ (جمع الفوائد)

تلاش کرتا ہے۔

اس کے بعد مولانا لکھتے ہیں :۔

"ظاہر ہے دونوں حدیثوں کا مفہوم بھی وہی ہے جو سورۃ واللیل والی آیت کا مفاد ہے، یعنی جہنم میں صرف وہی جائیں گے، جنھوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے پیغام کو جھٹلا دیا ہو، اور جھٹلا کر پیغمبر سے رشتہ توڑ لیا ہو...... یعنی اَشْقَى الَّذِىْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى کا مصداق بن گیا ہو، ان صفات سے موصوف ہونے کے بعد چونکہ کوئی مسلمان باقی نہیں رہ سکتا ہے، اس لئے آیت کا مفہوم اور کھلا ہوا مطلب یہی ہوا، کہ جہنم میں وہی جائے گا جو مسلمان نہیں ہے، اور اسکے سوا کوئی نہ جائے گا۔" (برہان دہلی جنوری ۱۹۴۹ء)

مولانا ان دلائل کو سامنے رکھ کر یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جہنم کا عذاب غیر مسلموں کے لئے مخصوص ہے، باقی جس کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہے وہ جہنم کی آگ میں جلایا نہیں جائے گا، کیوں کہ حدیث میں صراحت موجود ہے کہ مومن پر جہنم کی آگ حرام کردی گئی ہے،

مسلمان کی سزا کے طریقے | اب سوال یہ ہے کہ گنہ گار مسلمان کی سزا ہوگی یا نہیں؟ مولانا لکھتے ہیں کہ بلاشبہ سزا ہوگی، اپنے اعمال بد کا وہ بدلہ پائے گا، مگر یہ سزا جہنم کی آگ کے سوا دوسرے طریقوں سے دی جائے گی۔"

مسلمان کے سلسلہ میں مولانا کے الفاظ یہ ہیں :۔

"کسی قسم کا مسلمان ہو جہنم کی آگ اس کے لئے حرام ہے، اور جہنم کی آگ کے لئے وہ حرام ہے، گویا نہ جہنم ہی مسلمانوں کے لئے ہے نہ مسلمان ہی جہنم کے لئے ہے، بتایا جائے اس عقیدہ کو غیر قرآنی عقیدہ قرار دینے کی کیا صورت ہے؟ خصوصاً

جب بخاری شریف کی "دو دو صحیح حدیثوں کا صریح و واضح مفاد بھی یہی ہے، جو سورہ واللیل کی آیت سے سمجھا جا رہا ہے۔"

(برہان دہلی جنوری ۴۹ء)

آگے لکھتے ہیں کہ:۔

"جو مسلمان ہے وہ اس عذابِ جہنم سے تو بچ جائے گا مگر عذاب کی اور بھی تو قسمیں ہیں، یعنی جہنم میں داخل ہونے سے پہلے جسر (پل صراط) میدان حشر کی فوقانی و تحتانی، ظاہری و باطنی پریشانیاں نیز اس سے پہلے برزخی عذاب کا بھی ایک مستقل سلسلہ ہے۔..... اور ان کے سوا موت سے پہلے خود اس دنیا میں مصائب و آلام کی گونا گوں شکلوں کا حصہ بھی ہے، ظاہر ہے کہ جہنم کے عذاب سے بچ جانے کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ سزاؤں کی دوسری شکلیں جو موت کے بعد یا موت سے پہلے اسی زندگی میں مجرموں کو پکڑتی ہیں، ان سے بھی مسلمان ہو جانے سے آدمی محفوظ ہو جاتا ہے"

(ایضاً)

دل محمد ابن سیرینؒ اور مجدد صاحبؒ

مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ محمد بن سیرینؒ "سورۃ واللیل کی مذکورہ بالا آیت کا مطلب وہ بھی بیان کرتے تھے کہ مسلمان خواہ عملاً کسی حال میں ہو جہنم کی سزا سے بری ہو جاتا ہے" اور اخیر زمانہ میں ہندوستان کے مشہور مجدد اسلام حضرت مجدد الفِ ثانی رحمۃ اللہ بھی اپنے مکتوب ۲۲۶ جلد اوّل میں فرماتے ہیں "اہلِ کبائر کہ گناہاں ایشاں بمغفرت نہ آمدہ اند بہ توبہ یا شفاعت یا بمجرد عفو و احسان و نیز آں کبائر را با آلام و محن دنیوی یا شدائد

موت مکفر نہ ساختہ امید کہ در عذاب آنہا جمع را بعذاب قبر کفایت کنند و جمع دیگر را با وجود محنتہائے قبر یا اہوالِ قیامت و شدائد آں روز اکتفا فرمایند .... اخیر میں مجدد صاحب فرماتے ہیں، از گناہاں باقی نہ گذارند کہ محتاج بعذابِ نار گردند ص ۲۲۸ ج ۱" جس کا حاصل یہی ہوا کہ مسلمان ہونے کے بعد خواہ کسی قسم کے گناہوں میں کوئی مبتلا ہو، پھر بھی سزا پانے کے لئے عذابِ نار کی ضرورت اس مسلمان کے لئے باقی نہ رہے گی۔" (ایضاً)

مولانا نے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حجۃ اللہ البالغہ کی عبارت بھی اسی مفہوم کی اپنے مضمون میں نقل فرمائی ہے اور دوسری مختلف حدیثیں بھی۔ کہ مسلمانوں کے گناہوں کا ازالہ کس کس طرح دنیا میں ہوتا رہتا ہے، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، وضو مسجد کی حاضری، توبہ، استغفار پھر دنیاوی مصائب و آلام یہ ساری چیزیں مکفرات بنتی ہیں۔

ایک اشکال کوئی شبہ نہیں کہ مولانا نے جن دلائل سے اپنی رائے پر استدلال کیا ہے وہ سب مضبوط ہیں اور دل اسے قبول کرتا ہے، البتہ مولانا نے اپنے اس مضمون میں ان احادیثِ شفاعت کی طرف توجہ نہیں دی ہے۔ جن میں آتا ہے کہ یومِ حشر میں جب مومن شفاعت کے لئے تمام انبیاء کرام سے گزر کر سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گا، تو آپ سجدہ میں گر کر اللہ تعالیٰ سے التجا کریں گے حکم ہو گا مانگو دیا جائے گا، آپ اُمتی اُمتی کہہ کر درخواست پیش کریں گے، حکم ہو گا۔

من کان فی قلبہ ادنیٰ، ادنیٰ، اَدنیٰ — جس کے دل میں رائی کے چھوٹے

مثقال حبۃ خردلۃ من ایمان — سے چھوٹے دانہ کے برابر بھی ایمان

فاخرجہ من النار فانطلق — ہو اس کو آپ جہنم کی

ثم اعود الرابعۃ متفق علیہ۔ (مشکوٰۃ　　آگ سے نکال دیں۔
باب الحوض والشفاعہ)

٭　٭　٭

یہ ایک لمبی حدیث کا ایک حصّہ ہے:

خاکسار کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح کی حدیثوں سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مومن آگ میں داخل ہوں گے کیوں کہ اَخْرِجُوْهُ مِنَ النَّارِ کے جملہ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔

اشکال کا جواب | مگر اس طرح کی حدیثوں کا محدثین نے جو مفہوم بیان کیا ہے کہ:۔

"ایمان جس تصدیقِ قلبی یا اقرارِ لسانی کا نام ہے، وہ ایک ایسا جوہر ہے جس کو اجزا اور ٹکڑوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا ہے، اور نہ اس پر کمی و زیادتی کا اطلاق ہو سکتا ہے اس لئے وہ اصل ایمان نہیں ہے۔

واختلف العلماء فی تاویلہ حسب اختلافھم فی اصل الایمان والتاویل المستقیم ھو ان یُراد بالاَمْر المقدر بالشعیر والذرۃ والحبۃ والخردل غیر الشی الذی ھو حقیقۃ الایمان من الخیرات وھو مایوجد فی القلوب من ثمرات الایمان و لمعات الیقین لان حقیقۃ الایمان الذی ھو التصدیق الخالص القلبی وکذا الاقرار المقرر اللسانی لا یدخلھا التجزی ولا الزیادۃ ولا النقصان علی ماعلیہ المحققون (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ص۳۵۸ ج۵)

پھر علامہ طیبیؒ نے لکھا ہے:۔

قال الطیبی ھٰذا یوذن بان قال ماقدر قبل ذالک بمثقال شعیر ثم بمثقال حبۃ اوخردل غیر الایمان الذی یعبر بہ عن التصدیق وھو مایوجد فی القلوب من ثمرۃ الایمان

طیبی کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل ایمان کی تحدید ایک مثقال جو یا ایک مثقال رائی کے دانہ سے جو کی گئی ہے۔ وہ اس ایمان سے الگ چیز ہے جسکو تصدیق کہا جاتا ہے۔۔۔۔ وہ تو دلوں میں پایا جانے والا کوئی ایمانی ثمرہ ہے۔

(مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ص۳۵۹ ج۵)

٭　٭　٭　٭

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اس حدیث میں جو اور رائی کی مقدار کے برابر ایمان سے جس طرف اشارہ کیا گیا ہے اس سے وہ اصل ایمان مراد نہیں ہے جس کو تصدیقِ قلبی کہتے ہیں، بلکہ یہ ثمرۂ ایمان کا کوئی جلوہ ہوگا۔

اس شرح کے بعد پھر مولانا گیلانی کے رجحان پر کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔

یوں مولانا نے اپنے مضمون کے شروع میں ہی لکھدیا ہے کہ یہ ایک سوال ہے، جسے اہلِ علم کے سامنے رکھا گیا ہے، تاکہ وہ غور و فکر کر سکیں۔

اخیر میں مولانا لکھتے ہیں:۔

خلاصۂ کلام | "واقعہ یہ ہے کہ جہنم سے پہلے سزاؤں کے مختلف منازل اور مختلف قالبوں میں ان کے ظہور کی خبریں جو دی گئی ہیں۔۔۔۔ ان سزاؤں کا قالب بھی اور ان کا محل و مقام بھی تخفیفاً بدلتا چلا جاتا ہے۔ جسر (پل صراط) سے ہٹ کر حشر میں، حشر سے ہٹ کر قبر میں، قبر سے ہٹ کر خود اسی دنیاوی زندگی میں مجازاۃ کا قانون اپنے قدرتی اقتضا کو پورا کرتا ہے،۔۔۔۔ یہاں تک کہ تحویل و

تخفیف کا قانون اترتے ہوئے چلا جاتا ہے،..... اس طرح سزاؤں کی انہی منزلوں میں حق تعالیٰ کی رحمت بھی دستگیری فرماتی ہے اور رسول اللہ کی شفاعت بھی اپنا کام کرتی ہے بلکہ جرائم کے نتائج سے پاک ہونے کے بعد بہشتی زندگی سے استفادہ تو زیادہ تر فضلِ حق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعتِ کبریٰ کے ساتھ وابستہ ہے، بینوا توجروا علی اللہ اجرکم۔

(برہان دہلی، جنوری ۱۹۴۹ء)

دوسرا مسئلہ دوسرا مسئلہ خطبہ جمعہ کی زبان کا ہے، مولانا لکھتے ہیں کہ یہ بھی ایک مجتہد فیہ مسئلہ ہے اور اس میں علماء احناف میں سے کچھ کا خیال ہے کہ نمازیوں کی مادری زبان میں جمعہ کا خطبہ دینا مکروہ نہیں ہے، بلکہ بلا کراہت جائز ہے اور صحیح یہی ہے۔ اور اسی پر امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا اجماع ہے۔

جو لوگ خطبہ جمعہ کا عربی کے سوا دوسری زبان میں دینا مکروہ سمجھتے ہیں، ان کے سلسلے میں لکھتے ہیں۔

"ایک زمانہ سے ہندوستان کے حنفی علماء میں یہ مسئلہ مابہ النزاع بنا ہوا ہے، عربی زبان کے سوا دوسری زبان میں خطبہ جمعہ کو غیر مسنون قرار دینے والے حضرات کے دلائل عام طور پر مشہور ہیں۔ غالباً ان میں سب سے قوی تر دلیل وہی ہے، جو حضرت شاہ ولی اللہ نے پیش فرمائی ہے کہ غیر عربی ممالک میں حالانکہ جمعہ و جماعت کا عہد صحابہ میں ظاہر ہے کہ ہر مفتوحہ ملک میں انتظام تھا لیکن کوئی ایسی شہادت نہیں ملتی جس سے ثابت ہوتا ہو کہ ان غیر عربی ممالک میں باشندوں کی رعایت سے سننے والوں کی زبان

میں خطبہ کے ترجمہ کی اجازت دی گئی ہو۔" (برہان دہلی مارچ ۱۹۴۷ء)

مولانا کا استدلال اس دلیل کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:-

"شہادت کا نہ ملنا، اس کو وجودِ شہادت قرار دینا، یا کسی مباح فعل کو نہ کرنا فعل کے عدمِ اباحت کی دلیل کیا بن سکتی ہے؟ کتاب و سنّت میں ترجمہ کی ممانعت نہیں ہے، اس لئے اسکو مباح سمجھنا چاہیے، صحابہ نے اگر کسی فعلِ مباح پر عمل نہ کیا تو نہ کیا انکا عمل نہ کرنا اس فعل کی اباحت کو کراہت سے بدل دیگا؟ نیز غیر عربی زبانوں سے عموماً صحابہ کی ناواقفیت بھی اس کی وجہ ہوسکتی ہے کہ ترجمہ کے فعل مباح پر وہ عمل نہ کر سکے۔" (ایضاً)

جواب دینے کے بعد پھر "مسلک حنفی" کی وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

"دوسرا مسئلہ قرآن کے سوا دوسرے اذکار مثلاً تکبیر، تسلیم، تشہد درود، خطبہ وغیرہ کا ہے، کہ بجائے عربی الفاظ کے اسی مفہوم کو جو عربی الفاظ سے سمجھے جاتے ہیں غیر عربی الفاظ میں ترجمہ کر کے نمازوں میں کوئی پڑھے تو اس کا کیا حکم ہے۔؟

متن کنز الدقائق میں لکھا ہے:-

"او بالفارسیۃ صح (یعنی بجائے عربی کے ان اذکار کو کوئی فارسی میں ترجمہ کر کے پڑھے تو وہ درست ہے۔" (ایضاً)

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص جو عربی پر قادر ہے دوسرا جو عربی پر قدرت نہیں رکھتا ہے، کیا دونوں کا ایک ہی حکم ہے؟ فقہی کتابوں میں ہے کہ قدرت والے کے لئے دوسری زبان میں خطبہ وغیرہ مکروہ ہے، اور جو قادر نہیں ہے

اس کے لئے غیر عربی اختیار کرنا مکروہ نہیں ہے، لیکن اس باب میں امام ابو حنیفہ رح اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد رح) کا اختلاف نقل کیا ہے کہ امام اعظم ابو حنیفہ رح تو عربی پر خواہ قادر ہو، خواہ قادر نہ ہو، دونوں صورتوں میں غیر عربی کو جائز فرماتے ہیں، اور صاحبین قدرت والے کے لئے مکروہ فرماتے ہیں۔

شرح فتح المعین کا حوالہ | یہاں مولانا گیلانی رح کنز کی شرح فتح المعین سے نقل کرتے ہیں:۔

محصلہ أنہ فی مسئلة الشروع بالفارسیة ولو مع القدرة علی العربیة رجعا الی قولہ بخلاف القراءة بہا مع القدرة علی العربیة فانہ رجع الی قولہما۔ (فتح المعین ص۱۸۳)	خلاصہ یہ ہے کہ باوجود عربی پر قادر ہونے کے فارسی زبان میں نماز کو شروع کرنا یعنی فارسی میں تکبیر کا ترجمہ کرنا اس مسئلہ میں ابو یوسف اور امام محمدؒ نے امام ابو حنیفہ کے مسلک کو اختیار کر لیا ہے۔ اور قرآن کی قرارت میں امام ابو حنیفہؒ نے ابو یوسف اور محمدؒ کے قول کی طرف رجوع کیا ہے۔

٭ ٭ ٭

٭ ٭

جن کتابوں میں اس کے خلاف لکھا ہے وہ اشتباہ اور نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوا ہے، اس کی صاحب فتح المعین نے صراحت کی ہے۔

"ومن ھٰھنا حصل الاشتباہ" (ایضاً) اس کے نہ سمجھنے سے دوسرے مصنفیں کو اشتباہ ہوا ہے۔

مولانا لکھتے ہیں:۔

"اب میں سمجھتا ہوں کہ عربی زبان کی تعبیر پر قادر ہونے کے باوجود قرآن کے سوا دوسرے اذکار جس میں خطبۂ جمعہ بھی 'لاتفاق داخل ہے، ان کے متعلق ہمارے تینوں امام یعنی امام ابو حنیفہ، قاضی ابو یوسف رح، اور محمد بن حسن رح سب ہی اس بات کے قائل ہیں کہ بغیر کراہت غیر عربی الفاظ میں ان کا ترجمہ جائز ہے، مبسوط کے حوالہ سے اس موقع پر فتح المعین ہی میں نقل کیا ہے من غیر کراھة علی الاصح علی ماذکرہ السرخسی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں صاحبین کا رجحان ان اذکار کے متعلق بھی کراہت کا تھا، اور امام ابو حنیفہ رح جواز کے قائل تھے، لیکن بعد میں دونوں صاحبان اپنے استاذ کے ہمنوا ہو گئے، اسلئے حنفی مذہب کا یہ اجماعی مسئلہ ہوا کہ سارے غیر قرآنی اذکار جنمیں خطبۂ جمعہ بھی شامل ہے ان کا ترجمہ عربی پر قادر ہونے کے باوجود خطیب کر سکتا ہے اور کسی قسم کی کراہت اس میں نہیں۔

تاتارخانیہ کے حوالہ کے بعد صاحب فتح المعین نے صراحت کی ہے:

فظاھرہ کالمتن رجوعھما الیہ لاھو الیھما فاحفظہ فقد اشتبہ علی کثیر حتی الشرنبلالی (ایضاً)	تاتارخانیہ کا حاصل وہی ہے جو متن کنز کا ہے، غیر قرآنی اذکار میں صاحبین نے ہی ابو حنیفہ کے قول کی طرف رجوع کیا ہے نہ کہ ابو حنیفہ نے صاحبین

کے قول کی طرف، اسکو یاد رکھو اکثر کو اشتباہ ہو گیا، حتیٰ کہ شرنبلالی کو بھی۔

بعض علماء کا قول یہ ہے مولانا گیلانی رح کے مضمون کا خلاصہ، آپ نے کتب حنفی کے ہی حوالہ سے اپنی اس رائے کا اظہار فرمایا ہے۔ ہندوستان میں بہت سارے علماء کرام اس رائے سے متفق پہلے بھی گذر چکے ہیں، مولانا فخر رحمۃ اللہ علیہ کا قول مولانا ہی نے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے تھے۔

پس اگر خطبہ بہ لفظ ہندی	اگر خطبہ ہندی زبان میں اس
دریں مملکت خواندہ شود برائے	مملکت میں پڑھا جائے جسکے
چیزے موضوع است	لئے اس کی وضع ہے تو وہ
حاصل شود۔	حاصل ہوگا۔

حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری رح بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے وہ عرصہ ہوا چھپ بھی چکا ہے، اس رسالے میں حنفی مسلک کی فقہی کتابوں سے ثابت کیا ہے کہ غیر عربی میں جمعہ کا خطبہ دینا جائز ہے یہ رسالہ بھی مدلل ہے۔

البتہ علماء دیوبند و سہارنپور نے اس مسلک کو اب تک قبول نہیں کیا ہے۔ امداد الفتاویٰ وغیرہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ حضرت مونگیریؒ کے رسالہ میں حضرت تھانوی رح کی تصدیق دکھائی گئی ہے۔ مگر بعد میں حضرت تھانوی رح نے اس سے رجوع فرمالیا۔

تیسرا مسئلہ تیسرا مسئلہ ہندوستان میں غیر مسلم سے سود لینے کا تھا، جس میں حضرت مولانا کی رائے علماء دیوبند سے مختلف تھی۔

انگریزی دورِ حکومت میں چوں کہ ہندوستان دارالحرب تھا، اس لئے کچھ علماء اس کے قائل تھے کہ غیر مسلموں سے سود لینا جائز ہے، مسلمانوں سے نہیں مولانا ان کے ہمنوا تھے اور آپ نے ان کی حمایت میں یا یوں کہا جائے کہ آپ کی

تحقیق یہی تھی، جون ۱۹۴۴ء کے رسالہ معارف اعظم گڈھ میں ایک مضمون لکھا جسمیں اپنی اس رائے کا مدلل اظہار فرمایا اسکے جواب میں، مولانا ظفر احمد تھانوی رح نے مئی ۱۹۴۵ء کے معارف میں مضمون لکھا، مگر اس سے مولانا گیلانی رح کی رائے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، بلکہ مولانا نے اس کے جواب الجواب میں دسمبر اور جنوری ۱۹۴۶ء کے معارف میں یعنی تین قسطوں میں اپنے مضمون کو مزید مدلل فرمایا، اور مولانا ظفر احمد تھانوی رح کے اشکالات کے جوابات بھی دیئے۔

حضرت مولانا سے ایک ملاقات میں خاکسار نے اس کا تذکرہ کیا، اور جو جوابات لکھے گئے تھے اس کا ذکر کیا، مولانا نے فرمایا، امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سارے اجتہادات کو ہم مانتے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ اس مسئلہ میں امام اعظمؒ کے مسلک پر میں نے زور دیا ہے کہ عمل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے

صاحبِ ہدایہ وغیرہ نے امام صاحب سے نقل کیا ہے ولا ربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب اور حضرت مکحولؒ سے یہ روایت نقل کی گئی ہے عن مکحول عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہ قال لا ربا بین اھل الحرب واھل الاسلام، اسکا حاصل یہ ہے کہ دارالحرب میں یہ معاملہ سود کے حکم میں نہیں ہے۔ اگر ان کی رضامندی سے ہو۔

یہ بھی فرمایا کہ دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان میں غیر مسلم ہم مسلمانوں سے سود لیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی دولت کا بڑا حصہ سود در سود کے نام پر ان کی طرف منتقل ہوگیا اور ہوتا جا رہا ہے، اس یکطرفہ کاروبار نے مسلمانوں کو بے جان کر ڈالا ہے۔

اگر ہم بھی غیر مسلموں سے اس ملک کے دارالحرب ہونے کی وجہ سے امام اعظم رح کے قول کو بنیاد بنا کر سود لینے کو جائز قرار دے دیں تو کون سا بڑا جرم ہے توازن تو یوں ہی قائم ہو سکتا ہے، نہ کہ ایک طرف تو مسلمانوں سے لینے والے لیتے

رہیں اور دوسری طرف سے اس مسئلہ میں شدت اختیار کی جائے۔

مولانا مرحوم نے مثال میں غلامی کے مسئلہ کا تذکرہ فرمایا کہ رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج کے قطعًا یہ خلاف تھا کہ انسانوں کو غلام ولونڈی بنایا جائے۔ مگر چونکہ عرب میں پشتہاپشت سے رائج تھا، اور اہلِ جاہلیت مسلمانوں کو غلام ولونڈی بناتے تھے آپ صلعم نے بھی اس کو اسلام میں جائز رکھا، گو ان کے بہت سارے حقوق کی نشاندہی فرمائی اور ان کے ساتھ حُسنِ سلوک کی تاکید فرمائی۔

اگر اس دور میں اس کو بنیاد بنا کر امام اعظم کے مسلک پر غیر مسلم سے سود لینے کو ہم جائز کہتے ہیں، تو اس میں ہمارا جرم کیا ہے؟ جو ہم سے سود لینے کو صرف جائز ہی نہیں کہتے، بلکہ عملاً بھی لیتے ہیں، ہم بھی اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ مسلمان بھی ان سے لیں، امام اعظمؒ کا قول ہمارے پاس سند ہے۔

خاکسار نے عرض کیا کہ کچھ لوگوں نے اس کی تردید میں کتابیں لکھی ہیں۔۔

فرمایا ___ میں نے ساری کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، ہماری جو بنیاد ہے اس کو کسی نے نہیں توڑا، وعظ کہا ہے، میرا جو منشار ہے اس پر کسی نے گہری نظر نہیں ڈالی ___ یوں سب کو معلوم ہے کہ میں نے نہ کوئی ایسا کاروبار کیا ہے، نہ میرے اہلِ خاندان نے، نہ کبھی اس کا ارادہ ہوا، میرا مقصد ہندوستان میں غیر معتدل نظام کو معتدل بنانا ہے، مجھے اس پر اصرار نہ پہلے تھا اور نہ اب ہے، البتہ جو مسئلہ میرے سامنے تھا۔ میں نے مدلل طور پر بیان کر دینا اپنا فرض سمجھا۔ تاکہ علمار کرام اس پر پوری سنجیدگی سے غور کر سکیں۔

تصانیف پر ایک نظر

مقالاتِ احسانی: یہ مولانا مرحوم کے چھ مقالات کا مجموعہ ہے، یہ مقالات پہلے ہندوستان کے مختلف علمی رسالوں میں وقتًا فوقتًا شائع ہوتے رہے، بعد میں مولانا کے تلمیذِ رشید غلام محمد بی۔ اے کی توجہ سے کتابی شکل میں ان کا مجموعہ مقالاتِ احسانی کے نام سے سامنے آیا ہے، ان تمام مقالات میں تصوف کے مختلف پہلوؤں پر مولانا نے روشنی ڈالی ہے اور عمیق النظر عالمِ دین اور رمز شناسِ تصوف کی حیثیت سے بحث کی ہے، امام غزالیؒ کے عہد اور اس کے ماقبل و مابعد پر بحث کرتے ہوئے بڑا اچھا تاریخی ذخیرہ مولانا نے جمع فرما دیا ہے۔ ابن تیمیہؒ کے نظریۂ مخدومیت پر بھی بہت دل پذیر بحث کی ہے، اور کراماتِ اولیار کو ثابت فرمایا ہے، امام احمد حنبل رحمۃ اللہ علیہ اور شیخِ اکبر محی الدین بن عربی نے سلوک و تصوف پر جو احسان فرمایا ہے اس کا تذکرہ بھی بہت مؤثر انداز میں آپ نے کیا ہے۔

بیعت کے جو اقسام علمار نے بیان کئے ہیں اس پر بھی اپنے بعض مقالہ میں بہت دل چسپ انداز میں مولانا نے روشنی ڈالی ہے، مولانا موصوف کو سلوک و تصوف سے جو قلبی اور ذہنی تعلق تھا وہ ان مقالات میں ابھر کر سامنے آیا ہے۔ ان مقالات کے مطالعہ سے آدمی ظاہر کے ساتھ باطن کو سمجھنے اور اس کے فوائد کو سوچنے کے لئے مجبور ہوتا ہے اور بہت سارے لوگ عمل بھی کرتے ہیں ___ مولانا مرحوم نے ان مقالات کی تحریر میں اپنی علمی و دینی بصارت و بصیرت دونوں سے کام لیا ہے کہیں سے یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کسی باب میں "مقلد جامد" ہیں، جہاں جو بات کہنے کی ہے، ضرور کہی ہے، نتائج پیدا کرنے میں مولانا کا ذہن عبقریت کی شان رکھتا تھا، حالات و واقعات سے خود مولانا بھی متاثر نظر آتے ہیں اور اپنا خیال ہے کہ دوسرے پڑھنے والے بھی بغیر متاثر ہوئے آگے نہیں بڑھ سکتے ہیں۔

تاریخی حقائق سے جہاں بحث کی گئی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نے تاریخ کا مطالعہ دینی نقطۂ نظر سے کیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں آپ کا مطالعہ بہت گہرا اور وسیع ہے۔ اُمراء سلاطین، علماء، مشائخ، اور دانشوروں کی زندگی کے جن پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اُن کو پڑھ کر ایک مسلمان کا دل کہیں تو لرزا ورکانپ جاتا ہے۔ اور کہیں باغ باغ ہو جاتا ہے، اور پڑھنے والے کو اپنا میدانِ حشر سامنے نظر آنے لگتا ہے، اگر دل پتھر اور سیاہ نہیں ہے تو نہیں —— ہو سکتا ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے سہی ان نیکیوں کا عزم نہ کرلے۔

اسی کتاب میں وہ خط بھی درج ہے جو مولانا نے راہِ سلوک کے ایک مسافر کو لکھا ہے، تصوّف کا اس میں عطر کشید ہو کر آگیا ہے، لکھتے ہیں:۔

"اوراد و وظائف کے سلسلہ کو آپ درازسے درازتر کرتے چلے جاتے ہیں، اللہ میاں اس سے آدمی کے قابو میں نہیں آتے، اپنے حول و قوت سے جو خالی ہو کران کے قدموں میں گرگیا، وہی اٹھایا جاتا ہے،...... کاش جن اور بھوت سے آدمی جتنا ڈرتا ہے اللہ میاں کو اتنا بھی تو اپنے آگے پیچھے، اوپر نیچے جانتا،........ ذرا اسی شق اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی یافت کے تابع ہو کر کیجئے سب کچھ آپکو مل جائے گا، آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا ذکر کسی بادشاہ یا حاکمِ مجازی نہیں بلکہ حق تعالیٰ کی مجلس میں ہو سنئے، آپ کے پیغمبر صلی اللہ وسلم سنا رہے ہیں کہ خدا ان کو اطلاع دے رہا ہے کہ فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ، دل ہی دل میں اللہ میاں کو یاد کرنا شروع کیجئے، آپ کا ذکر آپ کا مالک کرے گا۔ ہم ان کو یاد کریں وہ ہمیں یاد نہ کریں ؟ یہ ہو ہی نہیں سکتا، جو ایسا خیال کرے وہ مسلمان ہی نہیں۔....

الغرض ورد وظیفہ سے زیادہ اپنے علم کی تصحیح کیجئے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو علم بخشا ہے، اسی علم کے مطابق اپنے علم کو کرلیجئے آپ اس کے بعد خدا کے سامنے ہیں، اور خدا آپ کے سامنے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن کو تھام لیجئے جو کچھ انہوں نے سکھایا، اس کے سوا طے کرلیجئے کہ اس راہ میں اور کسی سے کچھ سیکھنا نہیں ہے، آپ کا سلوک طے ہو گیا، خدا آپ کو مل گیا، آپ چین کیجئے آپ مانگتے چلے جائیں گے وہ دیتا چلا جائے گا۔" (ص۳۹)

پوری کتاب بڑے سائز کے (۴۲۸) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، مقالات کے جلی عنوانات یہ ہیں:۔

کیا تصوّف بدعت ہے؟ اختلاف سلاسل کی نوعیت، بیعت کی قسمیں، حقیقت تک رسائی بلا رہبر ممکن نہیں، طریقہ غزالیہ، امام غزالی کے دور کی سیاسی حالت امام کے مخاطب خاص علماء ہیں، امام کی کتابوں کے انقلابی اثرات، خلفاء، سلاطین وزراء، علماء دین اور طریقۂ غزالیہ پر تنقید، کوئی اساسی اختلاف نہیں، اختلاف کا تعلق جبلّی شاکلہ اور ماحول سے ہے: حسن بصریؒ اور ابنِ سیرینؒ، علماء دیوبند سے دردمندانہ اپیل۔ طریقہ اشغالِ مطلقہ، تعارف الیافعی، تعارف المرشدی، —— المرشدی کی خاص کرامت، ابنِ تیمیہؒ کا الزام مخدومیت، مخدوم کا اصطلاحی مفہوم، الزام مجذوبیت، طریقۂ غزالیہ پر ابن جوزی کی سخت تنقید، شیخ اکبر کی توضیحات، اطلاقی تصوّف کا طریق، ابنِ تیمیہؒ کا نظریۂ مخدومیت، جنوں کی تسخیر اور ابن تیمیہؒ، اس نظریہ کا کراماتِ صوفیہ پر استعمال، مجالس شیخ اکبر قدس سرّہٗ، مجالس مولانا رومی قدس سرّہٗ۔

عبودیت — حضرت مولانا گیلانی رحمۃ اللہ کی زندگی سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے شیفتگی اور تعلق غایت درجہ کا تھا۔

اسلام اور اسلامی تعلیمات پر جان و دل سے نثار تھے، اور یہ خاندانی تعلیم و تربیت اور اساتذۂ کرام کی خصوصی توجہات کا نتیجہ تھا، مولانا کو ربُّ العالمین سے جو دل ملا تھا اس میں سوز و گداز، غیرت وحمیت، اور تعلق مع اللہ پیوست ہو گیا تھا۔

دینی درس گاہوں سے نکل کر جب جدید تعلیم گاہ میں کام کرنے کا موقع ملا اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں سے خلا ملا ہوا، تو دین اور دینی احکام و مسائل میں اور بھی پختگی آتی چلی گئی، پھر آپ ہی کے دور میں عبد اللہ چکڑالوی (اہلِ قرآن کا پیدا کردہ گروہ سامنے آگیا تھا، جو اپنے کو اہلِ قرآن کہتا ہے، اور حدیثِ رسول ؐ کی حجیت کا منکر ہے، اس فرقہ کی کتابوں نے آپ کو جھنجھوڑ دیا، اور آپ نے محسوس کیا، گمراہوں کا یہ گروہ اپنا فتنہ جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں میں پھیلانے کی سعی کرے گا۔ اس لئے آپ کی سب سے زیادہ توجہ قرآن، حدیث اور فقہ پر رہی، آپ نے سعی کی کہ ایسی چیزیں مرتب کردی جائیں جو آئندہ نسل کو کام آئے، اور ان راہوں پر آہنی دیوار کھنچ جائے، جن راہوں سے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی سعی ہو سکتی ہے۔

چنانچہ تدوینِ قرآن، تدوینِ حدیث اور تدوینِ فقہ پر آپ بہت عمدہ کام کر گئے، اور انہی ناموں سے کتاب بھی لکھ گئے، جو ان شاء اللہ اہلِ علم کی رہبری و رہنمائی کے فرائض بہت خوبی سے انجام دے سکتی ہیں، اور دے رہی ہیں اور خدا نے چاہا تو بہت دنوں تک دیتی رہیں گی۔

ان میں زیرِ نظر کتاب "تدوین حدیث سب سے اہم ہے، اس لئے کہ قرآن کی تبیین و تشریح اور احکام و مسائل کی تفہیم اور ان پر عمل کا دار و مدار حدیثِ نبوی کی تفصیل پر ہے، حدیث کا دامن چھوڑ کر کسی مسلمان کا راہِ راست پر جمے رہنا ناممکن ہے۔ مثلاً قرآنِ پاک میں یہ حکم تو ہے کہ نماز ادا کرو، زکوٰۃ دیا کرو، مگر دن رات کتنے وقت کی نماز فرض ہے، کن وقتوں میں کتنی سنتیں ہیں، اور کس قدر فرض

رکعتیں ہیں، نماز کن چیزوں سے فاسد و باطل ہوتی ہے، ان کی ادائیگی کے لئے کیا شرائط ہیں، اور کیا ارکان ہیں؟

جب تک حدیث نبوی سامنے نہ ہو، کوئی جواب نہیں پا سکتا ہے، کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ؐ کے صحابہ کرام نے عمل کر کے دکھایا ہے۔ حدیث میں سب کی پوری تفصیل موجود ہے اور اس وقت سے تا ایندم یہ اسی طرح ادا ہوتی آرہی ہے۔

اہلِ قرآن کی طرف سے جو اشکالات سامنے آچکے تھے یا آسکتے ہیں حضرت مولانا گیلانی نے اپنی اس کتاب میں سب کا مدلل جواب دیا ہے، اور ان تمام شکوک و شبہات کو بیخ وبُن سے اُکھیڑ کر رکھ دیا ہے جن کی آب یاری اہلِ قرآن کرتے رہے اور آئندہ کرنا چاہیں گے۔

مولانا نے ثابت کیا ہے کہ حدیث نبوی عہد نبوی میں لکھی گئی، اور اس کے بہت سارے مجموعے بہت سے صحابہ کرام رض کے پاس لکھے ہوئے موجود تھے، پھر جس طرح ہمارے زمانہ میں قرآن کے بہت سارے حافظ پائے جاتے ہیں اور وہ قرآن یاد رکھتے ہیں، عہد نبوی اور عہدِ صحابہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ احادیث یاد کرتے اور یاد رکھتے تھے، سب کے لئے تحریری ثبوت فراہم کرنے کی سعی فرمائی ہے۔ عہدِ نبوی سے لیکر بعد تک کے محدثین کے حفظ و اتقان کے بہت سے واقعات جمع کر دیئے ہیں۔.... اور نام بنام بتایا ہے کہ اس معاملہ میں صحابہ کی شیفتگی کا کیا عالم تھا۔

پھر اس کی حفاظت پر علمائے اسلام نے جو کاوشیں کی ہیں ان کا اجمالی تذکرہ کیا ہے حجیت حدیث کے خلاف جس قدر بھی اعتراضات کئے جاتے ہیں، یا کئے جا سکتے ہیں مولانا نے اپنی اس کتاب میں سب کے دفع کرنے کی جدوجہد فرمائی ہے۔ کوئی شبہ

نہیں کہ مولانا اپنی اس کاوش میں پورے طور پر کامیاب ہیں۔

اس کتاب کے جلی عنوانات ملاحظہ فرمائیں :۔

حدیث کی حقیقت ، تدوینِ حدیث کے قدرتی عوامل ، حدیث کی کتابی تدوین ، عہد صحابہ کی مدت ، محدثین کا بے مثال حافظ ، محدثین کی قوتِ حافظہ کی چند مثالیں ، تابعین کا طریق حفظ ، تدوین حدیث کا ماحول ، حدیث کے سلسلے میں تین ضروری مقدمات ، عہد صحابہ اور مصنفین صحاح کے درمیانی دور میں حفاظت حدیث کی شکلیں ، کتابت حدیث کے سلسلہ میں اعتراضات کے جوابات ، تاریخ تدوین حدیث ، عہدِ نبوی میں تدوین حدیث ، عہدِ صدیقی اور تدوین حدیث

حضرت ابوبکرؓ نے پانچسو حدیثیں خود قلم بند کیں ، عہد فاروقی اور تدوین حدیث ، عہدِ عثمانی اور تدوین حدیث ، عہدِ مرتضوی اور تدوین حدیث صحابیت اور حدیثِ رسولؐ کے خلاف پہلا ناپاک اقدام ، فتنۂ سبائی کے احتیاطی اصول۔

شروع کتاب میں تعارف کے عنوان سے حضرت العلامہ سید سلیمان ندویؒ کا ایک جامع ، پُرمغز اور مدلل مقدمہ ہے ، یہ پوری کتاب بڑے سائز کے (۴۸۰) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

حضرت العلامہ سید سلیمان ندوی رحؒ نے درست لکھا ہے :

" اللہ تعالیٰ نے اسلام کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ، اس کی کھُلی شہادت اس سے ملتی ہے کہ صحابہ کے آخری زمانہ سے اس وقت تک سیکڑوں چھوٹے بڑے بدعتی فرقے پیدا ہوئے جنھوں نے اسلام کے چاند پر خاک ڈالنے کی کوشش کی ، اور اسلام کے منور

آئینہ کو مکدر کر دینا چاہا ، مگر اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں ایسے لوگوں کو پیدا کیا جنھوں نے بتائیدِ غیبی انکی ساری آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا اور انکے بدعات کے گرد و غبار کو ہٹا کر اس آئینہ کو ہمیشہ روشن رکھا ، ......

اس زمانہ میں اس فرض کو ادا کرنے کے لئے جو دستہ آگے بڑھا اسکے ہراول میں ہمارے دوست ، مناظرِ اسلام ، متکلمِ ملت ، سلطان القلم مولانا سید مناظر احسن گیلانی کا نام نامی ہے ، جن کے قلم کی روانی اسلام کی محافظت میں تیغ رانی کا کام دیتی ہے "

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت | یہ کتاب دو ضخیم حصوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس کتاب کا مقصد کیا ہے خود مولانا کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔

لکھتے ہیں :۔

" ان کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ مسلمانوں میں تعلیم کے جو دو مستقل نظام حکومت متسلطہ کے قیام کے بعد جاری ہو گئے ہیں اس کی دوئی اور اثنینت کو مٹا کر صرف ایک ہی نظام کو قبول کر لیا جائے ، اس لئے اپنی تعلیمی تجویز کا نام میں نے " نظریۂ وحدت نظامِ تعلیم رکھا ہے "

(نظامِ تعلیم و تربیت ج۲ ص۵ و ج۲ ص۶)

مولانا نے اس خیال کی تردید فرمائی ہے کہ درسِ نظامیہ کا مقصد صرف دینی تعلیم کا نظام تھا ، بلکہ اس نصابِ تعلیم میں اس دور کی دفتری زبان فارسی میں پوری استعداد حساب اور خطاطی کی مشق بھی داخل تھی ، اور صرف داخل ہی نہیں تھی بلکہ اس پندرہ سولہ سالہ نصاب میں خالص دینیات کی صرف تین کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ قرآنِ پاک سے متعلق جلالین شریف ، حدیثِ نبوی سے متعلق مشکوٰۃ شریف ، اور فقہ سے متعلق ھدایہ ، باقی ساری کتابیں منطق ، فلسفہ ، ریاضی ، عربی ادب ، فارسی ادب اور علمِ کلام کی ہوتی

تھیں، جن کا خالص دین سے کوئی تعلق نہیں۔

مولانا فرماتے ہیں:۔

”آج بھی کیا ممکن نہیں ہے کہ غیر دینی علوم کے اس حصہ کو نکال کر جس کے نظریات و مسائل مسترد ہو چکے ہیں، عصرِ جدید کے مقبولہ علوم اور عہدِ حاضر کی دفتری زبان کے نصاب کو قبول کر کے مذہب کی تعلیم کو ان تین کتابوں کے معیار کے مطابق باقی رکھتے ہوئے دینی اور دنیاوی تعلیم کے مدارس کی اس تفریق کو ختم کر دیا جائے۔“ (ایضاً ص ۴ ج ۲)

پھر مولانا نے ان تمام شبہات کا تفصیل سے جواب دیا ہے جو اس نصاب پر ہو سکتا ہے، یا ذہنوں میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً عربی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:۔

”عربی زبان کے الفاظ کا ایک حصہ تو وہ ہے جس میں مسلمانوں کی دینی چیزیں قرآن و حدیث اور فقہ وغیرہ میں محفوظ ہیں، اس حصہ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ اردو بولنے والی قوموں کے لئے عربی زبان کا یہ حصہ تقریباً مادری زبان کی حیثیت رکھتا ہے، یعنی استی پچاسی فیصدی الفاظ عربی زبان سیکھے بغیر یوں ہی معلوم ہیں۔“ (ایضاً ص ۹ ج ۲)

پیدا ہونے والے دو چار شبہات کے جواب دینے کے بعد مولانا نے لکھا ہے:

”ہر تعلیم گاہ کے ساتھ ساتھ، مسلمان طلبہ کے لئے خاص اسلامی... اقامت خانے بھی قائم کئے جائیں اور ان اقامت خانوں کی نگرانی اربابِ تقویٰ و دیانت کے سپرد کی جائے۔ ان کا ماحول بالکلیہ اسلامی ماحول... رکھا جائے۔“ (ایضاً ص ۹ ج ۲)

مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کے ساتھ حکومتِ وقت سے عربی تعلیم کے لزوم کا مطالبہ کیا جائے، اور طریقہ ایسا اختیار کیا جائے کہ اردو بھی ساتھ ساتھ آجائے

اور ضرورت ہو تو بقدرِ ضرورت فارسی بھی، اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ مسلمان نوجوانوں کو قرآن پڑھنے اور سمجھنے سے بتدریج مناسبت پیدا ہو جائے گی، اور وہ خدا کے کلام سے بے بہرہ نہ رہیں گے۔

مولانا نے آگے چل کر سمجھایا ہے، اور مثال دی ہے:

”پانی میں پانی ملاتے چلے جانے سے کوئی نئی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی اسی طرح اردو کی ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب اور دوسری کے بعد تیسری پڑھانے سے یہ زیادہ بہتر ہے ...... کہ اردو کے بعد فارسی اور فارسی کے بعد عربی سے طلبہ کا لگاؤ پیدا کیا جائے۔“ (ایضاً ص ۱۳ ج ۲)

مولانا یہ نہیں کہتے ہیں کہ مدارسِ اسلامیہ کا نصاب بھی اسی طرح بدلا جائے اور وہاں سائنس وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔ کہ اس کے متحمل وہ نہیں ہو سکتے ہیں، بلکہ... مولانا کی تجویز یہ ہے کہ:۔

”دینیات کی تعلیم کو ــــــ ان مدارس میں منتقل کر دیا جائے جہاں حکومت نے جدید علوم و فنون کی تعلیم کا انتظام کر رکھا ہے، چاہے تو کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی مدارس کو انگریزی مدارس نہیں، بلکہ انگریزی مدارس کو چاہتا ہوں کہ مسلمان بنا لیا جائے ــــــ رہے عربی مدارس سو عرض کر چکا ہوں کہ غیر مرکزی مدارس..... کو قرآن کی با معنیٰ تعلیم کا مدرسہ قرار دے کر جدید علوم و فنون کا ہائی اسکول مسلمانوں کے لئے بنا لیا جائے، اور اسلامی علوم کی تکمیلی تعلیم کا مرکز عربی کے مختلف مرکزی مدارس کو قرار دیا جائے۔“ (ایضاً ص ۱۳ ج ۲)

یہ ہے اس کتاب کا مرکزی منشا، یوں اس کتاب میں تعلیم و تعلم، اساتذہ و طلبہ کا قدیم تعلق، اساتذہ کا ایثار، اسباق کی پابندی، تصوف سے استفادہ، اور

اس طرح کی دوسری چیزوں کا تاریخی ثبوت فراہم کیا گیا ہے۔

قدیم نصاب کا تجزیہ بھی بہت خوبی سے کیا گیا ہے، مجموعی طور پر یہ کتاب بڑی کار آمد، معلومات افزا، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کے لئے باعثِ ترغیب اعمال و اخلاق کی تحریص کا عمدہ ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔ یہ دونوں جلدیں چھ سات سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں، پہلے اڈیشن میں عنوانات نہیں تھے اسی طرح فارسی عبارتوں کا ترجمہ بھی نہ تھا حضرت مفتی عتیق الرحمان صاحب کی فرمائش پر خاکسار نے دونوں جلدوں میں عنوانات اور ترجمہ کا اضافہ کیا ہے، اس سے کتاب نکھر گئی ہے۔ دوسرا اڈیشن اس اضافہ کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

تذکرہ حضرت شاہ ولی اللہ مولانا گیلانی رح نے یہ مقالہ الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر کے لئے لکھا تھا۔ جو بعد میں کتابی صورت میں مرتب ہو کر شائع ہوا، یہ کتاب دراصل ہندوستان کی دردناک تاریخ کا خلاصہ ہے، شاہ ولی اللہ سے پہلے اور بعد ہندوستان کس حال میں رہا، اس کا عروج و زوال دیکھنے والوں نے کیا کیا، بڑے ہی دل دوز انداز میں قلم بند فرمایا ہے۔ انگریز کب آئے اور کیسے آئے۔ عالمگیر رح کے بعد کتنے فتنے اُبھرے اور باشندگانِ ملک بالخصوص مسلمانوں کو کیا اذیت پہونچی، مرہٹہ اور سکھ تحریک کا مقصد کیا، اور انھوں نے کیسے مظالم ڈھائے، جسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، پھر غازی احمد شاہ ابدالی کی آمد، ان کا بے نظیر ایثار، مرہٹہ تحریک کی شکست، سراج الدولہ پر شب خون، میر جعفر وغیرہ کی غداری، جنگ پلاسی میں انگریزوں کی جیت، بنگال و بہار اور اڑیسہ کی دیوانی کا بنام کمپنی بہادر منتقلی، نادر شاہ کا حملہ، اور ایرانی علماء کا تفوق، شاہ جہاں کی پوتی کا نکاح نادر شاہ کے لڑکے سے، اس دور کے مختلف فتنوں کا تذکرہ پھر شاہ ولی اللہ کی ولادت، ان کی خدمات، ان کی اولاد کی خدمات، شاہ ولی اللہ کی چیخ و پکار، مسلمانوں کو بیدار کرنے کی جد و جہد، علماء و

مشائخ کی کمزوریاں، فقیہوں کی بے راہ روی، صوفیوں کی افسوسناک حالتیں، ساداتِ بارہ کا فتنہ، خانہ جنگی، شیعہ، سُنّی اختلاف، ولی اللّٰہی دار العلوم کی ۱۸۵۷ء میں بربادی، مولانا گیلانی نے اس مختصر مقالہ میں اس دور کے تمام پہلوؤں پر کافی روشنی ڈالی ہے، معلومات کا ایک ایسا خزانہ ہے جو بہت ساری کتابوں کے مطالعہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتا ہے، یہ مقالہ چھوٹے سائز کے ۲۰۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔

امام ابوحنیفہ رح کی سیاسی زندگی مولانا گیلانی رح کی تصنیفات میں یہ کتاب بھی ایک اہم تصنیف ہے، اور کہنا چاہیئے اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے، امام اعظم ابوحنیفہ رح ائمہ اربعہ میں سب سے بڑے تھے، اور تابعی تھے، فقہ میں آپ کا جو مقام و مرتبہ ہے وہ کسی اہلِ علم سے پوشیدہ نہیں، اور عام طور پر اہلِ علم اسی نقطۂ نظر سے آپ کو جانتے پہچانتے بھی ہیں مگر مولانا مرحوم نے آپ کی سیاسی زندگی پر روشنی ڈالی ہے اور تاریخ کا تجزیہ کر کے ثابت کیا ہے کہ فقیہ ہونے کے ساتھ امام صاحبِ بصیرت مفکر و رہنما بھی تھے۔ دستورِ اسلامی اور حکمرانی کے فرائض و اختیارات پر آپ کی بڑی گہری نگاہ تھی۔

اس کتاب میں امام صاحب رح کے زمانہ کے سیاسی حالات اور نشیب و فراز پر اس وقت کی روشنی میں بڑی دلچسپ بحث کی گئی ہے، جس کے پڑھنے سے حکمرانوں کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے، اور یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کی نظر حکمران مسلمانوں کی تاریخ پر بھی کس قدر دور رس تھی، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نتائج اخذ کرنے کا کتنا عمدہ سلیقہ عطا کر رکھا تھا، کوئی شبہ نہیں اس طرح کی کتابوں کے مطالعہ سے انسانی ذہن و فکر کے دریچے کھلتے ہیں، اس کتاب کے جلی عنوانات یہ ہیں۔

(۱) خلافت و پادشاہی کا فرق (۲) خلفاء بنی امیہ کے دینی حالات (۳) اسلامی اموال و خلافت (۴) امام اعظم کا سیاسی مسلک (۵) حجاز میں مختلف علماء سے آپ کا مکالمہ اور مناظرہ (۶) وضعِ قوانین اسلامی کی مجلس (۷) اس مجلس میں سوالات و اعتراضات کی آزادی (۸) خلافتِ عباسیہ سے تعلقات (۹) امام اعظمؒ کا آخری امتحان (۱۰) امام صاحبؒ کی ایک اہم تقریر، پھر ہر بڑے عنوان کے تحت متعدد ضمنی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔

مولانا نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ان کی پچیس سالہ محنت کا خلاصہ ہے، یہ سیکڑوں صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔

سوانح قاسمی اول، دوم، سوم | آپ پڑھ آئے ہیں کہ مولانا گیلانیؒ کی علمی زندگی رسالہ القاسم دیوبند کی ترتیب سے شروع ہوئی تھی، عجیب اتفاق ہے کہ زندگی کی آخری منزل سوانح قاسمی ثابت ہوئی، یہیں پہونچکر قافلۂ حیات لُٹ گیا، جامعہ عثمانیہ حیدر آباد سے ریٹائر ہو کر جب وطن آگئے، تو اس وقت کے مہتمم دارالعلوم دیوبند حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے گذارش کی کہ وہ بانیِ دارالعلوم کی سوانح مرتب فرمادیں، مولانا نے اسے اپنے لئے زادِ آخرت سمجھ کر بڑی خوشی سے قبول کیا اور تین ضخیم جلدوں میں مرتب فرمانے کی زحمت گوارہ فرمائی، آخری وقت آجانے کی وجہ سے تیسری جلد تشنہ رہ گئی، بہت پہلے خاکسار سے کہا گیا تھا کہ سوانحِ قاسمی کی تلخیص کردو۔ تعمیلِ حکم میں یہ خدمت بجالایا تھا۔ امید ہے کہ وہ خدمت کسی نہ کسی شکل میں دیر سویر آئے گی۔

یہ کتاب بھی ہر اس شخص کے پڑھنے کے لائق ہے جو مغلیہ دورِ حکومت کے زوال اور انگریزی حکومت کے دورِ جاہ و جلال میں اسلامی تعلیمات کے بقاو تحفظ کی تاریخ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔

طالبِ دعا محمد ظفیر الدین غفرلہٗ

طوبیٰ ریسرچ لائبریری

اسلامی اردو، انگلش کتب،

تاریخی، سفرنامے، لغات،

اردوادب، آپ بیتی، نقدوتجزیہ

toobaa-elibrary.blogspot.com